مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

اگست 2014

نظارہ کیجیے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا



مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔
مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی

کی لازوال تحریروں سے انتخاب

القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں۔ ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں مگر جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔ ان سے کہو ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آجاتی ہے یا آخری گھڑی آپہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔

(آیا ۳۷ تا ۴۱)(حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

الحدیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جانداروں کو پانی پلانا ثواب کا کام ہے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ایک آدمی راستہ میں جارہا تھا۔ اس کو بہت زیادہ پیاس لگی۔ ادھر اُدھر دیکھا' ایک کنواں ملا، وہ اس میں اُتر گیا اور پانی پیا۔ (ڈول اور رسی نہیں تھی) جب کنویں سے باہر آیا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے زبان نکالے ہوئے بھیگی مٹی کھارہا ہے، اس آدمی نے اپنے دل میں سوچا اس کتے کو اتنی ہی شدید پیاس لگی ہے جتنی شدید پیاس مجھے لگی تھی، وہ فوراً کنویں میں اُتر گیا، اپنے چمڑے کے موزہ میں پانی بھر کر منہ میں تھامے باہر آیا اور کتے کو پلایا۔ تو اللہ نے اس کے عمل کی قدر کی اور اس کی مغفرت فرمادی......''۔

لوگوں نے پوچھا'' کیا چوپایوں پر بھی رحم کرنے پر ثواب ملتا ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا'' ہر جاندار کے ساتھ رحم کرنے پر ثواب ملتا ہے......''

(بحوالہ: مختصر صحیح بخاری)

اس شمارے میں......



سیارہ رپورٹ



جلد نمبر 51 - شمارہ 8 - اگست 2014ء

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

www.facebook.com/sayaradigest
Email:editorsayyara@yahoo.com
sayyaradigest@gmail.com
editorsayyara@hotmail.com
Phone:92-042-37245412
Mobile:0300-9430206

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

ماہنامہ سیّارہ ڈائجسٹ لاہور

مدیر اعلیٰ
امجد رؤف خان

مدیر منتظم
کامران امجد خان

مدیر	: محمد ثاقب
معاون مدیران	: جویریہ کامران ۔ روفی خان ۔ فرحان امجد
سرکولیشن منیجر	: بشیر احمد
مارکیٹنگ منیجر	: خرم احمد خان ۔ 0333-4207664
نگران پرنٹنگ	: خالد محمود ۔
طابع	: اللہ والا پرنٹرز شاہراہ قائد اعظم لاہور

شعبۂ اشتہارات :
لاہور: خرم احمد خان ۔ 0333-4207664
طارق محمود ۔ 0300-4144761
کراچی: محمد عابد مرزا ۔ 0321-3758492

مجلس مشاورت
صغیرہ بانو شیریں، رفیق غوری
ریاض آفندی، فیاض عمر، عارف محمود ایل

قیمت 80 روپے

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر
240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور سے شائع کیا۔



اظہار خیال

تفرقہ بازی کیوں؟

مدیر منتظم "سیارہ ڈائجسٹ" السلام علیکم!
سیارہ ڈائجسٹ کا شمارہ جولائی ملا۔ جو اب زینت مطالعہ ہے۔ سرورق مولانا طارق جمیل صاحب کی تصویر سے جگمگا رہا تھا، کیا خوب......!
ہماری دینی کتابوں میں مذکور ہے کہ حضرت رسول کریم ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے بعد آپ کی اُمت میں اچھے لوگ کون ہوں گے، تو آپؐ نے فرمایا کہ "علماء۔ اور پھر پوچھنے والے نے پوچھا کہ بُرے لوگ کون ہونگے، تو آپؐ نے جواب دیا کہ، علماءؑ"۔

ہم مانتے ہیں کہ ہمارا خدا ایک ہے اور رسولؐ ایک ہے اور کتاب ایک ہے تو پھر یہ تفرقہ بازی کیوں؟ ڈاکٹر اقبال بھی ایسے علماء دین سے شاکی تھے جو تفرقہ بازی کرتے تھے:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں

اس کا اظہار اُن کے بیٹے ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اپنی کتاب "گریباں اپنا چاک" میں کیا ہے۔
"یہ ایک حقیقت ہے ایک مسجد میں نور اور رحمت کی ساری رات بارشیں ہوتی رہیں اور قرب میں ایک بوڑھا بیمار نہ سو سکا"

ہمارے ہاں اکثر مولانا حضرات اپنی پارسائی کے لیے ہر سال حج، عمرہ کرتے ہیں۔ بڑی بڑی ایئر کنڈیشن گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں جہاں پڑاؤ کرتے ہیں وہاں بھی اے سی کی سہولت ہوتی ہے۔ ان کے گھر بھی ایئر کنڈیشن ہوتے ہیں۔ یہ سب چیزیں کیا آپ سے مخفی ہیں؟

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا
کسی دانشور مفکر نے کہا تھا جو قومیں علم و عمل کو چھوڑ کر روحانیت اور معجزات پر یقین رکھتی ہیں وہ قومیں اپنا تشخص کھو بیٹھتی ہیں۔
(قلندر حسین سید/احمد پور شرقیہ)

....

کارآمد خطوط

محترم مدیر اعلیٰ امجد رؤف خان صاحب!
السلام علیکم! سب سے پہلے تو آپ کو اور آپ کے ادارے کے لوگوں کو رمضان کی بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے (آمین)۔ اس ماہ بذریعہ ڈاک سیارہ ڈائجسٹ موصول ہوا۔ سوچا اس میں میری کہانی ہوگی لیکن جب کھول کر دیکھا تو پرچے میں نہ تو میری کہانی تھی اور نہ ہی شاعری تھی، بس میرا خط لگا ہوا تھا۔ میں بڑی حیران ہوئی کہ اس کے باوجود مجھے اعزازی پرچہ ارسال کیا گیا۔ اس عزت افزائی کے لیے میں آپ کی بہت ممنون ہوں اور امید کرتی ہوں کہ اگلے شمارے میں میری کہانی کو ضرور جگہ دی جائے گی۔ اب اگر پرچے پر بات کروں تو سرورق سے لے کر کہانیوں تک سب کچھ بہت اعلیٰ تھا۔ خاص طور پر قارئین کے خطوط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ سارے خط روایتی خطوں سے ہٹ کر کچھ علم فراہم کرتے ہوئے تھے جو کہ بہت ہی اچھا لگا۔ اچھا اب اس اُمید کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ اگلی دفعہ

میری کہانی کو جگہ ملے گی۔ اللہ حافظ

(عطیہ زاہرہ/لاہور)

بھارت کو "انڈیا" نہ کہیں

جناب کامران امجد خان صاحب! السلام علیکم! اللہ جی آپ کو صحت تندرستی دے (آمین)۔ کراچی ایئرپورٹ پر دہشت گردوں کا حملہ اور بھارت کا اس میں ملوث ہونا دوہری دہشت گردی ہے لیکن ہمارے سربراہ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے چکر میں ادھ موئے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ جب کہ ایک طرف وہ نہ صرف دہشت گردوں کو اسلحہ فراہم کر رہا ہے بلکہ وہ مملکت پاکستان پر اپنے خونی دانت بھی گاڑنے کے لیے اپنے پنکھ پھیلا رہا ہے۔ نہرو دور میں بھارت کا آئین ترتیب پایا اور اسی آئین میں لکھا ہوا ہے کہ ماریشیس' بھوٹان' سری لنکا' برما (میانمار)' بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان)' مالدیپ' نیپال اور پاکستان ایک انڈیا ہے۔ ان سب ملکوں پر بھارت جبراً قبضہ کر کے واپس ایک انڈیا بنائے گا جب ہندوستان یا انڈیا تقسیم ہوا تو ایک حصہ کا نام بھارت رکھا گیا دوسرا پاکستان بنا، ہماری قوم بڑے فخر سے بلکہ حکومتیں بھی، بھارت کو "انڈیا" یا ہندوستان کہتے نہیں تھکتیں۔ یعنی پاکستان خود ہی تسلیم کر رہا ہے خدانخواستہ کہ بھارت دراصل انڈیا ہے جبکہ بھارت کے آئین میں واضح طور پر لکھا ہے کہ انہوں نے بھارت کو مذکورہ ملکوں پر قبضہ کر کے "انڈیا" بنانا ہے۔ اگر ضیاء الحق تھوڑا عرصہ اور زندہ رہ جاتے تو خود بھارت کے کئی ٹکڑے ہو چکے ہوتے اور انشاء اللہ آج نہیں تو کل بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہو گا۔ مدیر صاحب آپ نے صفحہ 139 پر محترمہ نوشابہ اختر صاحبہ کا مضمون "کسی کی ڈفلی پر میرا راگ" شائع کر کے دل خوش کر دیا ہے، نوشابہ نے زبردست مضمون لکھا ہے مکمل طور پر پاکستانیت کا اظہار ہے شاباش نوشابہ' لیکن آپ نے بھی اپنے مضمون میں بھارت کو "انڈیا" ہی لکھا ہے اور حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ خود "دستک" میں بھی جناب امجد رؤف صاحب نے بھارت کو انڈیا کہہ کر مخاطب کیا ہے اس روش کو تبدیل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

(اقبال تبسم۔ راولپنڈی)

حوصلہ افزائی

محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری تحریر "تھوڑا آسمان" کو اپنے شمارے میں جگہ دی۔ زندگی سانپ سیڑھی کے کھیل کی طرح ہے کبھی "صفر" تو کبھی آسمان...... اس آفت والے دور میں نئی نسل کی حوصلہ افزائی کرنا قابل قدر جذبہ ہے۔ الفاظ کے خزانے کبھی انسان کو تنہا نہیں رہنے دیتے۔ اب ہمیں یقین ہوا' تنقید' تعریف کے سلسلے صلاحیتیں بڑھانے کی طرف پیش رفت کرتے ہیں۔ پچھلی تمام باتوں کی وجہ سے میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ آپ کا اور آپ کے تمام ادارے کا پھر سے بہت بہت شکریہ۔ اگست کے حوالے سے تحریر بھیج رہا ہوں۔ اسے شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

(محسن علی)

عیدالفطر اور جشن آزادی

جناب محترم کامران امجد خان صاحب السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہو گا! ماہ اگست کی آمد آمد ہے، آپ کو اور قارئین کو عیدالفطر اور جشن آزادی کی پیشگی مبارک باد۔ 14 اگست کے حوالے سے خصوصی تحریر دریام سنگھ بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے اگست کے شمارے میں شامل اشاعت ہو گی۔ غزل

اور مراسلہ بھی ارسال خدمت ہے۔ براہ کرم قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو سیارہ ڈائجسٹ کے سٹاف اور تمام لکھنے والوں اور تمام پڑھنے والوں کو دعا سلام۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

(ایس امتیاز احمد/کراچی)

مسیحا آگے بڑھیں

محترم مدیر اعلیٰ صاحب! السلام علیکم! جولائی کے شمارے میں مولانا طارق جمیل صاحب کے بیان پڑھے۔ یقین جانیں جی چاہا ابھی ان سے جا کے ملوں۔ میرے دل میں تو ہر وقت ایک ہی دُعا ہے۔ ایسے لوگ آگے بڑھیں تاکہ اس ملک کو بدل سکیں۔ ہم اسلام سے بہت دُور ہو چکے ہیں۔ ہمیں ایسے مسیحا چاہئیں جو ہمارے مُردہ جذبات کو بیدار کر سکیں۔ جو ہمیں یہ احساس دلا سکیں کہ ہم کس مذہب کے پیروکار اور کس نبیؐ کی اُمت سے ہیں۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر عالم فاضل نہیں اس لیے کچھ بھی کہتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ اللہ طارق صاحب کو سلامت رکھے اور ایسے طارق جمیل اور بھی پیدا ہوں (آمین) دعاؤں کے ساتھ۔

(نوشابہ اختر)

آزادی اظہار رائے

محترم امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ ہمارا پسندیدہ شمارہ ہے، میرے ابو خود بھی علم و ادب سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہمارے گھر میں بہت سے رسائل و جرائد آتے ہیں مگر سیارہ ڈائجسٹ کو ان سب میں خاص مقام حاصل ہے۔ یہ ہمارے گھر میں قریب 25 سال سے آرہا ہے۔ اس کے تمام خصوصی نمبر بھی ابو کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ کا خاصا یہ ہے کہ یہ قارئین کی آراء کو خاص اہمیت دیتا ہے اور میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی ہے کہ آپ تمام قارئین اور لکھنے والوں کو کھل کر آزادی اظہار رائے کا حق دیتے ہیں خواہ اُن کی بات ادارہ کے خلاف ہی کیوں نہ جاتی ہو۔ دوسرے شماروں میں یہ چیز عنقا ہے۔ بہرحال میں یہ کہنا چاہوں گا کہ سیارہ ڈائجسٹ علم وادب کی بے حد خدمت کر رہا ہے۔ مجھے بالخصوص قلندر حسین صاحب کا سلسلہ ''خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں'' بے حد پسند ہے، اُن کے سلسلے سے ہمیں بہت سی معلومات افزاء باتیں حاصل ہوتی ہیں، وہ ایک ہی جگہ بے شمار ''نگینے'' جمع کر دیتے ہیں۔

(محمد رفیق اعظم/کراچی)

صغیرہ بانو شیریں کی باتیں

مکرمی مدیر صاحب! السلام علیکم! میں ایک گھریلو خاتون ہوں اور مطالعہ میرا شوق بھی ہے اور عادت بھی۔ سیارہ ڈائجسٹ کئی سال سے باقاعدگی سے زیر مطالعہ ہے۔ میں اکثر یہ محسوس کرتی تھی کہ اس میں ادب اور کہانیوں پر مبنی مواد تو بخوبی موجود ہوتا ہے مگر خواتین کی نمائندگی ذرا کم ہوتی ہے مگر گزشتہ کچھ شماروں سے آپ نے ہمارا یہ گلہ دور کر دیا ہے۔ آپا صغیرہ بانو شیریں کی آمد سے سیارہ ڈائجسٹ کی محفل میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ وہ بے حد کارآمد گھریلو نسخے بتاتی ہیں اور عام فہم انداز میں ہمارے لیے معلومات مہیا کر دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے میری طرح بے شمار قاری خواتین اُن کی باتوں سے مستفید ہوتی ہوں گی۔ امید ہے وہ سیارہ ڈائجسٹ کے صفحات کو اپنی تحریروں سے رونق بخشتی رہیں گی۔

(ریحانہ قادر/سرگودھا)

نواز خان اور شوکت افضل کی تحریریں

محترم ایڈیٹر صاحب ! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کو پچھلے ایک برس سے باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ ایک دوست کے ذریعے اس سے تعارف ہوا اور پھر اس نے مجھے اپنا گرویدہ کرلیا۔ مجھے محترم نواز خان اور محترمہ شوکت افضل صاحبہ کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ یہ دونوں اس قدر جاندار کہانیاں لکھتے ہیں کہ قاری ان کے سحر سے نہیں نکل پاتا۔ پھر ان کی تحریروں کا خاصا ہے کہ کردار آپ کو بالکل حقیقی اور اپنے آس پاس موجود محسوس ہوتے ہیں۔ ان دونوں سے ملاقات کی شدید خواہش ہے، اگر کسی طرح ممکن ہو سکے تو ضرور بتایئے۔

(نعیم الحسن / پشاور)

امن وسکون

محترم جناب ایڈیٹر! السلام علیکم! جولائی کا شمارہ نظر سے نہیں گزرا، چھوٹے بچے کی بیماری کی وجہ سے خریدنے نہیں جا سکی یکم جولائی کو گئی تو ملا نہیں۔ بہرحال آپکے پاس اگر کوئی ہو تو بجوا دیں۔ تبصرہ نہیں کرسکتی کیونکہ ہمیشہ سیارہ سامنے رکھ کر خط لکھتی ہوں آج عجیب لگ رہا ہے اس کے بغیر لکھنا۔ جولائی میں رمضان اور عیدالفطر کے بابرکت لمحات آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان میں امن وسکون کے ساتھ وہ لمحات لائے اور اپنی خاص رحمتوں سے نوازے پاکستان کو امن کا گہوارہ بنائے اور عوام کو صبر عطا کرے۔ اقوام عالم میں پاکستان کا مقام اونچا کرے ۔آمین ثم آمین۔ والسلام دعاگو!

(یاسمین کنول)

نواز خان سے ملاقات

محترم جناب امجد رؤف خان السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کا ہر قاری نواز خان صاحب سے ملنا، اُن کو دیکھنا اور ان سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ لیکن آپ نے انھیں نئی نویلی دلہن کی طرح ہزاروں پردوں کے پیچھے چھپا کر رکھا ہے۔ ایسا کرکے آپ سیارہ ڈائجسٹ کے قارئین کے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ مہربانی کر کے کبھی کبھی اُن کی فوٹو کے ساتھ اُن کا مختصر سا انٹرویو شائع کرتے رہیں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو بہت جلد قارئین سیارہ ڈائجسٹ کے ذہنوں میں نواز خان صاحب ایک حقیقی شخصیت کی بجائے ایک افسانوی شخصیت بن جائیں گے۔

(محمد کمال / مردان)

☆ کمال صاحب، نواز خان صاحب کی تصویر شائع کرنے یا قارئین سے اُن کا رابطہ کروانے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں، مگر نواز خان صاحب خود اپنی شناخت ظاہر نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی تصویر شائع کروانا انھیں پسند ہے۔

مولانا طارق جمیل کی باتیں

مکرمی ومحترمی جناب ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم! اس شمارہ میں "سیارہ رپورٹ" میں مولانا طارق جمیل صاحب کے بارے میں بہت ایمان افروز اور معلومات افزا تحریر پڑھنے کو ملی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ لیکن ایک شکایت بدستور ہے کہ لگتا ہے آپ نے اپنے کمپوزر کو متنبہ نہیں کی کہ کتابت کی غلطیاں اب بھی موجود ہیں۔ محترمہ شوکت افضل صاحبہ کی تحریر "ہنی مون" میں کتابت کی غلطیوں نے سارا مزہ کرکرا کردیا۔ محترمہ صغیرہ بانو شیریں کی بزم اظہار خیال میں آمد پر خوش آمدید۔ سیارہ ڈائجسٹ کے عملہ اور قارئین کو عید مبارک۔

(زاہدہ یوسفی۔لاہور)

سیارہ ڈائجسٹ کی سالانہ خریداری کیلئے
بیرون ملک بدلِ اشتراک

(1) سعودی عرب، کویت، اُردن، سری لنکا، ابوظہبی، بحرین، دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت۔	-/6000 روپے
(2) سوڈان، یوگنڈا، لیبیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک مشرق اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، ملائشیا، سوئٹزرلینڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی۔	-/6000 روپے
(3) آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینزویلا، یونان، امریکہ، نودو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، میکسیکو، گریناڈا۔	-/7000 روپے

- بیرون ملک وی پی نہیں جاتی۔ رقم پہلے بھجوائیں۔
- کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار کو ادا کرنا ہوگا۔
- ڈرافٹ سیارہ ڈائجسٹ لاہور کے نام ارسال کریں۔

سیارہ ڈائجسٹ
240 مین مارکیٹ، ریواز گارڈن لاہور۔
فون 0423-7245412
E.mail: sayyaradigest@gmail.com



قانون توڑنے کا فیشن......

وہ بہت غصّے میں تھے، دفتر سے آتے ہی اُنہیں اس قدر غضبناک دیکھ کر ہم سب حیران بھی تھے اور کچھ فکر مند بھی۔ بالآخر میں نے ہمت کی اور اُن سے غصّے کی وجہ دریافت کی۔ میں حیران تھا کہ ہمیشہ دھیمے مزاج کے مالک نظر آنے والے مقصود صاحب کو کس بات پر اس قدر غصّہ آیا ہے۔ انہوں نے جو کچھ بتایا وہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے، کیونکہ ہم سب اس طرح کے تجربات سے گزرتے ہیں اور اپنی آنکھوں کے سامنے قانون کی دھجیاں اُڑاتے لوگوں کو بے بسی سے دیکھتے ہیں۔

مقصود صاحب نے بتایا کہ وہ اپنی گاڑی پر ایک انتہائی مصروف شاہراہ سے گزر رہے تھے۔ ایک ٹریفک سگنل پر سبز بتی ہوتے ہی جیسے ہی انہوں نے اپنی گاڑی آگے بڑھائی، اچانک ایک موٹر سائیکل سوار بائیں جانب سے انتہائی تیز رفتار سے نمودار ہوا اور دائیں طرف جانے کے لیے اُن کی گاڑی کے سامنے آگیا۔ اس کی یہ حرکت اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھی کہ مقصود صاحب کوشش کے باوجود گاڑی کو موٹر سائیکل سے ٹکرانے سے نہ بچا سکے۔ نتیجتاً وہ لڑکا تو بیچ سڑک پر گرا ہی، مقصود صاحب کی گاڑی کی ہیڈ لائٹ بھی ٹوٹ گئی اور بمپر کو بھی نقصان پہنچا۔ جس بات پر انہیں زیادہ غصّہ آیا وہ یہ تھا کہ موٹر سائیکل سوار کو اپنی اس غلطی پر کوئی ندامت نہ تھی، اُلٹا وہ ان سے بدتمیزی پر اُتر آیا تھا۔

مقصود صاحب کے ساتھ پیش آیا یہ واقعہ اُس مجموعی رویے کا عکاس ہے جسے ہم ہر روز سڑکوں پر عملی طور پر دیکھتے ہیں۔ دورانِ ڈرائیونگ لوگ ٹریفک قوانین کی قطعی پرواہ نہیں کرتے۔ جس طرف سے چاہا اوورٹیک کرلیا، جب جس لین میں دل چاہا گاڑی موڑ لی۔ حتیٰ کہ ون وے اور سگنل کی خلاف ورزی سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ اسی پر بس نہیں قانون کی خلاف ورزی کرنے والا کسی قسم کی شرمندگی محسوس کرنے کی بجائے اُلٹا اکڑتا اور دوسروں کو آنکھیں دکھاتا ہے۔ سب سے زیادہ خوف موٹر سائیکل سواروں سے محسوس ہوتا ہے۔ جو اچانک دائیں یا بائیں سے نمودار ہوتے ہیں اور سامنے سے "زگ زیگ" کی طرح گزر جاتے ہیں۔ موٹر سائیکل سوار خود کو ہر قانون سے آزاد تصور کرتے ہیں۔ ہیلمٹ نہیں پہنتے، سگنلز کا خیال نہیں کرتے، غلط اوورٹیک کرتے ہیں، رش اور مصروف سڑک پر بھی اپنے کرتب دکھانے لگتے ہیں، اُن کی ایک چھوٹی سی غلطی اکثر بہت بڑے حادثہ کا باعث بن جاتی ہے۔

معاشرتی نظام کو احسن طور پر چلانے کے لیے ہر ملک کچھ قوانین تشکیل دیتا ہے، جس کی پابندی ہر خاص و عام پر لازم ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی قوانین تو موجود ہیں مگر اُن کی پابندی کوئی نہیں کرتا۔ جو جتنا طاقتور ہے، خود کو اُتنا ہی قانون سے بالاتر تصور کرتا ہے۔ قوانین کی خلاف ورزی اور اُن کا مضحکہ اُڑانا اب ہمارا معاشرتی مزاج بن گیا ہے، جو معاشرے میں بڑھتے بگاڑ کی اہم ترین وجہ ہے!

قوانین کی خلاف ورزی صرف ٹریفک تک محدود نہیں بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں یہ رویہ ہمارے ملک میں عام نظر آتا ہے۔ چند ماہ پہلے کی بات ہے، ایک دوست کے گھر جانا ہوا۔ اُسکے گھر کے سامنے ایک بڑے سے پارک میں کوئی تقریب جاری تھی، جس میں کوئی میوزک بینڈ تمام تر "بینڈ باجوں" کے ساتھ موسیقی کے سُروں کی بجائے "شور" بکھیر رہا تھا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میرے پوچھنے پر دوست نے بتایا کہ اُن کے ہمسایہ میں ایک ایس پی صاحب رہتے ہیں۔ اُن کے بیٹے کی شادی ہے۔ آج تیسرا روز ہے، اسی طرح موسیقی کی محفل رات بارہ ایک بجے تک جاری رہتی ہے۔ ہم سب گھر والے تو بہت ڈسٹرب ہیں، میں نے صبح دفتر اور بچّوں نے سکول جانا ہوتا ہے مگر تیز موسیقی کی آواز سونے ہی نہیں دیتی۔ انہیں روکنے والا بھی کوئی نہیں۔

قانون معاشرے کو مہذب اور منظم بنانے کے لیے ہوتا ہے مگر ہم لوگ قوانین توڑنے میں لطف لیتے ہیں۔ ایک صاحب نے اس حوالے سے دلچسپ واقعہ سنایا۔ کہنے لگے "گزشتہ دنوں امریکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بہت سی دلچسپیاں اور رنگینیاں تھیں۔ جدید اور ترقی یافتہ دُنیا کے حیرت انگیز مظاہر بھی دیکھنے کو ملے، مگر پھر بھی ہمیں وہاں مزہ نہیں آیا۔ گھٹن کا احساس ہوتا رہا۔" وجہ پوچھنے پر وہ صاحب کہنے لگے۔ "اصل بات یہ ہے کہ وہاں پاکستان جیسی آزادی، بے فکری نہیں تھی۔ سڑک پر پیدل چلتے بھی قوانین کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ راہ چلتے تھوک نہیں سکتے، جوس، چپس اور سگریٹ کے خالی پیکٹ کہیں بھی پھینکنے کی عیاشی بھی میسر نہ تھی۔ بس، ٹرین کی ٹکٹ لینی ہو یا سوار ہونے کا مرحلہ۔ دونوں صورتوں میں دوسروں کو دھکم پیل کے ذریعے پیچھے ہٹا کر خود آگے بڑھنے کا مزہ ہی نہیں لیا جاسکتا، بلکہ جہاں تین لوگ جمع ہوتے ہیں خود بخود قطار بنالیتے ہیں۔ گاڑی میں سفر کررہے ہو تو کوئی ہارن نہیں بجاتا، کسی کے ساتھ آگے بڑھنے پر تکرار نہیں ہوتی بلکہ لوگ خود جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ سگریٹ پینے کے لیے مخصوص مقام تلاش کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان جیسی آزادی تو کہیں نظر ہی نہیں آتی۔ ہمہ وقت قانون کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

سوال یہ ہے کہ ہم لوگ قوانین پر عمل کیوں نہیں کرتے، جب کہ دُنیا کی دیگر قومیں قانون کی بالادستی کا سبق سیکھ کر ہم سے آگے نکل گئی ہیں۔ ایک اور دلچسپ امر یہ ہے کہ ہم پاکستانی اپنے ملک میں تو قوانین کی پابندی نہیں کرتے مگر جب بیرون ملک جاتے ہیں تو قوانین کی پابندی کرنے لگتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ قوانین کی پاسداری کرتے ہیں۔ انہیں قانون پر عملدرآمد کرتے دیکھ کر ہم پاکستانیوں کو بھی ویسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ وہاں خلاف ورزی پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں، اور قانون صرف نام کا قانون نہیں ہے بلکہ فوراً حرکت میں آتا ہے۔ آپ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کریں تو فوراً بھاری جرمانہ لگ کر آجاتا ہے۔ سڑک پر کوڑا کرکٹ پھینکیں تب بھی آپ کی بچت نہیں ہوسکتی اور پھر قوانین سب کے لیے ایک جیسے ہیں، کوئی بھی اس سے مستثنٰی نہیں۔

ہمارے ہاں قوانین پر عملدرآمد نہ کرنے کی دو اہم وجوہات ہیں، ایک تو یہ کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے

نااہل اور فرائض سے لاپرواہ ہیں اور دوسرا یہ کہ قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں ہے۔ جب کچھ لوگ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں یا خود کو قانون سے بالاتر تصور کرتے ہیں تو انہیں دیکھ کر دوسرے لوگوں کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ پھر ان بااثر لوگوں کے رشتہ دار، اہلخانہ، دوست احباب بھی خود کو قانون سے بالاتر تصور کرنے لگتے ہیں اور یوں یہ سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں کو قانون توڑنے پر سزا نہیں ملتی۔ ٹریفک سگنل توڑنے والے شخص کو اگر یہ پتہ ہو کہ وہ قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا اور اس جرم کے نتیجے میں اُسے بھاری جرمانے کے ساتھ سزا بھی ملے گی تو وہ کبھی ایسا نہ کرے۔ مگر یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ یہی حال دیگر جرائم کرنے والوں اور قوانین کی دھجیاں اُڑانے والوں کا ہے، وہ قانون توڑتے ہیں اور اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے سزا سے بھی بچ جاتے ہیں۔ بالفرض کبھی پکڑے بھی جائیں تو عدالتی نظام ایسا ہے کہ مجرم کے بچ نکلنے کے بے شمار راستے ہیں۔ پھر سزا ہوتے ہوتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بااثر لوگ خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ گزشتہ دنوں اس کی عملی مثال اُس وقت دیکھنے میں آئی جب ایک سیاہ شیشوں والی پجارو کو سیکورٹی اہلکاروں نے ناکے پر روک کر تلاشی لینے کی کوشش کی۔ پجارو میں بیٹھے افراد نے تلاشی دینے سے انکار کرتے ہوئے دروازے لاک کر لیے۔ بعد ازاں اعلیٰ افسران کو خود موقع پر آنا پڑا۔ تب معلوم ہوا کہ پجارو میں بیٹھے افراد کسی رُکن اسمبلی کے رشتہ دار تھے اور انہوں نے اس بات پر بہت بُرا منایا تھا کہ سیکورٹی اہلکاروں نے انہیں کیوں روکا حالانکہ اُن کی گاڑی پر رکن اسمبلی کی نمبر پلیٹ بھی لگی ہوئی تھی۔ دوسری طرف سیکورٹی اہلکاروں کا موقف تھا کہ گاڑی کے شیشے سیاہ کرنا ایک جرم ہے اور پھر گاڑی کی تلاشی نہ دے کر بھی گاڑی میں بیٹھے افراد نے قانون کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی۔

قانون کی حکمرانی کا سبق ابتداء سے پروان چڑھتا ہے۔ قومیں اپنی اقدار اور روایات کے مطابق قوانین تشکیل دیتی ہیں اور پھر ان پر عملدرآمد یقینی بنانے کے لیے ایک نظام وضع کرتی ہیں۔ پھر معاشرے کے ہر فرد کو ان قوانین پر عملدرآمد کرنا پڑتا ہے کیونکہ ابتداء سے اُن کو یہ باور کروا دیا جاتا ہے کہ قوانین اُن کی بہتری اور آسانی کے لیے ہیں۔ ان پر عمل کرنے میں ہی اُن کا فائدہ ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم قوانین کے نفاذ کے لیے نظام تشکیل نہیں دے سکے۔ پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ہم جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کر سکے۔ نتیجتاً یہ ادارے فعال کردار ادا کرنے میں ناکام ہیں۔ اسی طرح ہم لوگوں کو یہ شعور نہیں دے سکے کہ قانون کی پابندی ہماری ذمہ داری ہے اور ہمارے ہی فائدے کے لیے ہے۔ نیز سب کے لیے یکساں قانون اور قانون کی بالادستی کو تسلیم کرنے کا کلچر فروغ دینے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لیے سخت سزاؤں کا اطلاق اور عملدرآمد یقینی بنا کر بالخصوص قانون توڑنے والے بااثر افراد کو سخت سزائیں دی جائیں تو نظام خود بخود ٹھیک ہونا شروع ہو جائے گا اور پھر بتدریج قوانین کی پابندی کا کلچر فروغ پا جائے گا۔

(امجد روف خان)



بسم اللہ الرحمن الرحیم

کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ مدد دے!

اُردو کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں سے انتخاب

مشتاق احمد یوسفی.....ادبی کٹہرے میں!

۱۔ اس نے اُردو مزاح کو اس مشکل مقام پر پہنچا دیا ہے جس سے آگے لے جانا کسی دوسرے مزاح نگار تو کیا اس کے اپنے بس میں بھی نہیں۔ میرا دوست مسٹر الو تو یہاں تک کہتا ہے کہ یہ کتابیں اس کی اپنی لکھی ہوئی ہی نہیں جس کا جواز اس کے پاس یہ ہے کہ اگر یہ کتابیں ملزم مصنف نے خود لکھی ہیں تو ایسی دو تین کتابیں اور لکھ کر دکھائے۔

۲۔ اس نے بعض شعرا کے متعدد اشعار اور مصرعوں کو ہلکے سے ردوبدل سے اپنی تحریروں میں یوں استعمال کیا ہے کہ اب وہ اشعار اور مصرعے اصل شعراء کے معلوم ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض مصرعوں کو توڑوں کا توں قبضے میں لے لیا ہے۔

ایک مثال دیکھیے:۔

بینک میں لکھتے سب انگریزی میں تھے، گفتگو اُردو میں، لیکن گالی ہر شخص اپنی مادری زبان میں ہی دیتا:

بزبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

یہ مصرع جب بھی سنیں گے آتش یاد آئے نہ آئے، مشتاق یوسفی ضرور یاد آئے گا یعنی چوری اور دماغ زوری۔

۳۔ اس نے اُردو زبان کے محاورات، ضرب الامثال اور روز مروں کو اس مہارت سے بگاڑا ہے کہ اب وہ اپنی اصلی شکل میں مزاحی نہیں دیتے۔

۴۔ اس نے بعض نامور لکھنے والوں کے اسالیب کو نہایت چالاکی سے گھلا ملا کر ایک ملغوبہ تیار کیا اور اسے کئی آتشہ کر کے اپنے نام سے پیش کر دیا۔

۵۔ اس نے قارئین کو اپنی تحریروں کے ذریعے ایسا نشہ فراہم کیا ہے جو بندہ ان کو سمجھ کے پڑھ یا پڑھ کر سمجھ لیتا ہے، اس کا کسی اور مزاحیہ تحریر میں دل ہی نہیں لگتا۔

۶۔ لوگ اس کی کتابیں اتنی بے دردی سے خرید اور بیچ رہے ہیں جس سے کئی دوسرے لکھنے والوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

(تحریر: مشتاق احمد......)

حجرنہ ہفت بلا

زینت مینشن میں ایک تنگ و تاریک سی کیبن تھی جس میں ڈھنگ کی ایک میز بھی اسی صورت میں سما سکتی تھی کہ کرسی کا کھڑاگ نہ ہو۔ اس میں چار آدمیوں کی شانہ بشانہ نشست کا اس طرح اہتمام کیا گیا تھا کہ دیوار میں چیڑ کا ایک آٹھ فٹ لمبا، ڈیڑھ فٹ چوڑا تختہ کیلوں سے جڑ دیا گیا تھا۔ جسے کاؤنٹر کہتے تھے۔ اس لیے کہ ڈکشنری میں اس شے کے لیے کوئی علیحدہ لفظ نہیں تھا۔ بیٹھیں تو کھوے سے کھوا 'زانو بلکہ قلم سے قلم چھلتا تھا۔ جب تک دونوں سروں کے آدمی زور لگا کر خود کو اپنے جڑواں پڑوسی سے علیحدہ نہ کرلیں۔ بیچ والے اُٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ سب باجماعت، اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ بغیر نوٹس دائیں بائیں سر ہلا کر لطیفے کی داد دینے کی اجازت نہ تھی۔ سو سال پرانی چھت پر چھپکلی بھی ذرا بے احتیاطی سے چلتی تو ہمارے سر پر پلستر کے لیوڑے گرتے۔ دیوار بوسیدہ اور سیلی سیلی۔ کیلیں بار بار اُکھڑ جاتی تھیں۔ بیشتر وقت ہم تختہ کو گود ہی میں لیے بیٹھے رہتے۔ اس 'بلیک ہول' میں کسی طرف سے روشنی کا گزر نہ تھا۔ ہوا کے جھونکے البتہ باتھ روم سے گزر کر برابر آتے اور ہر دفعہ تازہ بدبو لاتے۔ مکھی اور مچھر یہاں زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ کھٹملوں کا ذکر ہم نے عمداً نہیں کیا، اس لیے کہ ان کے جو ہراوّل دستے کالروں پر رینگتے ہوئے پکڑے گئے، وہ مقامی نہ تھے۔ ان کے خون کے معائنے سے پتہ چلتا تھا کہ ان کا تعلق اہالیان پیر الٰہی بخش کالونی، لالو کھیت اور آرٹلری میدان کے "بلڈ گروپ" سے ہے۔ دُور ترین کونے میں 15 واٹ کا ایک ننگا بلب لٹکا ہوا تھا۔ (15 واٹ سے کم کے بلب اس زمانے میں دستیاب نہ تھے)۔ اُسے تسلی سے کھینچ کر ایسے غیر جانبدارانہ نقطے پر لے آئے تھے کہ سب کو یکساں طور پر دھندلا نظر آئے۔ یہ بینک کا رجسٹرڈ آفس اور چیف اکاؤنٹنٹ کا دفتر تھا۔ کلرک تو خیر اپنا علیحدہ علیحدہ وجود رکھتے تھے لیکن تینوں افسر ایک ہی قیس چلون کے کوزے میں بند تھے۔ بینک میں ملازم ہوئے ہمیں مشکل سے تین سال ہوئے ہوں گے کہ اینڈرسن نے ازراہِ مرحمت ہمیں چیف اکاؤنٹنٹ بنا دیا۔ سیکرٹری اور انسپکٹر آف برانچز کے عہدوں پر ہم پہلے سے ہی فائز تھے۔ ہماری دن دُونی رات تگنی ترقی سے بینک کو کل 15 آنے کا نقصان ہوا۔ اس لیے کہ تین ربر اسٹامپ بنوانے پر اس زمانے میں یہی لاگت آتی تھی۔ جیسا کہ ہم تفصیل سے کہیں اور بیان کر چکے ہیں، اس ترقی سے ہر چیز میں ایک خوشگوار تبدیلی آ گئی سوائے تنخواہ کے۔ وہ بدستور وہی رہی۔

اینڈرسن ڈسپلن، دفتری آداب اور ضابطہ کا اس قدر پابند تھا کہ کبھی ہمیں نام لے کر نہیں بلاتا تھا۔ بلکہ کاغذات کی نوعیت دیکھ کر چپراسی کو حکم دیتا کہ "انسپکٹر آف برانچز کو بلاؤ"۔ "کمپنی سیکرٹری کو سلام دو"۔ "ایکڈم چیف اکاؤنٹنٹ کو حاضر کرنا مانگتا"۔ اور جس حیثیت سے طلب کرتا، صرف اسی کے متعلق سوال کرتا۔ دوسرے عہدے سے متعلق کچھ پوچھنا ہوتو دو تین منٹ کا وقفہ دے کر دوبارہ طلب کرتا۔ ایک دفعہ اس نے ایک گوشوارے میں، جسے ہم نے خود بنا کر خود ہی، بحیثیت چیف اکاؤنٹنٹ، چیکنگ کے دستخط کیے تھے، ایک موٹی سی غلطی پکڑی اور ہمیں دھمکی دی کہ میں چیف اکاؤنٹنٹ کے کام کے ابھی انسپکٹر آف برانچز سے سرپرائز چیکنگ کروا کے پرخچے اُڑوا دوں گا! ہم خود کوزہ کوزہ گر و گِل کوزہ ہی نہیں، کوزہ شکن بھی تھے۔ کبھی اظہار خوشنودی کرنا ہوتو یہ نہیں کہتا تھا کہ میں تمہارے کام سے خوش ہوں، بلکہ فقط اتنا اعتراف کرتا کہ جنرل منیجر سردست اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ واحد پر مشتمل تھا اور اس کی علیحدہ دوات تک نہ تھی۔ ویسے تو گھنٹی بھی نہ تھی، لیکن اس کی کمی ہم نے کبھی محسوس نہ کی۔ اس لیے کہ

اسے بجا کر بلانے کے لیے کوئی علیحدہ چپراسی نہ تھا۔ ایک مشترکہ چپراسی کو اپنی جیب خاص سے چار روپے ماہوار دیتے تھے۔ وہ ہمیں صبح و شام سلام کرنے کے علاوہ کبھی کبھی دفتری کام بھی کر دیتا تھا۔

بعض مردوں کو عشق میں محض اس لیے صدمے اور ذلتیں اٹھانی پڑتی ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے کا مطلب وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ عورت بھی اندھی ہوتی ہے۔(مشتاق احمد یوسفی)

ہماری ضد وجہد

آخرالذکر ترقی سے پہلے، ہمیں یاد نہیں کہ ڈھائی تین برس تک کبھی گیارہ بجے رات سے پہلے بینک سے فراغت ہوئی ہو۔ اتفاق سے کبھی سات آٹھ بجے گھر پہنچ جاتے تو بیگم پریشان اور ہم سکول سے بھاگے ہوئے بچے کی طرح کھسیانے ہو جاتے۔ ''الٰہی خیر! طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' کام کبھی اتنا زیادہ ہوتا کہ ایک ڈیڑھ بجے تک ختم ہونے کی صورت نظر نہ آتی تو نیند اڑانے کی گولیاں کھا لیتے تھے۔ ہمیں ان گولیوں سے ساجد صاحب نے متعارف کروایا تھا۔ جو ایک کلیرنگ فارورڈنگ ایجنسی میں ملازم تھے۔ دن بھر درآمدی مال چھڑواتے اور رات کو یہ گولی کھا کر جہازوں پر برآمدی مال لدواتے۔ لیلۃ القدر اور 10 شعبان کی نفلیں پڑھتے۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ گزشتہ رات کی جگار سے نڈھال ہو کر ہم نے سرِ شام ہی گولی کھالی۔ خلافِ اندازہ، کام دس بجے ہی ''نبڑ'' گیا اور گھر آ کر ہم چارپائی پر صبح تک آنکھیں پھاڑے طبی سائنس کے کمالات پر غور کرتے رہے۔ جنرل منیجر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک سٹاک ایکسچینج کی بینک کے شیئرز (حصص) کی قیمت نہیں بڑھے گی، عملے میں ایک چپراسی کا بھی اضافہ نہ ہونے دیا جائے گا۔ اُدھر کراچی سٹاک ایکسچینج ہماری بددعائے نیم شبی سے ڈرنے والا نہیں تھا۔

کافی عرصے تک کھڑے ہو کر اونچے کاؤنٹر پر خود کام کیا یا اوروں کا چیک کیا۔ رفتہ رفتہ صحت گری تو شام تک پیروں پر اتنا ورم آ جاتا کہ سات بجے کے بعد جوتے اُتارنے پڑتے۔ چند مہینوں سے سینے میں بھی دائیں طرف درد رہنے لگا تھا جس کا نوٹس لینا ہم نے کسرِ شان سمجھا۔ اس لیے کہ دل تو بائیں طرف ہوتا ہے۔ تکلیف نے جب اتنی شدت اختیار کی کہ محسوس ہونے لگا جیسے گھنٹے کوئی برمے سے سینہ چھید رہا ہے کہ پیٹھ کے آرپار ہوا جاتا ہے تو ایک ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے نرمی سے کہا کہ دایاں پھیپھڑا متاثر معلوم ہوتا ہے۔ پوچھا کاہے سے؟ رکھائی سے بولا'' آف کورس، ٹی بی'' فوراً ایکس رے، خون اور تھوک ٹیسٹ کروانے اور تین مہینے کی رخصت پر کوئٹہ یا مری جانے کی ہدایت کی۔ ڈیڑھ سال بعد جب ہماری مالی تکالیف میں افاقہ ہوا تو ایکس رے کروایا۔ اس سے تصدیق ہوئی کہ دائیں پھیپھڑوں پر ایک زخم تھا جو کبھی کا خود بخود مندمل ہو چکا ہے۔ اس سے ہمیں اپنی قوتِ ارادی کی مضبوطی کی داد مطلوب نہیں، بلکہ ٹی بی کے جراثیم کی نقاہت اور بوداپن دکھانا مقصود ہے۔

اس زمانے میں اس روٹ پر کل تین لنگڑی بسیں چلتی تھیں۔ ایک تو کافی بھی تھی۔ وہ بھی دس بجے بند ہو جاتی تھیں۔ دن بھر اس کے بیچ سڑک پر مسافروں کے دھکوں اور مشوروں سے مرمت ہوتی اور رات کو گیس کی لالٹین کی روشنی میں مالک خود ان کی آنت اوجھڑی باہر نکال کر معائنہ و پلاسٹک سرجری کرتا تھا۔ دس بجے کے بعد رکشا، جس میں سائیکل سوار جتا ہوتا تھا۔ میکلوڈ روڈ سے پیر الٰہی بخش کالونی تک دس آنے سے کم میں نہیں ملتا تھا۔ یاروں کی جیب میں اتنے فالتو پیسے ہوتے تو دوپہر کا کھانا ہی نہ کھا لیتے۔ یا کم از کم سگریٹ کے دو ٹکڑے کر کے تو نہ پیتے لیکن جب سے ایک کروڑ پتی دل کے مریض کو سگریٹ کے تین ٹکڑے کر کے سونے کے سگریٹ ہولڈر

میں اُڑس کر پیتے دیکھا تو اپنے نوٹوں کے سائز پر رشک آنے لگا۔ اکثر سات میل پیدل ہی گھر جانا پڑتا۔ خواہ رات کے تین بج جائیں، آندھی آئے، بارش آئے ..... اور چاہے تو بس ہی کیوں نہ آجائے۔ ہم گھر ضرور جاتے تھے۔ حالانکہ بینک میں کس چیز کی کمی تھی۔ لکھو کھا روپیہ، پنکھے، کمر سیدھی کرنے کے لیے میزیں، حفاظت کے لیے سنتری، رات بھر کام کرنے کے بعد صبح منہ دھونے اور اسے دیکھنے کے لیے واش بیسن اور آئینہ..... سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے۔ بیوی کے سوا۔ لیکن صاحبو! جو سکھ چھجو دے چوبارے، اوہ نہ بلخ نہ بخارے۔ گھر پہنچتے تو بیوی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھتی۔ تام چینی کے تسلے میں سُہا تا سُہا تا گرم پانی اور دو چمچ نمک ڈالتی اور ہم اس سلونے تسلے میں سانولے پاؤں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ کسی نے بتایا کہ اس سے پیروں کی سوجن اُتر جاتی ہے۔ ٹھیک ہی ہوگا، اس لیے کہ صبح آئینے میں چہرہ کافی ستا ستا نظر آتا تھا۔ صبح بھی اتنی تکان محسوس ہوتی گویا شام ہو۔ مشقت سی مشقت! تھکن اور ایسی اُتوٹ تھکن کہ ایک ایک مسام میں اُتر جائے اور ہڈیوں تک کو چٹخا دے۔ رواں رواں کراہنے لگتا۔ کبھی کبھی بے اختیار جی چاہتا اب کے ایسے سوئیں کہ پھر نہ اٹھیں۔

کچھ اُوڑھا دیجیے مولانا مجھے نیند آتی ہے

پھر کھانا گرم کیا جاتا اور دونوں ساتھ کھاتے۔ وہ ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھانے لگی تھیں۔ تنخواہ دونوں بچیوں کے دودھ کے ڈبوں کے برابر! البتہ سکول کے مالک کی تگنی تنخواہ کی رسید دینی پڑتی تھی (چار سال سے اس کی پنشن رُکی ہوئی تھی) ہمارے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا کہ کوئی یہ نہیں بتائے گا کہ دن کیسا کٹا۔ ان کے لیے ہمارے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا ان کا سہاگ رہتی دنیا تک قائم رکھے۔ انہوں نے ہماری عادتیں خراب کردی ہیں اور ہم گھر گرہستی سے اتنے بے خبر ہیں کہ آج بھی یہ نہیں بتاسکتے کہ ہمارے کُرتے میں کتنا کپڑا لگتا ہے۔ کریلا کون سے موسم میں آتا ہے، گوشت کہاں سے آتا ہے، ساری کا عرض کیا ہوتا ہے، چیچک کا ٹیکہ کس عمر میں لگوایا جاتا ہے، ایک سیر بریانی میں کتنی چھٹانک نمک پڑتا ہے؟ پھر صبح چھ بجے اُٹھ جاتے اور سات تک تیار ہوکر پیدل گرومندر پہنچتے۔ وہاں سے بس آسانی سے مل جاتی تھی۔ تجربے نے ثابت کردیا تھا کہ ڈھائی تین میل پیدل چلنے میں، پیر الٰہی بخش کالونی کے بس سٹینڈ پر دھینگا مشتی کرنے کے مقابلے میں آدھا پسینہ بھی نہیں آتا۔ 8:30 تک دفتر پہنچ جاتے اور پھر اس چکی میں پستے جس کے دو پاٹن بیچ آج تک کوئی ثابت نہ بچا۔

شاہجہانی روزن

بینکوں میں اس زمانے میں دیوار کی طرف منہ کرکے بٹھانے کا رواج عام تھا اس میں غالباً یہ فائدہ ملحوظ تھا کہ دھیان اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتا۔ آدمی یکسوئی سے کھٹنوں دیوار اور کام کو گھورتا رہتا ہے۔ افسر کا منہ بھی نہیں دیکھنا پڑتا۔ خیر، ہمیں اس طرزِ نشست سے کوئی قابلِ ذکر تکلیف نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ ہم تو یوں بھی ساری عمر نوشتہ دیوار ہی پڑھتے رہے ہیں۔ دائیں جانب ایک کھڑکی تھی جس میں زنگ خوردہ سلاخوں کا آہنی سہرا لٹک رہا تھا۔ یہ سڑک کی طرف کھلتی تھی لیکن بحکم جنرل منیجر بہادر ہمیشہ بند رہتی تھی۔ موصوف کا خیال تھا کہ کھڑکی کھلنے سے بینک کے رازہائے سربستہ نامحرموں پر کھل جائیں گے۔ کبھی پٹ کھلا رہ جاتا تو باقاعدہ "انکوائری" ہوتی "کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیوں کر کھلا؟" شام کو موصوف اکثر اپنے ہاتھ سے بعض دروازوں کی تلاشی لیتے۔ زنگ اور دیمک نے ترس کھا کر اس کھڑکی میں ایک ڈیلی کھڑکی بنادی تھی جس میں سے

یورپ کی اور ہماری خواتین میں بڑا فرق ہے۔ یورپ میں جو لڑکی دُور سے سترہ برس کی معلوم ہوتی ہے وہ قریب پہنچ کر ستر برس کی نکلتی ہے اور ہمارے ہاں جو خاتون دُور سے ستر برس کی دکھائی پڑتی ہے وہ نزدیک آنے پر سترہ برس کی نکلتی ہے۔ مگر یہ وضع داری انگلستان میں ہی دیکھی کہ جو عمر دُور سے نظر آتی ہے وہی پاس ہے۔ چنانچہ کمر کمر تک بالوں والی جو لڑکی دُور سے انیس سال کی نظر آتی ہے وہ پاس جانے پر بھی انیس سال کا ''ہپی'' نکلتا ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی/ خاکم بدہن)

جائے کا کپ اور سر با سانی گزر سکتا تھا۔ اس کے سامنے کی ایک سلاخ کسی شوریدہ سر نے نکال دی تھی۔ جی گھبراتا تو ہم اس سوراخ میں سے باری باری سڑک کی سیر دیکھتے۔ یہ ''شاہجہانی روزن'' کہلاتا تھا۔ روایت ہے کہ شاہجہاں جب قلعہ آگرہ میں اسیر ہوا تو دیوارِ زنداں میں لگے ہوئے ایک نگینہ پر سے نظریں نہیں ہٹاتا تھا کہ اس میں اس کی چہیتی کے روضہ کا پورا عکس نظر آتا تھا۔ ہمیں سردی، گرمی، پھوار پڑنے، دھوپ ڈھلنے، اور چاندنی پھیلنے کا اندازہ اسی روزن سے ہوتا تھا۔ ہمیں ورنہ اندر تو ہمیشہ جھٹ پٹے کا سا سماں رہتا تھا۔ غروبِ آفتاب کے بعد اسے جھاڑن سے ڈھانک دیا جاتا، اس لیے کہ سنسان سڑک اور گھپ اندھیرا دیکھ کر دل بیٹھنے لگتا تھا۔

چند روز سے ہم دیکھ رہے تھے کہ ایک سفید بلی شاہجہانی روزن کے نیچے فٹ پاتھ پر اپنے بچوں سمیت آکر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک دن اس نے بہت میاؤں میاؤں کی تو ہم نے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ملباری چائے والے کو اکنی پھینک کر اسے دودھ پلوا دیا۔ اس کے بعد یہ روز مرہ کا معمول ہو گیا کہ وہ شام پڑتے ہی وہاں آجاتی اور ہم اس کا حق ادا کر دیتے۔ اس کے بچوں کی بڑھوار دیکھ کر جی خوش ہوتا۔ کبھی ہم وہاں نہ ہوتے یا اس کی فریاد پر دھیان نہ دیتے تو وہ جنگلے پر چڑھ کر روزن میں سے جھانکتی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بڑی بے بسی جھلکتی تھی۔ دودھ پی پلا کر کچھ دیر اپنے بچوں سے ہمارا جی بہلاتی۔ پھر اُٹھ کر چلی جاتی اور دوسرے دن چھ بجے سے پہلے نظر نہ آتی۔ گھر پر بچے روز پوچھتے کہ آج وہ بچے کتنے بڑے ہوئے۔ اگر ہمیں اتوار کو بینک نہ آنا ہوتا تو سنیچر کی شام کو اس کے دودھ میں اکنی چائے والے کو پیشگی ادا کر دیتے۔ کچھ دن سہ پہر ہی سے ہمیں اس کا انتظار رہنے لگا۔ پالتو جانور کی چپ دُسرا تھا اور اس کا پیار کتنا بھرپور ہوتا ہے اس کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی دُکھی ہو یا تنہا۔ اس کے بھی چار بچے تھے۔

سیمنٹ کا بم

بارش کے دن تھے۔ جھڑ لگ رہی تھی۔ ایسی بارش اور ایسی چھت کراچی میں پھر کبھی نہیں دیکھی۔ لگتا تھا کہ آسمان کا پیندا چھلنی ہو گیا ہے۔ مکان کی چھت بھی چھلنی ہو رہی تھی اور کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانے کے لیے چھتری لگانی پڑتی تھی۔ کوئی جگہ ایسی نہ بچی جہاں آدمی موسمی حالات سے ہر لحظہ باخبر رہے بغیر سو سکے۔ اس کے باوجود ہم نے اس بے چینی اور پھرتی کا مظاہرہ نہیں کیا جس کا نظیر اکبر آبادی مذاق اُڑا گئے ہیں:

مدت سے ہو رہا ہے جن کا مکاں پرانا
اُٹھ کے ہے ان کو مینہ میں ہر آن چھت پہ جانا

چھت پر جانے سے ایک تو پڑوسنیں مچھر دانی اوڑھ لیتی تھیں اور ان کے مرد مچھر دانی کے بانس لے کر باہر نکل آتے تھے۔ دوسرے، کوئی زینہ سرے سے بنایا ہی نہیں گیا تھا اس لیے کہ چھت اپنے ہی بوجھ کی متحمل نہ تھی۔

دوسرے کمرے کی چھلنی کے چھید اتنے بڑے تھے کہ اس کا پرنالہ ہی خشک ہوگیا۔

ایک رات ایسی بھی گزری کہ چھت رات بھر روتی رہی۔ اس کی دیکھا دیکھی بچے بھی۔ اور انہیں دیکھ کر ہماری آنکھ بھی بھر آئی۔ ان سب کو رقت سے باز رکھنے کے لیے دوسرے دن ہم نے لنچ کے وقفے میں آٹھ پونڈ سیمنٹ خریدا اور شام کو اسے لفافے میں ڈال کر، بوچھارے سے بچاتے چھپاتے، بس سٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ اتنے میں ایک بیس گز، لمبی کار دائیں طرف سے ہمارے آدھے جسم اور لفافے پر برساتی پانی اور کیچڑ کا اسپرے پینٹ کرتی زوئیں سے گزر گئی۔ کچھ دیر بعد ایک اور کار آتی ہوئی نظر آئی تو ہم نے دوسرا گال بھی پیش کردیا۔ تاکہ ہمارے کپڑے کا بایاں حصہ بھی دائیں کا ہم رنگ ہوجائے۔ آخر 19 نمبر کی بس آہی گئی۔ کیچڑ میں لت پت ہونے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ زندگی میں پہلی بار کشتی لڑے بغیر بس پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی نے فاؤل نہیں مارا۔ کسی نے کمر میں ہاتھ ڈال کر پیچھے نہیں کھینچا۔ ہم سیٹ پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ ایک صاحب جو ہمارے بعد چڑھے تھے اپنے بریف کیس کے بمپر سے ہمیں دھکیل کر ہماری سیٹ پر قابض ہوگئے۔ انہوں نے سفید شارک اسکن کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ جو کڑ بڑ تھا مگر بے داغ۔ ہم ان کے پہلو میں چھت کا ڈنڈا پکڑ کر بس کے جھٹکوں کے ساتھ جھولنے لگے۔ ان کی نگاہیں ہمیں جمنزکی پرے ہٹنے کی ہدایت کرتی رہیں۔ بس بڑی تیزی سے کیچڑ اچھالتی جارہی تھی اور ہم گیلے لفافے کو سینے سے لگائے جھوم رہے تھے کہ ایک بڑھیا نے اچانک سڑک پار کرنے کی کوشش کی اور بس دو زبردست جھٹکوں کے ساتھ رُکی۔ کھڑے ہوئے مسافروں کی لائن میں ہر سر پہلے پیچھے اور پھر آگے والے سر سے ٹکرایا۔ اور مضروبین نے ایک دوسرے کو ''ذرا ہوش کرکے کھڑے ہو'' کی تنبیہ کی۔ ہم نے لفافے کو گرنے سے روکنے کے لیے اس میں مضبوطی سے انگلیاں گڑودیں۔ یکایک بھیگا ہوا لفافہ پھٹا اور سیمنٹ کا پرنالہ شارک اسکن کے سوٹ پر دھواں دھار گرا۔ کچھ دیر تو سوائے ہمارے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ سیمنٹ کا بم کیوں اور کیسے پھٹا لیکن جب ہوا میں اُڑتے ہوئے غبار کا آخری ذرہ تک شارک اسکن کے سوٹ پر آکر جم گیا اور ہمارے ہاتھ میں خالی لفافہ رہ گیا تو دو سال کا بچہ بھی بتا سکتا تھا کہ کیا ہوا۔ دو سال کی قید ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ اس سے کم عمر کا بچہ سچوایشن کو سمجھ تو سکتا ہے مگر الفاظ میں ادا نہیں کرسکتا۔ بچے بولنے سے پہلے ہنسنا سیکھتے ہیں۔ جیسے ہی ان صاحب پر اس سانحہ کی سنگینی اور حدودِ اربعہ منکشف ہوئے۔ انہوں نے رومال سے اپنا سوٹ رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کی لیکن گیلے سوٹ پر اعلیٰ کوالٹی کا مضبوط اور پائیدار سیمنٹ، ایسا چپٹا کہ:۔

پھیلتا ہے اس قدر جتنا کہ رگڑا جائے ہے

اُس نے عالم میں بزبان اُردو انگریزی میں جو کچھ کہا، خدا اسے معاف کرے۔ ہم نے تو اسی وقت معاف کردیا تھا۔ قابلِ اشاعت فقرہ صرف یہی تھا کہ پرسوں ہی وردی کو 75 روپے نقد سلائی دی تھی۔ بس اور ان کی زبان چلتی رہی۔ ذرا دیر بعد آخری سیٹ سے ایک صاحب نے ٹھیٹ کرخنداری لہجے میں ہدایت فرمائی ''بھائی جان! فوراً سے بیشتر نلکے کے نیچوں غسلِ صحت کرلو، جھٹ ذہنی سیمنٹ جم گیا تو پھٹ ذہنی ملکہ نور یہ کا بت بن جاؤ گے، محلے کے لونڈے لولو بنادیں گے۔ زوجہ صاحبہ بھی نہیں پہچان پاویں گی''۔ سیمنٹ پوش صاحب نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن دو تین منٹ بعد پہلے ہی پرنالے پر بس سے اُتر گئے۔

چار پانچ دن بعد ہم پھر اس بس میں چڑھنے لگے تو ہمارے آگے آگے چارٹرڈ بینک کے منیجر کی سیکرٹری

38-24-38 تھی۔ کنڈکٹر نے ہمیں آنکھ مار کے، ریزگاری کا تھیلا بجاتے ہوئے ہانک لگائی "بابو جی! ذرا سنبھل کے، آگے پیچھے کے بمپر سے ہوشیار! ہاں جی! میکلوڈ روڈ، پوسٹ آفس، صدر، گرومندر، جمشید روڈ، بڑا گھر (جیل) کالونی۔ مہربان قدردان! بس میں چھتری، چاقو، چرس، گانجا اور سیمنٹ لے جانے کی اجازت نہیں ہے"۔

کراچی کی برسات

پانچ چھ سال بعد ایسی بھر کے بارش ہوتی ہے تو کراچی کی تاریخ اور کلچر کا حصہ بن جاتی ہے۔ سارا نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اسے معمول پر لانے میں پانچ چھ برس لگتے ہیں۔ جگی نشینوں کے لیے یہ بارانِ زحمت، آفاتِ ارضی و سماوی کا درجہ رکھتا ہے۔ دیکھا جائے تو غالب بھی بارش کے اس لیے دلدادہ نہیں تھے کہ پینے کے لیے آب مقطر کی سپلائی بڑھتی ہے۔ کھیتی باڑی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ بلکہ

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں

محکمۂ موسمیات بارش کا سالانہ اوسط چار انچ بتاتا ہے مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے ہماری تنخواہ اور آدم جی، سہگل اور داؤد سیٹھ کی آمدنی کو جوڑ کر ہمارا اوسط چھ کروڑ نکالا جائے اور اس پر ہم سے انکم ٹیکس کا مطالبہ کیا جائے۔ پھر گھر کے سامنے قرقی کا ڈھول بجا کر ہماری تصانیف کی ناقابل فروخت کاپیاں، دوائیں اور ٹائیاں نیلام کر دی جائیں۔

"بقدرِ اشکِ بلبل" تو پھر بھی غنیمت ہے۔ کراچی میں تو بارش اس طرح ہوتی ہے جیسے کوئی مگرمچھ آنسو بہا رہا ہو۔ کراچی کے اکثر پرانے مکانوں کی چھتوں میں آپ کو پرنالے اور موریاں نظر نہیں آئیں گی۔ بعض سڑکوں پر تو برساتی پانی، بلکہ ٹریفک کے نکاس کا بھی کوئی انتظام نہ ملے گا۔ کراچی کو دنیا کے تمام شہروں کے مقابلے میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کبھی چھتریاں اور برساتیاں نظر نہیں آتیں۔ یوں تین چار مہینے گھنگھور گھٹائیں چھائی رہتی ہیں۔ بھولے سے کسی پروگرام ڈائریکٹر کی کھڑکی کھل جائے تو ریڈیو اسٹیشن ساون کے گیت نشر کرنے شروع کر دیتا ہے۔ کراچی کے مطلع پر ساون بھادوں میں گہرے بادل اور محکمۂ موسمیات کی پیش گوئیوں کا دھند چھایا رہتا ہے۔

کشتِ بے آب نے دیکھے ہیں وہ کالے بادل
جو کہیں اور برسنے کو اِدھر سے گزرے

جب دریاؤں میں طغیانی آتی ہے اور پنجاب کے اکثر علاقے زیرآب آجاتے ہیں تو کراچی کے ہوٹلوں اور بوتلوں میں سے کئی ہزار کیوسک فی سیکنڈ بادۂ ناب کا اخراج ہونے لگتا ہے۔ غالب ہوتے تو یہ نقشہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔ کلکتے اور اس کے "وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے!" کو بھول جاتے۔

لیکن اس سال سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ بارش اور ایسی بارش! ایسی بارش ہم نے صرف مسوری میں اپنی شادی کے دن دیکھی تھی کہ پلاؤ کی دیگوں میں بیٹھ کر دلھن والے آ، جا رہے تھے خود ہمیں ایک کفگیر پر بٹھا کر قاضی کے سامنے پیش کیا گیا۔ پھر نہ ہم نے ایسی حرکت کی اور نہ بادل ایسا ٹوٹ کے برسا۔ عجب سماں تھا۔ جدھر دیکھو پانی۔ اس دن سوائے دلھن کی آنکھ کے ہمیں کوئی چیز خشک نظر نہ آئی۔ ہم نے ٹہوکا دیا کہ رخصتی کے وقت دلھن کا رونا رسومات میں داخل ہے۔ انہوں نے بہت پلکیں پٹپٹائیں، مگر ایک آنسو نہ نکلا۔ پھر کار میں سوار کراتے وقت ہم نے سہرا اپنے چہرے سے ہٹایا۔ خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

ایسی ہی بارش ان دنوں کراچی میں ہو رہی تھی۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے کسی سے سنا تھا کہ پنڈی میں تو مکئے

کے برابر اولے پڑے ہیں۔ ایسا موسلادھار برسا کہ ہر طرف جل تھل ہوگیا۔ سڑکیں دریاؤں کی طرح بہہ رہی تھیں۔ میکلوڈ روڈ پر چارٹرڈ بینک کے سامنے اصفہانی خاندان کے ایک بزرگ کی کارڈ بکیاں لگا رہی تھی اور وہ اس کی چھت پر بیٹھے کراچی میونسپل کارپوریشن کو قدیم فارسی میں گالیاں دے رہے تھے۔ سٹاف کو ساڑھے تین بجے چھٹی دے دی گئی تھی اور ہم بھی چھ بجے تک اٹھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وقت معینہ سے کافی پہلے موتی (بچوں نے بلی کا یہ نام رکھ دیا تھا) آئی۔ ہم نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کُل تین آنے! اب اسے اور اس کے کنبے کو ایک آنے کا دودھ پلوا دیتے تو بس سے ٹکٹ میں دو پیسے کم پڑ جاتے۔ وہ کھڑکی کے نیچے بھیگتی رہی۔ روتی رہی، ہم نے پروانہ کی۔ پھر اس نے پنجوں سے کھڑ کھڑ کی اور بار بار روزن سے جھانکنے لگی تو ہم نے اسے جھاڑن سے ڈھک دیا تاکہ یکسوئی سے کام سمیٹ سکیں۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے رزق کی تلاش میں کہیں اور نکل گئی۔ بارش ذرا تھمی ہم اٹھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ چائے والا جس نے اپنی دکان ایک دروازے کی محراب میں منتقل کر لی تھی، کھڑکی کھٹکھٹانے لگا۔ ہم نے پوچھا کیا بات ہے؟ کہنے لگا بابو جی! تمہاری بلی ریلی برادرز کے ٹرک کے نیچے آکر مر گئی۔ یہ لو اس کے بچے۔ ہلک رہے ہیں۔ یہ خون تمہاری گردن پر۔

یہ خون ہماری گردن پر تھا۔ اگر ہم آج بھی پیدل چلے جاتے تو کون سی قیامت آجاتی۔ چاروں بچے بارش میں شرابور تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ہم نے سب سے چھوٹے کو میز پر بٹھا کر ڈسٹر سے خشک کیا تو اس کی آنکھوں کی طرف نہ دیکھا گیا۔ ہو بہو ماں جیسی تھیں۔ بارش پھر تیز ہوگئی اور ہم نے کھڑکی کھول کر تین آنے بہتے نالے میں پھینک دیے۔ انہی کی وجہ سے وہ اپنی جان سے گئی۔ ہفتوں اس کی اُداس نیلی نیلی آنکھیں اس روزن سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیں۔ آخر ہم نے تنگ آکر اس روزن پر براؤن کاغذ چپکا دیا۔

بول میری مچھلی کتنا پانی؟

چاچا فضل دین (چوکیدار) صبح ہمارے لیے پھر سیمنٹ خرید لایا تھا۔ اس گارنٹی کے ساتھ کہ اب کے لفافہ سیمنٹ سے زیادہ پائیدار ہے۔ اس نے کہیں سے ٹوکری بھی برآمد کی جس میں لفافہ اور موتی کے چاروں بچے رکھ کر ہم برستے مینہ میں پیدل روانہ ہوئے۔ وہ تین آنے ہمارے پاس ہوتے بھی تو کچھ کام نہ آتے، اس لیے کہ بسیں چلنی کبھی کی بند ہو چکی تھیں۔ پانی کی چادر چل رہی تھی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ سڑک کہاں ہے لیکن سات آٹھ ڈبکیوں کے بعد آسان پہچان ہاتھ آگئی۔ جہاں جہاں پانی زیادہ گہرا اور گڑھے تھے، وہی سڑک تھی۔ بندر روڈ طغیانی پر آئی ہوئی تھی۔ اور ہم اس کی موجوں اور کوڑے کے تھپیڑوں سے بچتے بچاتے گلیوں گلیوں جا رہے تھے۔ لائٹ ہاؤس سینما کے پاس کمر کمر پانی تھا، بشرطیکہ کمر دانے کا قد ½6 فٹ ہو۔ لیکن گلی بہت بہتر تھی۔ وہاں صرف کیچڑ تھا۔ چنانچہ ہم اُدھر ہو لیے۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ محسوس ہوا گویا کسی نے سر پر مشک چھوڑ دی لیکن مشک میں سے دِلّی کی نہاری کا دھواں تو نہیں نکلتا۔ وہ تو خدا نے خیر کی کہ سر پر پہلے تربوز کا ہیلمٹ آن کرفٹ ہوگیا، ورنہ بمبئی آم کی ایک سیر وزنی گٹھلی سے سر پاش پاش ہو جاتا۔ گردن اٹھا کر دیکھا تو ایک لڑکی بالٹی اُلٹے، چوتھی منزل کی بالکنی میں کھڑی کھلکھلا رہی تھی۔ کہیں سے آواز آئی "......ہرا سمندر، بول میری مچھلی کتنا پانی؟" اس کے بعد ہم نے بندر روڈ پر غرقاب ہوتے کو گلیوں میں نہاری سے غسل کرنے اور پھسلنے پر ترجیح دی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ پھسلنے پر ہمیں خدانخواستہ اصولاً کوئی اعتراض ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی طرح، ہم تو کیچڑ نہ ہو تب بھی پھسلنے کے لیے جی جان سے تیار ہیں:۔

صاحبو! اگلے وقتوں کے لوگ جن میں اپنا شمار کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے درحقیقت ناقابل اصلاح ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ نباہ کرنا نئی نسل کے لیے مشکل سے مشکل ہوتا ہے۔ اکبرالہ آبادی نے کیسے پتے کی بات کہی تھی۔

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

میری عمر اور نسل کے لوگ عرصہ دراز سے ''وعلیکم السلام'' ہی کہتے آئے ہیں ایسی ہی شان اور طنطنے والے بزرگ کے بارے میں سنا ہے کہ جب وہ قبرستان میں داخل ہوتے ہیں تو السلام علیکم یا اہل القبور کہنے کی بجائے وعلیکم السلام لیٹے رہیے کہتے ملیں گے۔

فائل کے طلبہ کا تازہ بہ تازہ نو بہ نو موضوعات پر کام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ چند موضوعات پر عدم دلچسپی، اور نامحرم والی بے نیازی دیکھ کر اور زیادہ خوشی ہوئی۔ علامہ اقبال نے فن کاروں اور لکھنے والوں سے گلہ کیا تھا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت سوار

سنا ہے اس پر سعادت حسن منٹو نے یہ فقرہ کہا تھا کہ مرد کے اعصاب پر عورت نہیں تو کیا ہاتھی گھوڑے سوار ہوں گے۔
(مشتاق احمد یوسفی/ خاکم بدہن)

کیچڑ سے ہر مکاں کی تو بچنا بہت پھرا
جب دکھائی دی کھلے بالوں کی اک گھٹا
بجلی بھی چمکی حسن کی، مینہ برسا ناز کا
پھسلن جب ایسی آئی تو پھر کچھ نہ بس چلا
آخر کو واں نظیر بھی آکر پھسل پڑا

جوتوں کا اکلوتا جوڑا پانی میں بھیگ کر مخمل کی طرح ملائم ہو گیا تھا اور اسے مزید مخملیں ہونے سے بچانے کے لیے ہم نے ٹوکری میں رکھ لیا۔ پانی میں نہ صرف لطف آیا بلکہ اس کی اُنگلی پکڑے پکڑے بچپن بھی لوٹ آیا۔ ہمیں اُن پر بڑا ترس آیا جو بچپن میں کبھی ننگے پیر نہیں پھرے، اور نہ بارش میں نہائے۔ انہوں نے اپنا بچپن ضائع کیا۔ وہ کیا جانیں کہ جب بادلوں کے جھما جھم بان گرمی دانوں سے بھرے ہوئے بدن کو باڑھ پر رکھ لیتے ہیں تو کیسی گدگدی ہوتی ہے اور زمین کا ہر قدم پر بدلتا ہوا ٹھنڈا اور کورا پنڈا، اس کی نرمی، گرمی اور کٹیلا پن کیا چیز ہوتی ہے۔ دھرتی اپنا آپا بھید بھاؤ جوتے کے تلے کو نہیں دکھایا کرتی۔

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں

راستے بھر گہرے فکر اور پانی میں ڈوبے رہے۔ صبح تک جُوتے کیسے سوکھیں گے؟ ''اُجلے پوش لانڈری رجسٹرڈ'' بھی بارش کی وجہ سے دو دن سے بند تھی۔ بارش سے پہلے اس کے کارندے شہر سے دُور دھوبی گھاٹ کے گندے نالے میں ''ارجنٹ'' دُھلائی کرتے تھے۔ بارش کے بعد یہ سہولت گلی گلی میسر ہوگی۔ یہ لانڈری بکفایت یعنی ڈھائی آنے میں دن کے دن قمیص دھو دیتی تھی۔ جب کہ شہر کی لانڈریاں اس زمانے میں قمیص کی ''ارجنٹ'' پھڑوائی کے چھ آنے لیتی تھیں۔ ہم سوچنے لگے کہ گھر میں اتنا پانی کہاں کہ کپڑے دھو کر صبح کوئلوں کی استری سے خشک کر لیں۔

آخر الذکر کو برسات میں دھوپ کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے تھے۔ گھر میں کوئی مضبوط الگنی بھی نہیں تھی جس پر خود کو لٹکا کر کپڑے پہنے پہنے سکھا لیتے۔ کالونی میں نکلتے نہیں تھے مگر یہ اکبرالہ آبادی کا زمانہ نہیں تھا کہ نکلے لگنے کو ایک قومی سانحہ سمجھ کر شاہ ایڈورڈ کی دہائی دی جائے کہ کیا زمانہ آن لگا ہے:۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

بحمد اللہ! میونسپل کارپوریشن نے ہمیں پہلے سانحہ سے بذریعہ مشک محفوظ رکھا۔ کالونی کی کوآپریٹو سوسائٹی ٹنکیوں کے ذریعہ پانی تو کیا تقسیم کرتی، بوند بوند کو ترساتی تھی۔ ہمیں تین مشک روزانہ کے کوپن ملتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا یہ مشکیں خاص طور پر آرڈر دے کر بکری کے قبل از وقت پیدا ہونے والے بچوں کی کھال کی بنوائی گئی تھیں۔

ان تین مشکوں میں تین بہشتی حسب توفیق وطاقت پھونک بھر دیتے تھے۔ ربر کی دریافت سے پہلے ایسی مشکیں تیرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ کبھی زوری وزاری یا آٹھ دس آنے کے نذرانہ سے ایک مشک زیادہ مل جاتی تو گویا عید بلکہ ہولی ہو جاتی۔ تین دن سے سڑکیں کٹ جانے کے باعث پانی کی ٹنکیاں نہیں آئی تھیں اور پانی پینے کا بھی تیمم کرنا پڑتا تھا۔

گھر کے سامنے والی سڑک کے نالے کی صحیح گہرائی، آخری اعشاریہ تک، تو ہم نہیں بتا سکتے۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک موج ہماری عینک بہا کر لے گئی اور اب ہم اس قابل بھی نہ رہے کہ ڈبکی کھائے بغیر، پانی اور خشکی کی تمیز کر سکیں۔ گلی کے نکڑ پر شیخ رحیم بخش، مالک رحیم بس کمپنی، نے ترس کھا کر ایک پرانا ٹیوب دیا۔ جسے کمر سے باندھ کر ہم نے چڑھتی ندی پار کی۔ کالونی کے تمام مکان ایک دوسرے کا چربہ تھے اور بغیر عینک کے تو ہر مکان پر اپنے مکان کا گمان ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ تین چار جگہ اہل محلہ نے پان کی ایک ایک گلوری کھلا کر واپس پانی میں چھوڑ دیا۔ دربدر لنگر اندازی کے بعد گھر آیا تو دیکھا کہ برآمدے اور کمرے میں نالے کا پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہے (مکان چونکہ نشیبی علاقے کے پیالے میں واقع ہوا تھا)۔ جن موریوں کا کام گھر کا گندہ پانی باہر نکالنا تھا وہ اب فعل معکوس انجام دینے میں جتی ہوئی تھیں۔ یعنی باہر کا غلیظ پانی ان کے توسط سے بھل بھل اندر داخل ہو رہا تھا۔ سطح آب پر جا بجا روئی کے گالے تیر رہے تھے۔ ہوا یوں کہ ایک دن ہم نے اپنی اولاد کو تنبیہ کی کہ شرفا کے بچے گلاسوں اور چلموں سے نہیں لڑا کرتے۔ خدا ان کی عمر دراز کرے، اس کو ان سعادت مندوں نے ایسا گرہ میں باندھا کہ پھر بھی تکیے سے زیادہ سخت چیز استعمال نہ کی۔ ایک چارپائی پر دونوں بچیاں اپنی گڑیوں پر چھتری لگائے سہمی بیٹھی تھیں۔ چھوٹی کے منہ پر ابھی تک دودھ کی مونچھیں بنی ہوئی تھیں۔ دوسری چارپائی کتابوں کے مچان تلے چھپی تھی، جو کباڑی سے خریدے ہوئے 'مصیبے اینڈ سنز ناشران وسوداگران کتب' کے سائن بورڈ کو دیوار پر ریلوے کی بالائی برتھ کی طرح لٹکا کر بنایا تھا۔ اس پر ساری متاع فقیر...... کتابیں...... تین قطاروں میں ٹکی رہتی تھیں اور ان کے اوپر دیگر اشیائے غیر ضروری۔ اس "فالس سیلنگ" کے نیچے چارپائی پر دونوں بیٹے پشیمان بیٹھے تھے۔ بڑے نے سوتے میں نیکر سے باتھ روم کا کام لیا تھا اور اب پیش بندی کر رہا تھا کہ دیکھئے امی! میری نیکر میں آپ کے گڈو نے پیشاب کر دیا ہے! تعجب اس پر تھا کہ گڈو میاں سسکیاں لے لے کر یقین دلا رہے تھے کہ امی اب نہیں کروں گا! لالٹین ایک کونے میں لٹکی ہوئی تھی۔ جہاں ایک کالی زبان بن گئی تھی۔ ٹوٹے ہوئے گلوب پر جو کاغذ آٹے سے چپکایا گیا تھا وہ آدھا جل چکا تھا۔ اس کی آنکھ مارتی ہوئی روشنی میں ہمارے بچوں نے بلی کے بچوں کو دیکھا اور دونوں کے بچے ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

آج ہم نے اپنا چہرہ دیکھا

بیگم بہت خوش خوش نظر آ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہمیں کچے صحن میں لے گئیں اور کہا "دیکھو آج میں نے دو ٹنکیاں پانی سے بھرلی ہیں! بالکل موتی کی طرح! ڈھیروں کپڑے دُھل جائیں گے"۔ تین دن سے پانی بالکل بند تھا اور لوگ بوند بوند کو ترس گئے تھے۔ یہ دو ٹنکیاں انہوں نے برآمدے کے پرنالے کے نیچے رکھ کر پانی سے بھری تھیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر یہ بی بی اس قدر خوش ہو رہی تھی گویا کوئی خزانہ مل گیا۔ یہ دکھانے کے لیے دونوں لبالب بھری ہیں انہوں نے لالٹین اپنے چہرے تک اٹھائی تو مانگ میں ایک سفید بال نظر آیا جو اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پانی اولے کی طرح ٹھنڈا ٹھار اور موتی کی مانند جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ ہمیں اس میں اپنا چہرہ نظر آیا۔

مفلسی میں جوتا گیلا

گھر کی ساری کائنات چارپائیوں پر محفوظ کرلی گئی تھی۔ بچے ایلومینیم کی پتیلی کو تیرتا ہوا دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ مٹی کے چولہے سے پانی اُبل رہا تھا۔ دیکھا آج پیروں پر ورم نہیں ہے۔ اتنی دیر ٹھنڈے پانی میں رہنے سے تلوے اتنے گورے ہوگئے کہ ہمیں شبہ ہونے لگا کہ کسی اور کے تو نہیں آگئے۔ سلوٹیں پڑنے سے، بقول گڈو میاں، کریپ سول بن گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں نالا اُتر گیا اور سارے گھر میں اُجلی اُجلی ملائم مٹی کی دبیز تہ چھوڑ گیا۔ بچے اپنے ننھے منے پیروں کے نشان دیکھنے کے لیے اس پر خوب چلے۔ بالکل ایسے ہی بقدم خود نشان پلنگ کی چادر پر بھی تھے، مگر وہ زیادہ واضح اور دیرپا تھے۔ سونے سے پہلے ہم نے دونوں جوتوں کو فیتے سے باندھ کر لالٹین کی گردن میں ہار کی طرح لٹکا دیا تاکہ صبح تک سوکھ جائیں۔

صبح ساڑھے چار بجے بجلی کے کڑکنے سے آنکھ کھلی تو کمرے میں چمڑا جلنے کی چراند پھیلی ہوئی تھی۔ اُٹھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ جو جوتا گلوب کے ٹوٹے ہوئے رُخ پر تھا اس کی ایڑی کے اوپر کا پشتہ جل کر اب پشاوری چپل بن گیا ہے۔ ہم لالٹین اور جُوتا بجھا کر ایسے سوئے کہ صبح پونے سات بجے آنکھ کھلی۔ اس وقت تک بیوی ہمارے کپڑے استری کر کے اپنے سکول پڑھانے جا چکی تھیں۔ کپڑوں پر ایک پرچہ رکھا ملا جس پر لکھا تھا کہ رات میں تمہیں بتا نہ سکی۔ ڈاکٹر نے مجھے یرقان بتایا ہے۔ خوامخواہ ڈھیر ساری دوائیں اور انجکشن لکھ مارے ہیں۔ میں واپسی میں پاکستان چوک کے ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے دوا لیتی آؤں گی۔ زرد رنگ تمہارا فیورٹ (پسندیدہ) رنگ بھی تو ہے۔

زخم کا سفر

جُوتا ایسی چیز نہیں کہ زیور کی طرح مانگ تانگ کر پہن لیا جائے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ چپل پہن کر بینک جائیں اور تین دن بعد تنخواہ ملے تو نیا جُوتا خرید لیں۔ پھر خیال آیا کہ اگر اینڈرسن پوچھ بیٹھا کہ آج انسپکشن ڈپارٹمنٹ چپل پہنے کیوں پھر رہا ہے تو کیا جواب دیں گے۔ ایک دفعہ ایک افسر بینک میں بغیر ٹائی کے آگیا تو اینڈرسن نے اس سے پوچھا کہ آج کیا بینک ہالی ڈے ہے جو یوں ننگ دھڑنگ پھر رہے ہو؟ اسی طرح ایک کلرک کا تین دن کا بڑھا ہوا شیو دیکھ کر روٹی پکڑاتے ہوئے کہنے لگا کہ اپنا کیموفلاژ منڈوا کر آؤ تاکہ چہرہ شناخت کر کے رجسٹر میں حاضری لگائی جا سکے۔

ذہن پر زور ڈالا تو اس کا حل بھی نکل آیا۔ چپل پہن کر ایک پیر پر پٹی باندھ لیں گے۔ کسی نے پوچھا تو کہہ دیں گے کہ چوٹ لگ گئی ہے۔ اور یہ کچھ ایسا جھوٹ بھی نہیں۔ آخر اندرونی چوٹ تو آئی ہی تھی جس کے بارے میں حضرت نوح ناروی سہل ممتنع میں فرماتے ہیں:۔

جگر کی چوٹ اُوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے
جگر کی چوٹ اُوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے

ایک مونڈھے پر نیلے رنگ کا جھاڑن پڑا نظر آیا۔ اس میں سے ایک لمبی دھجی پھاڑ کر پٹی باندھ لی۔ سہ پہر کو اینڈرسن کی نظر پڑی تو کہنے لگا کہ زخم پر کبھی رنگین پٹی نہیں باندھنی چاہیے۔ پک جاتا ہے، خصوصاً برسات میں۔

دوسرے دن صبح دونوں کام پر جانے کے لیے تیار ہونے لگے تو بیگم دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کہنے لگیں کہ تمہارے ان لاڈلوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے اور کچھ نہیں تو کم بخت آدھا دوپٹہ ہی پھاڑ کر لے گئے۔ ان کا دایاں کان ایک کھونٹے میں سے باہر نکلا ہوا تھا۔

ہم نے پٹی واپس کر دی اور جلدی جلدی ایک پھٹے پاجامے کے لٹھے کی سفید پٹی باندھ کر بینک چلے گئے۔ گیارہ بجے کسی کام سے اینڈرسن نے طلب کیا۔ واپس آنے لگے تو عینک کو ناک کی پھننگ پر رکھ کر اس کے اوپر سے دیکھتے ہوئے فرمایا "JUST A MINUT, TAMERLANE" "تمہارے زخم نے چوبیس گھنٹے میں کافی مسافت طے کی ہے۔ دائیں سے بائیں پیر میں منتقل ہو گیا ہے"۔

اب جو ہم نے نگاہ ڈالی تو دھک سے رہ گئے۔ افراتفری میں آج دوسرے یعنی بائیں پیر پر پٹی باندھ کر آ گئے تھے۔

جانا ہمارا کاک ٹیل پارٹی میں

ڈی۔ جے اور انگرکھا

"تمہارے پاس D.J ہے؟" مسٹر اینڈرسن نے پوچھا۔

"یہ کیا ہوتی ہے؟"

وہی جس کا کالر سیاہ ساٹن کا ہوتا ہے اور پتلون اور بینڈ بجانے والوں کی سی ریشمی پٹی لگی ہوتی ہے"۔

"مسلوا تو لو۔ بینک سے ڈسمس ہونے کے بعد بینک کی انتظامیہ کی طرف سے بینڈ بجانے پر کوئی پابندی نہیں۔ تم نے سنا ہوگا، ڈنر جیکٹ پہن کر تو بینکر کی بھی اشرافوں کی سی صورت نکل آتی ہے"۔

"سرا میں ڈنر جیکٹ پہن کر کہاں جاؤں گا؟ اُردو میں مثل ہے کہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا"۔

"How Stupid"۔ جاننا چاہیے کہ مور صرف اپنی مادہ کو دکھانے کے لیے ناچتا ہے اسے آدمیوں سے کیا رغبت ہو سکتی ہے؟ پروموشن کے بعد تم بوٹ کلب یا سندھ کلب کے ممبر نہیں بنے؟ کیا ساری تنخواہ دال روٹی پر ہی ضائع کر دیتے ہو؟ اب تو غیر یورپین بھی ممبر ہو سکتے ہیں"۔

"میں بس سے آتا جاتا ہوں۔ پیر الٰہی بخش کالونی کے بس سٹاپ کے بھیڑ بھڑکے، کشتم پچھاڑ سے دل ڈرتا ہے۔ دو ڈھائی میل پیدل چل کر صبح گرو مندر سے بس پکڑتا ہوں تا کہ دفتر بغیر قمیص کے نہ پہنچوں"۔

"بینک کے جنرل منیجر کو اس سے سروکار نہیں کہ تم اپنے نیم رضا مند وجود کو ڈرائنگ روم سے بینک میں کس طرح ڈھو کر لاتے ہو"۔

"بائی دی وے، میرے کوارٹر میں کوئی ڈرائنگ روم نہیں ہے۔ ہمارے حصے میں ایک کمرہ آیا ہے، جس میں قالین بھی نہیں WALL-TO-WALL بچے بچھے رہتے ہیں"

"میں تمہاری مفلوک الحالی کی بے مثل منظر کشی سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ لیکن یاد رہے کہ مغرب میں ذاتی مشکلات کا "اسٹرپ ٹیز" بدمذاقی سمجھی جاتی ہے۔ اچھا تو 27 تاریخ کو میرے ساتھ کاک ٹیل میں چلنا۔ پھر

تمہیں CALEOONIAN SOCIETY کے ANNUAL BALL میں بھی لے چلوں گا۔ اسکاٹ کلچر اور پہناوے دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ ڈنر جیکٹ فوراً بنوالو۔ افسوس کہ تمہارا کوئی معقول "فارمل ڈریس" نہیں۔ تمہارے جتنے بھی پہناوے ہیں سب کے سب "UNSCIENTIFIC"

"کیسے؟" ہم نے بات کو طول دیا کہ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔

"عجیب بات ہے۔ عورتیں تو اپنے خوب صورت چہرے کو نقاب اور ملحقہ ارتقائی تجاوزات کو دوپٹے سے ڈھانک لیتی ہیں اور مرد؟ برانہ ماننا۔ میں نے کلکتہ میوزیم میں اودھ کے نواب کی تصویر دیکھی تھی۔ ڈھاکہ ململ کے انگرکھے میں سے ایک عدد نوابی چوچی بطور نمونہ باہر نکال رکھی تھی۔ دوسری بھی ویسی ہی ہوگی۔ VERY UNSCIENTIFIC۔ اپنے لباس پر غور تو کرو۔ 112 ڈگری ٹمپریچر میں سر پر بیس گز لمبا صافہ، اور جنوب میں دس گز گھیر کی شلوار! مانسون کی اُمس میں اَچکن اور ناف سے لے کر ٹخنوں تک سرکس والوں کا سا انڈرویئر، کیا کہتے ہیں اسے؟"

"چوڑی دار پاجامہ"۔

"ALL VERY UNSCIENTIFIC"

"لیکن یورپین لباس اس سے بھی زیادہ اَن سائنٹیفک ہے۔ یورپ میں برف گر رہی ہو اور ٹمپریچر نقطۂ انجماد سے بیس ڈگری کم ہو تو ہٹے کٹے مرد تو گھٹنوں تک دوہرے اُونی موزے LEGGING اور گرم پتلون پہنتے ہیں اور نازک اندام عورتوں کی ٹانگیں رانوں تک کھلی رہتی ہیں!"

"سُود خور! تمہیں ننگی ٹانگوں پر کیا اعتراض ہے؟"

"سر! مجھے تو باقی ماندہ لباس پر اعتراض ہے؟"

"تم نے کل مجھے بیلجین فرینک کا بھاؤ غلط بتا دیا۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا"۔ اس نے اس طرح کہا جیسے ہمارا فقرہ سنا ہی نہیں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو

یہ وہ زمانہ تھا جب برٹش کمپنیوں، فوج، آئی سی ایس اور انگریزوں کی ماتحتی میں کام کرنے والے دیسی افسر اپنے آپ کو روشن خیال، سوشل اور اہل ثابت کرنے کی خاطر دل پہ جبر کر کے شراب پینا سیکھتے تھے۔ کچھ دن کی مشق کے بعد ایسے رواں ہوتے کہ نہ پینے کے لیے دل پہ جبر کرنا پڑتا تھا۔ روز کہیں نہ کہیں کاک ٹیل پارٹی ہوتی تھی اور آدمی ذرا سوشل اور خوش اخلاق ہو تو سال کے ۳۶۵ دن دوسروں کے خرچ پر خود کو ہر شام اُلو بنا سکتا تھا۔ کاک ٹیل پارٹی بیک وقت انگریزوں سے تقریب بہر ملاقات، مفت مے نوشی اور صاحبانِ امروز تک رسائی کا پاسپورٹ ہوتی تھی۔ عجب مخمصہ تھا۔ کچھ مسلمان افسر تو اس الزام میں نکال دیے جاتے تھے کہ وہ سوشل نہیں، یعنی شراب نہیں پیتے۔ بقیہ افسروں کو اس بنا پر برخاست کردیا جاتا کہ وہ ALCOHOLIC ہوگئے ہیں اور ہنگسڈ پارٹیز میں ڈنڈ مچانے لگے ہیں۔ دو چار ہی خوش قسمت ایسے ہوتے تھے جو برخاست ہونے کی ذلت سے بچ جاتے تھے۔ یہ وہ ہوتے تھے جو ڈسمس ہونے سے پہلے ہی جگر کے "سروسس" میں باعزت طریقے سے وفات پا جاتے تھے۔ راویانِ رنگیں بیاں سے روایت ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں انگلینڈ میں لوگ بھوت پریت کے بڑے قائل تھے۔ ہر کسی عورت پر چڑیل ڈائن کا شبہ کرتے۔ پھر یہ تحقیق کرنے کے لیے کہ وہ واقعی چڑیل ہے یا بے

سیارہ ڈائجسٹ کے عظیم الشان اسلامی نمبرز

قرآن نمبر
ایمان افروز عقل پرور اور عمل آفرین پیشکش
(تین جلدوں میں۔ قیمت: 525 روپے)

رسول ﷺ نمبر
سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز
(دو جلدوں میں۔ قیمت: 320 روپے)

آثارِ قیامت نمبر
قرآن و حدیث کی روشنی میں علاماتِ قیامت، روزِ آخرت اور حیات بعد از موت کا احوال (قیمت: روپے)

اولیائے کرام نمبر
اللہ کے برگزیدہ بندوں کی ایمان افروز داستانیں
(چار جلدوں میں۔ قیمت: 640 روپے)

عکس سیرت نمبر
حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی حیات طیبہ پر مبنی مقدس تالیف کتاب (قیمت عام جلد 275 خاص ایڈیشن 450 روپے)

اخلاق رسول ﷺ نمبر
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کے پاکیزہ واقعات پر مشتمل دستاویز (قیمت: 160 روپے)

فرمانِ رسول ﷺ نمبر
عاشقانِ رسول کی خدمت میں ایک
بے مثال تحفہ (قیمت: 160 روپے)

خلفائے راشدین ؓ نمبر
اسلام کی سربلندی کیلئے خلفائے راشدین کی
بے مثال قربانیوں کا ذکر (قیمت: 160 روپے)

صحابہ کرام ؓ نمبر
ان عظیم ہستیوں کی کہانی جنہوں نے رحمت العالمین کی معیت میں زندگی بسر کی (قیمت: 160 روپے)

ازواج مطہرات ؓ نمبر
امہات المومنین کی پاکیزہ زندگی کے واقعات جو آج تک ایک مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے (قیمت: 200 روپے)

انبیائے کرام نمبر
پیغمبرانِ خدا کی حیاتِ طیبہ جو دل و دماغ کے
روح پرور تذکرے (قیمت: روپے)

فہم دین نمبر
سماجی زندگی اور عبادات کے بنیادی مسائل کا حل
قرآن و حدیث کی روشنی میں (قیمت: 160 روپے)

قرآنی وظائف نمبر
ہماری آپ کی اور ہر گھر کی پریشانیوں، الجھنوں اور مشکلات سے حل کیلئے وظائف (قیمت: 175 روپے)

معجزاتِ رسول ﷺ نمبر
سرورِ کونین ﷺ کی زندگی کے دوران وقوع پذیر ہونے والے سینکڑوں معجزات پر مشتمل دستاویز (قیمت: روپے)

دعا نمبر
دُعا تقدیر بدل دیتی ہے
حدیث رسول (قیمت: 160 روپے)

اسلامی حکایات نمبر
دلچسپ اور منفرد طرز تحریر میں قوت ایمانی سے سرشار
سبق آموز حکایات کا مجموعہ (قیمت: 160 روپے)

صحابیات ؓ نمبر
100 سے زائد صحابیات ؓ کا تذکرہ جنہوں نے
رسول اکرم ﷺ سے بیعت کی (قیمت: 160 روپے)

قصص القرآن نمبر
ان واقعات کا مجموعہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور اُن کی امت کو بتانا ضروری سمجھے (قیمت: 175 روپے)

توبہ نمبر
توبہ کے دروازے کھلتے ہیں، سنہرے واقعات سے مزین توبہ کے آداب اور فضائل (قیمت: 160 روپے)

حج عمرہ اور زیارات نمبر
حج اور عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ آسان و عام فہم زبان میں اہم مقامات کی نشاندہی اور روداد سفر (قیمت: 160 روپے)

حقوق العباد نمبر
حقوق و فرائض انسانی بیان کرتا مجموعہ جس پر عمل کر کے ہی اچھا مسلمان بنا جا سکتا ہے (قیمت: 160 روپے)

شرعی احکام نمبر

لازوال اسلامی واقعات نمبر

والدین نمبر

گناہ، گاؤں کے پنچ پنچایت اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے کستے اور بھاری پتھر سے باندھ کر نزدیک ترین دریا میں پھینک دیتے۔ اگر وہ ڈوب جائے تو یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ چڑیل نہیں، بالکل معصوم تھی۔ اور اگر نہ ڈوبے تو اس کا چڑیل ہونا مُسلّم۔ اس صورت میں اسے پانی سے نکالتے۔ گرم کپڑے پہناتے۔ اچھے اچھے کھانے کھلاتے اور پھر آگ میں زندہ جلا دیتے کہ چڑیل کی اس زمانے میں یہی سزا تھی۔ الزاموں کی نوعیت بدلتی رہی ہے، مگر زمانے کا طرزِ تعزیر آج بھی وہی ہے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

مسٹر اینڈرسن کچھ دن سے ہم پر مہربان تھے۔ ہم ان کے مشیر خاص تھے۔ مطلب یہ کہ ہر اہم مسئلہ پر وہ ہم سے مشورہ لیتے اور ہمیشہ اس کے خلاف عمل کر کے کامیاب ہوتے۔ دوسرے دن انہوں نے پھر تاکید اً کہا "۲۷ تاریخ نہ بھولنا۔ ایسی کاک ٹیل پارٹیوں کے دعوت نامے حاصل کرنا تمہارے فرائضِ منصبی میں داخل ہے۔ چوٹی کے انگریزوں سے میں خود تمہارا تعارف کراؤں گا"۔ ادھر کچھ عرصہ سے ہم خود محسوس کر رہے تھے کہ ہر چند ہماری تنخواہ میں ایک پیسے کا بھی اضافہ نہیں ہوا، لیکن جب سے ہم چیف اکاؤنٹنٹ' سیکرٹری اور انسپکٹر آف برانچز کے عہدوں پر بیک وقت فائز ہوئے ہیں ہماری "ایمج" میں ایک خوشگوار تبدیلی آگئی ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اسی تنخواہ میں ہم بہتر سگرٹ دو ٹکڑے کر کے پینے لگے تھے۔ ڈالڈا چھوڑ کر اب اصلی گھی کے نام پر دھوکا کھانا شروع کر دیا تھا۔ لباس اور اس کے لوازمات سے بھی نخوت جھلکتی تھی۔ یعنی ٹائی کی گرہ پتلی ہوتی تھی۔ اب ایسے موزے بھی نہیں پہنتے تھے جن میں ایسا سوراخ ہو جس میں سے گردن نکال کر انگوٹھا آزادی کا سانس لے سکے۔

جس محلے میں تھا ہمارا گھر

چار میں اگلے ہفتے مکان بھی تبدیل کر لیا۔ اس محلے میں ایک نہیں، کئی سوداگر رہتے تھے۔ علاقے کے POSH ہونے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہماری چھوٹی بٹیا ہمسائے کے بچوں کے بارے میں ہم سے پوچھنے لگی، بابا! یہ ہر روز عید کے کپڑے کیوں پہنے پھرتے ہیں؟ گڈو میاں نے ہمسائے کی دیواروں پر ساگوان کی PANELLING اپنی چھ سالہ زندگی میں پہلی بار دیکھی تو ہم سے کہا کہ انہوں نے دیواروں پر بھی فرنیچر لگا رکھا ہے! چند روز بعد دائیں ہاتھ والی پڑوسن نے بتایا کہ بائیں ہاتھ والی پڑوسن کہہ رہی تھی کہ ہم اپنے بچوں کو اس کے نئے قالین پر حوائج ضروری سے فارغ کروانے لے جاتے ہیں۔ ملاقات والاقات تو محض بہانہ ہے۔ "کوئی پوچھے، انھیں اس LOCALITY میں آنے کی مار پڑی تھی۔ ایرانی قالین دیکھے بغیر لاڈلوں کا پیشاب نہیں اُترتا"۔ ہمارے غسلخانے میں کائی لگے گھڑوں اور ٹنکی کے بجائے اب گرم اور ٹھنڈے پانی کا اہتمام تھا۔ یعنی واش بیسن کی ٹونٹی سے گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد پانی نکلتا تھا۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں کوئلے سے دانت نہیں مانجھتے تھے، بلکہ ٹیوب پر گود گود کر ٹوتھ پیسٹ کشید کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ ہر چیز سے افسری کی شان ٹپکنے لگی۔ بینک اکاؤنٹ سے بھی سرخی جھلکنے لگی۔

انھی دنوں اینڈرسن نے اپنا جی۔ ای۔ سی کا پرانا فریج از راہِ پرورش چار سو روپے میں ہمیں فروخت کر دیا۔ نیا ساڑھے سات سو میں آتا تھا۔ ہمارے ہاں مہینوں اس میں پپیتے لوکلیتے اور بینگن برفاتے رہے۔ پہلے دن تو ہم نے اس میں کوری صراحی بھی رکھی دیکھی تھی۔ تین چار دن استعمال کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا موڈ اینڈرسن کے مزاج کی طرح ہے۔ یعنی چار پانچ منٹ چل کر آگ بگولا ہو جاتا اور شور و غوغا کرنے لگتا۔ اسے ٹھنڈا رکھنے کے

لیے ہم نے اسی کمپنی کا بنا ہوا پنکھا سوا تین سو میں خریدا۔ نئے فریج کے مقابلے میں مجموعی سودا پھر بھی ۲۵ روپے سستا پڑا۔ اور انھی داموں ایک کے بجائے دو چیزیں ہاتھ لگ گئیں۔ پنکھا چوبیس گھنٹے فریج کے بلڈ پریشر کو بگڑنے سے باز رکھتا تھا۔ گرمی زیادہ پڑے تو ہم اپنی مصالحتی چارپائی پنکھے اور فریج کے درمیان ڈال لیتے تھے۔

پیرھن یوسفی

اب ہم اُجلے پوشی کا آٹھ آنے یومیہ تاوان ادا کر کے، پیر الٰہی بخش کالونی لانڈری سے اپنے کپڑے اس "ارجنٹ" بیدردی سے نہیں دُھلواتے اور پھڑواتے تھے کہ جو قمیص صبح دفتر جاتے وقت دے گئے وہ اسی شام شتابی پھٹو والی یا گھر پر "ڈیلیور" کر دی گئی۔ اس زمانے میں ہم اپنی میلی قمیص رات کو دھوبی کے پاس ہرگز نہیں رہنے دیتے تھے۔ اب ہم نے ۸ روپے سینکڑا پر تین قمیص دھونے کے لیے ایک نیا دھوبی لگا لیا۔ کپڑوں کی چوری بھی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ طبیعت میں اتنی احتیاط تھی کہ پہلے ہی دھوب میں دو قمیصوں کے کالروں کی دونوں نوکوں پر سامنے کی طرف دھوبی مارکہ لگا دیا تھا تاکہ ان نشانوں کو دیکھ کر احباب پہچان جائیں کہ قمیص کے نیچے ہم ہی ہیں۔ پچھلا دھوبی کالر پر تو استری اچھی نہیں کرتا تھا مگر موزوں اور انڈرویئر میں خوب کلف لگا تا تھا۔ بنیان میں کلف لگا کر سُکیڑنے کی شکایت ہم نے قصداً نہیں کی۔ اس لیے کہ ۳۲ انچ کا جو بنیان دُھلنے جاتا تھا وہ ۲۴ کا ہو آتا تھا۔ میانوالی کے اس دھوبی کی چوڑی چھاتی سے تنگ آ کر ہم نے خود ڈھونڈ ڈھانڈ کر یہ لکھنؤ کا دھوبی لگایا تھا کہ اس کے ناپ ہم سے ملتے تھے۔ لیکن ہم یہ دیکھ کر بھونچکے رہ گئے کہ بنیان پہلے ہی دھوب میں ۶۵ انچ کا ہوگیا۔ اور اس میں باسکٹ بال کی سی دو ٹوکریاں بھی بن گئیں۔ اگلی دُھلائی پر وہ ایک لنڈ چاند سا بنیان ہونے کی خوشی میں لایا۔ نومولود کا وزن ایک پنسیری بتایا تھا جس کی تصدیق ہماری بنیان سے بھی ہوئی تھی۔

باقی رہا دفتر، تو وہی کلرک جن کی ہم نے خوشامد کر کے کام سیکھا تھا، اب ہمیں پہلے تمیز سے "سر" کہتے پھر آنکھ مار کے ہماری جمع و تفریق کی غلطی نکالنے کی جسارت کرتے۔ جمعدار اجمل خاں اب ہمیں تم کہنے لگا۔ پہلے تُسی کہتا تھا۔ غرض کہ جیسا آپ نے ملاحظہ فرمایا ہماری قدر و قیمت اپنی نظروں میں کافی بڑھ چکی تھی۔ بعض لمحے ایسے بھی آنے لگے جب یوں محسوس ہوتا گویا ہم ہندو دیومالا کی وہ گائے ہیں جس کے سینگوں پر دنیا ٹھیری ہوئی ہے۔ جب وہ تھکن سے تھرتھری لے کر سینگ بدلتی ہے تو بھونچال آ جاتا ہے۔ کراچی کی بڑی بڑی دعوتوں میں بھی ہم مدعو ہونے لگے۔ بڑی دعوتوں سے ہماری مراد ایسی تقریبیں ہیں جن میں مہمانوں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہو اور جہاں مدعوئین کی فہرست ٹیلی فون ڈائریکٹری نقل کر کے مرتب کی جاتی ہے۔ ان میں ہمیں، مع میزبان کوئی نہیں پہچانتا تھا، سوائے تمبو قناتوں والے نظام دین کے آدمیوں کے جن سے روز روز کی ملاقات کے سبب خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔

کاک ٹیل کے آداب

خدا اور اس کے بندے ماریں یا چھوڑیں، جھوٹ نہیں بولیں گے۔ جب اینڈرسن سے یہ سنا کہ یہاں شراب پینا فرائض منصبی میں داخل ہے تو ایک دفعہ تو عجب روحانی انشراح محسوس ہوا۔ دھیرے دھیرے پارٹی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ابھی دو ہفتے پڑے تھے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے (گولڈ میڈلسٹ) سے کاک ٹیل پارٹی کے آداب بے خودی کے بارے میں استصواب کیا تو انھوں نے کم و بیش وہی معلومات فراہم کیں جو شیخ سعدی کے زمانے میں بھی دستیاب تھیں۔ مثلاً یہ کہ شراب، شباب اور دولت...... انھیں پا کر جو مست نہ ہو، وہی مرد ہے۔ عرض کیا، جن بیچاروں کو یہ نعمتیں میسر نہ ہوں ان کے مرد ہونے کا بھی کوئی چانس ہے کہ نہیں؟ بولے،

کیوں نہیں، مرد باید کہ ہراساں نہ شود، ہراساں پر عرفی کا ایک شعر سنو۔
جو شعر انھوں نے سنایا اس کا عرفی سے ہی نہیں، ہراساں ہونے سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ شعر کا سُرور بڑھا اور زبان کھلی تو فرمایا کہ غالب نے مے کے مقابلے میں شہد کو مکس کی قے کہا ہے۔ شعر اور شراب دونوں ہی دافع حجاب ہیں۔ اور یہ نہ بھولو کہ تمھارے پیشے میں حجاب حرام ہے۔ کبھی تم نے غور کیا، شراب کو "ڈرنکس" کہا جائے تو کم حرام معلوم ہوتی ہے! اور ہاں! جب نظریں نظروں سے اور شرابیں شرابوں سے ملیں تو کاک ٹیل ہر جائی کے پیار کی مانند تند و تیز ہو جاتی ہے۔
"کیا لوگ شرابوں کا بھی "دین الہٰی" بناتے ہیں؟" ہم نے ان کے ہیرو اکبر اعظم پر چوٹ کی۔
"اسی کو تو کاک ٹیل کہتے ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں آیا ہے کہ......"
ان کی علمی اُڑان بڑھتی چلی گئی تو ہم نے "بیلی لینڈنگ" کراتے ہوئے پوچھا "پروفیسر! کاک ٹیل پارٹی میں گلاس کون سے ہاتھ میں پکڑتے ہیں؟" بولے "آف کورس اداہنے ہاتھ میں"۔ پوچھا "پھر مصافحہ کون سے ہاتھ سے کریں گے؟" ذرا دیر کو سوچ میں پڑ گئے۔ پھر فرمایا "اگر دوسرے نے بھی گلاس داہنے ہاتھ میں تھام رکھا ہو تو پھر بائیں ہاتھ ہی سے مصافحہ واجب ہے"۔
مرزا عبدالودود بیگ سے صلاح کی تو اس ابتدائی اعلان کے بعد کہ کاک ٹیل پارٹی ملک کی مضبوط ترین پارٹی ہے، فرمایا "دو پریکٹیکل ٹپ دیتا ہوں۔ اوّل یہ کہ یہ شے کڑوی ہوتی ہے۔ منہ نہیں بگاڑنا چاہیے۔ تمھارا تو سارا بچپن جوشاندے، کونین مکسچر، کیسٹر آئل، ٹنکچر آیوڈین اور چکرورتی کی ارتھمیٹک سے ہی شغل کرتے گزرا ہے۔ پھر کیا ڈرنا؟ ہائے! کیا خوب کہا ہے ظالم نے:-

جو پینے والے ہیں وہ پی کے منہ بناتے ہیں
جناب شیخ جو ہیں منہ بنا کے پیتے ہیں

پوچھا "اور اگر ہم بالکل نہ پئیں تو کس وقت منہ بنانا مناسب و مباح ہوگا"۔
"مگر یہ تو حضور والا کے چہرے کا نارمل ایکسپریشن ہے! خیر۔ دوسرا ٹپ میں نے رسالہ MEN ONLY میں دیکھا تھا۔ لکھا تھا کہ کاک ٹیل پارٹی میں کوئی بھی بیٹھ کر شراب نہیں پی سکتا۔ مکروہ ہو جاتی ہے"۔
پوچھا "کیوں؟"
پہلے تو چکرائے۔ پھر سنبھل کر بولے "ہاں! کاک ٹیل میں سب کھڑے ہو کر پیتے ہیں۔ تاکہ جب گر پڑیں تو اندازہ ہو جائے کہ اب اعتدال لازم ہے"۔

سیاہ چاول، رم اور مغرور گردن والی

جیسے جیسے ۲۷ تاریخ نزدیک آتی گئی، ہماری گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔ راہ راست سے بھٹکانے والا کوئی رہبر نہ ملا کہ ہماری دوڑ پاک بوہیمین کافی ہاؤس تک تھی۔ بالآخر نوابزادہ غفران اللہ خاں سے رجوع کیا جو کراچی کے ہر کلب کے ممبر تھے اور جن کے بغیر شہر کی کوئی کاک ٹیل پارٹی مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ہر فقرے پر خواہ اپنا ہو یا پرایا، بے ساختہ قہقہے لگانے کے سبب THE LAUGHIHG CAVALIER کہلاتے تھے۔ صورت بھی ہال کی اسی نام کی شہرہ آفاق پینٹنگ سے ملتی تھی۔ اینڈرسن کے ہم پیالہ تھے۔ ہم پر شفقت فرماتے تھے۔ باتوں میں وہ رَس اور رچاؤ جو علیم مجلس، چٹکی جھٹکائی جیسی آسودگی جیسے ٹھاٹ اور پندرہ ہزار ایکڑ اراضی

سے پیدا ہوتا ہے۔ شہر سے باہر اُن کا بہت بڑا باغ تھا جس میں بوگن ولیا کی سو سے زیادہ قسمیں تھیں۔ ویسے بڑے با اُصول، انسان دوست اور جفاکش آدمی تھے۔ نانِ حلال اور آبِ حرام پر گزارہ تھا۔ بڑے لطف و مرحمت سے پیش آئے۔ جاپان سے منگائے ہوئے گلابوں کے تختوں کی سیر کروائی۔ وہ قطعہ بھی دکھایا جس پر انہوں نے سیاہ چاول کاشت کیے تھے۔ ہم نے پوچھا، یہ کوئی افریقی ورائٹی ہے؟ بولے، نہیں۔ جنوبی امریکہ گیا تھا تو دو چار مٹھی بیج اُوور کوٹ میں چھپا کر لے آیا۔ لندن سے HYDRANGEA پھول کے بلب بھی اسی طرح اسمگل کیے تھے۔ مشی گن میں بھی جنگلی چاول ہوتا ہے، مگر وہ بات کہاں۔ اس سال بیس سیر چاول نکلے۔ سات ہزار لاگت آئی۔ جاتے وقت ۲/۱ پونڈ سوغات لے جانا بھولنا۔ ہم نے پوچھا، انھیں کھاتے کیسے ہیں؟ فرمایا، سیاہ چاول تو مغرور گردن والی میلرڈ (مرغابی) اور گلابی زم کے ساتھ مزہ دیتے ہیں۔ دسمبر میں یاد دلانا۔ ان کا بھی بندوبست کردوں گا۔ سکندر مرزا بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ عرض کیا، حاجت روائی ہی مقصود ہے تو اب کی مہاوٹ حضور صرف مغرور گردن والی کا بندوبست فرما دیں۔ اور نسخہ کے بقیہ مقویات کسی اور حقدار کو پہنچا دیں۔ کہنے لگے، پہنچانے کی بھی ایک ہی کہی۔ تمھارا خیال ہے کہ چوہے دان خود چل کر چوہے کے پاس جاتا ہے؟ ہاں! تحلیلِ غذا کے لیے تمھیں آدھ گھنٹے ڈارو تھی (ان کی سیکرٹری) کے ساتھ ڈانس کرواؤں گا۔ اُگتے تیرے بھاگ بچے۔ اسی کی RECIPE سے ایک نئی ڈش بھی کھلاؤں گا جو فرانس میں انگور کی بیل کی سوکھی ڈنڈیوں کی ہلکی آنچ پر پکائی جاتی ہے۔ اس پر شیری کا چھینٹا دیتے ہیں۔

بعد ازاں اپنی زمیں دوز بار میں لے گئے۔ چار پانچ بٹن دبائے تو رنگ برنگی روشنیوں سے ان کے چہرے پر وہ دلآویز نرمی اور شادابی نظر آنے لگی جو دھیمے چنچل رنگوں میں ہوتی ہے۔ ایک کونے میں نیگرو عورت کا لائف سائز برہنہ مجسمہ رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شب تاب تسبیح تھی اور دوسرے میں انسانی کھوپڑی کا پیالہ۔ عورت کا جوڑا اٹھا کر دو پیگ ڈال دیں تو دوسری طرف غذائی غددوں سے وہسکی رسنے لگتی۔ ایک ممتا بھرا نپل پر لپ اسٹک کا تازہ نشان اور دوسری سے سگار کی مہک آرہی تھی۔ گلے میں ایک ہب بندھا تھا جس پر مردانگی و شجاعت کے دیوتا ہرکولیز کی تصویر کڑھی تھی۔ بائیں جانب طاقچے میں گوتھک طرز کی ایک خانقاہ بنی ہوئی تھی اور اس کے اُدھ نہیں، بلکہ محض اس غرض سے نقل کر رہے ہیں کہ یہ اس داستان کے مرکزی کردار اینڈرسن کا فلسفۂ حیات تھا جس کی وہ تلقین کرتے رہتے تھے۔ یہ تھا وہ یونانی فلسفہ جو اسکاٹ لینڈ کی شراب کی بھٹیوں سے گزر کر ہم تک پہنچا تھا۔

Hermit hoar, in solemn cell,
Wearing out life's evening gray:
Smite thy bosom, Sage, and tell
What is bliss, and which the way?

Thus I Spoke: and speaking sigh'd:
Scarce repress'd the strating tear,
When the hoary Sage reply'd

Come, my lad, and drink some beer!

انھوں نے اپنا "ڈیپ فریز" بھی دکھایا، جس میں انواع واقسام کی شرابیں نہ جانے کب سے برف میں لگی منتظر تھیں کہ کوئی تشنہ کام ان سے جگر کی آگ بجھائے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، ڈیپ فریزر کی لمبائی چوڑائی ہمارے کمرے کے برابر ہوگی جو گرمیوں میں ایسا تنور ہو جاتا تھا کہ کبھی کبھی ہم بھی صراحی سے گال لگا کر آنکھیں بند کر لیتے یہاں تک کہ وہ جل اٹھتی۔ کہنے لگے کہ میں اُن نو دولتیوں کی طرح نہیں ہوں جو ہر تیسرے مہینے یورپ جاتے ہیں اور سارا زرمبادلہ بچی کھچی جوانی نئی کاروں اور سیکنڈ ہینڈ کال گرلز پر خرچ کر دیتے ہیں۔ میں تو ہر ملک کی نایاب WINES کے سوا، کوئی چیز لانا حرام اور خنزیر کے برابر سمجھتا ہوں۔ یہ ڈیپ فریز لانے کا گنہگار ضرور ہوں۔ سو وہ بھی انھی کو قرینے سے رکھنے کے لیے۔

ہم سا کہیں جسے

ایسی خوب صورت، شیک شیک بوتلیں، بلوری صراحیاں، رنگا رنگ، کنٹر، شیشے اور بویام ہم نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ تین چار سو سے کم نہ ہوں گے۔ ہماری نگاہوں کو ان پر آوارہ ہوتے دیکھ کر کہنے لگے کہ ان میں سے چار پانچ پسند کر لو۔ خالی ہوتے ہی گھر بھجوا دوں گا۔ ایک میں منی پلانٹ لگا کر نیک شگون کے لیے برآمدے میں لٹکا دینا۔ دوسری کا ٹیبل لیمپ بنوا کر، اس کی مدھم روشنی میں معاشیات کی کتابیں پڑھتے رہنا۔ ہم نے کہا پیرومرشد! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ نشہ نشہ ہوتا ہے۔ دیس دیس کے لیبل سے کیا فرق پڑتا ہے؟ قہقہے کے بعد ارشاد ہوا، برخوردار! گھونسے، چٹکی، چھری، گنڈاسے اور بندوق کی چوٹ ایک جیسی نہیں ہوا کرتی۔ ہر ملک کے پھول، ہر دیس کی ناری کی بُو باس جدا ہوتی ہے، وسکی بہت حساس، بڑی تنک مزاج ہوتی ہے۔ سندھ کلب میں کبھی کسی نمازی بیرے کا ہاتھ لگ جائے تو بخدا سارا پیگ غارت ہو جاتا ہے! نشہ بڑی نازک شے ہے۔ یہ نازک سا فرق تمھاری سمجھ میں آگیا ہوتا تو آج تمھارے شانے شمپین بوتل کی طرح ڈھلکے ہوئے نہ ہوتے۔ پھر اس نازک سے فرق کو ذہن نشین کرانے کے لیے انھوں نے ہمیں شمپین کی بوتل نکال کر دکھائی۔ ہمیں اس بیچاری پر بڑا ترس آیا۔

شراب، پھولوں اور کتوں کا کولمبس

پوچھا "اس کنٹر میں کیا ہے؟" بولے "روسی ووڈکا۔ ایک گھونٹ لیتے ہی آدمی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے کہ کس نے گھونسا مارا۔ ایک ہی چلّو میں اُلّو!" پوچھا "اور اس عطردان میں کیا بھرا ہے؟" فرمایا "پگھلا ہوا زمرد۔ فرانس کی سبز کانیاک۔ ڈنر کے بعد کی چیز ہے۔ اس کے برابر آبِ حیات رکھا ہے...... چیکوسلواکیہ کی سونف کی وائن" دریافت کیا "اور اس بلوریں مٹکے میں؟" بولے "یہ ایک افریقی وائن ہے۔ مردوں کا ڈرنک سچ پوچھو تو بس یہی ہے۔ ایک چسکی لیتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ، بقول شخصے، گلے سے مشعل بردار مظاہرین کا جلوس گزر رہا ہے"۔ سوال کیا "اور یہ بیل کو سانی کھلانے کی ناند میں کیا پڑا چھلک رہا ہے؟ اور اس میں ڈونگا کیوں ڈال رکھا ہے؟" ارشاد فرمایا "اوہ! یہ پنچ ہے۔ ایک دوست کے ہاں ہاؤس وارمنگ پارٹی ہے۔ اسے بھیجنی ہے۔ اسی طرح ناند میں بھر کر لان پر رکھ دی جاتی ہے"۔ عرض کیا یہ تو غالب کے زمانے میں بھی ہوتا تھا۔

"صحنِ چمن میں رکھ دیں مئے مشکبو کی ناند
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

فرمایا" چار مصرعوں کی رُباعی کو تو ہندی میں چوپائی کہتے ہیں۔ آپ نے تو صحنِ چمن میں تپائی رکھ دی۔ میرے والد کی عادت تھی کہ کبھی کوئی بُری خبر سنتے ، یا کھڑی فصل کو پالا مار جاتا، یا خاندان میں غمی ہو جاتی تو شعر پڑھا کرتے تھے۔ آپ تو خوش ہوتے ہیں تب بھی شعر پڑھتے ہیں!" پھر پوچھا" اور یہ کیا بلا ہے جو رنگت اور بُو سے مست فجر کا قارُورہ معلوم ہوتا ہے؟" کہنے لگے" لاحول ولا قوۃ! یہ تو دُنیا کی بہترین بیئر میونخ بیئر ہے۔ نازی انقلاب کی بنیاد بیئر خانوں ہی میں رکھی گئی تھی"۔

اُردو زبان کی تہی دامنی کا گلہ کرتے ہوئے فرمایا کہ" ہمارے ہاں ہر تیز پانی کے لیے صرف ایک گالی ہے ...... شراب! اسی طرح مٹنے کی اردو میں لے دے کر دو قسمیں ہیں : دوسری کو برادر خورد کہتے ہیں۔ اور آپ کو حیرت ہو گی، فارسی میں تو گلاب تک کے لیے کوئی علیحدہ لفظ نہیں۔ دیکھا جائے تو انگریز نے ہمیں ...... پورے برصغیر کو ...... کتوں، پھولوں اور شراب کی مختلف اقسام اور نفاستوں سے روشناس کیا"۔

ہم نے گرہ لگائی۔" ورنہ یہاں کیا دھرا تھا۔

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا"

فرمایا" آپ غلط پڑھ رہے ہیں۔ مویشی چرانے پہ عرب میں جھگڑا ہوتا ہے۔ اپنے ہاں چرانے پہ ہوتا ہے"۔

کاک ٹیل گائیڈ

لیجیے، دو ڈھائی گھنٹے کے سوال و جواب سے مکمل" رہنمائے کاک ٹیل پارٹی" ...... پہلے پیگ سے صبح کے HANG-OVER (خمار) تک ...... تالیف ہو گئی۔

خلاصۂ خرافات و خمریات نو آموزوں کی عاقبت سنوارنے کے لیے حاضر ہے:

۱۔ پہلا اصول تو انھوں نے یہ بتایا کہ جب تک کوئی مشترک شناسا تعارف نہ کرائے، کسی سے بات نہ کرو۔ انگریز تو جب تک باقاعدہ انٹروڈکشن نہ ہو، کسی کی گالی کا بھی جواب نہیں دیتا۔

۲۔ ایک ہی جگہ اتنی زیادہ دیر جم کر کھڑے نہ ہو کہ جملہ پورا ہو جائے۔ سرکولیٹ (گردش) کرتے رہو۔

۳۔ جو تم سے رتبہ میں چھوٹا یا بے فیض ہو، یا آگے چل کر کام نہ آ سکے، اس کی صحبت سے گریز کرو۔ لیکن جو تمھارا نوٹس نہ لے، تم بھی اُس کا نوٹس نہ لو۔

۴۔ سنجیدہ گفتگو سے پرہیز کرو۔ ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ تم ابھی سے TIPSY (بہکے بہکے) ہو گئے ہو۔

۵۔ اگر تمھارے گلاس میں صرف پانی ہو تو کسی سے یہ ہرگز نہ کہو کہ شرعی ممانعت کے سبب نہیں پی رہے ہو یا PRACTICING MUSLIM ہو۔ خونی پیچش کا بہانہ بنا دو۔

۶۔ اگر مذکورہ بالا الا بلا یعنی سافٹ ڈرنک پی رہے ہو، تب بھی لیڈیز سے بہکی بہکی باتیں کرو۔ کاک ٹیل کا سب سے بڑا

مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔
مشتاق احمد یوسفی

فائدہ یہ ہے کہ مردوں کو بدتمیزی کرنے کا ایک معقول بہانہ مل جاتا ہے۔ عورت اگر خوب صورت ہے تو فلرٹیشن اس کا حق ہے، اور اگر بدصورت ہے تو اس کے ساتھ حتی الامکان فلرٹ کرنا آدمی کا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے۔ تم بہت کم سخن، کم آمیز ہو۔ بند بند سے رہتے ہو۔ میں نے آج ہی کی پارٹی میں دیکھا کہ خواتین سے تعارف کے وقت، تم اپنی نظر، نیت اور نیک ٹائی ہی درست کرتے رہ گئے۔

کیا زنانے میں پہنچنے کی یہی باتیں ہیں؟

بچہ! ایسے مَے تو پلک جھپکانا بھی رُوپ کا اپمان ہے۔

۷۔ کاک ٹیل پارٹی میں ہر ایک سے اعتماد کے ساتھ، جم کے بات کرو۔ دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلکہ نکال کے۔ وہسکی کے ہر گھونٹ کے بعد اپنی بات کا وزن بڑھتا ہوا صاف محسوس ہوتا ہے۔ عرض کیا، پیرومرشد! یہ کیفیت تو "لبریم" کی گولی سے بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔ فرمایا، بڑا فرق ہے۔ استاد ذوق نے کیا خوب کہا ہے۔ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے:

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارُو ہے جس سے ذوق
نامرد مردُ، مرد جواں مردُ ہوگیا

لبریم کے بعد بلی کو چوہوں کی حاجت نہیں رہتی۔ پھر اسے خواب میں چھچھڑے نظر نہیں آتے، بلے نظر آتے ہیں۔ لیکن شراب پی کر چوہے کی مونچھیں اتنی اکڑ جاتی ہے کہ اپنے بل میں داخل نہیں ہوسکتا۔ پھر وہ بلی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے کہ کدھر گئی وہ مُردار؟

۸۔ جب ہر بات FUNNY اور ہر چہرہ حسین دکھائی دینے لگے تو فوراً کوئی ترش چیز کھالو۔ یہ دستیاب نہ ہو تو اپنی بیوی کی تصویر بٹوے سے نکال کر ایک نظر دیکھ لو۔

۹۔ ڈھیلے کالر کی قمیص پہن کر جاؤ۔ نشہ میں کوئی گر پڑے تو بھول کر بھی اس کی نیند میں مخل نہ ہو۔ انگلینڈ میں اس صدی کے اوائل میں، جسے ایڈورڈین دور کہا جاتا ہے، اونچے کلبوں میں چھوٹے چھوٹے چھوکرے صرف اس کام پر تعینات ہوتے تھے کہ جیسے ہی معزز ممبر کرسی سے لڑھک کر گرے، وہ میز کے نیچے گھس کر کالر ڈھیلا کردیں تاکہ دم گھٹنے سے کلب میں موت واقع نہ ہو۔

۱۰۔ واپسی میں اپنا سارا وزن کار کے بریک پر ڈالے رکھو۔ بجلی کے کھمبے سے کار روکنے سے گریز کرو۔ کھمبے گر جائیں تو کتوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔

۱۱۔ نشہ گہرا ہو جائے تو طبیعت سچ بولنے پر بے تحاشا مائل ہوتی ہے۔ لہٰذا گھر پہنچ کر بیوی سے بات چیت کرنے سے پرہیز کرو۔

۱۲۔ صبح آنکھ کھلتے ہی محسوس ہونے لگے کہ معاشرے میں اندھیر مچا ہوا ہے اور حکومت اپنی پالیسی سے قوم کو تباہی کے غار میں دھکیل رہی ہے تو ایک اسپرین کھالو۔ دس منٹ کے اندر اندر حکومت کی پالیسی میں افاقہ محسوس ہوگا۔

رُونٹھی دھرتی

انھوں نے موسم کی ترکاریاں اور پھل ہمارے ساتھ کیے۔ اور جیپ میں بٹھا کر اپنے باغ اور فارم کی سیر کرائی۔ کہنے لگے، دس گھنٹے روزانہ کام کرتا ہوں۔ میرا باپ زمیندار تھا۔ مجھے بھی کھیتی باڑی سے لگاؤ ہے۔ اکثر ہوتا ہے کہ پارٹی سے رات کو ڈھائی تین بجے لوٹتا ہوں۔ مگر صبح ساڑھے چار بجے اپنے وقت پر اُٹھ جاتا ہوں۔ گنہگار ہوں۔ (وہ

آبدیدہ ہوگئے) فجر کے بعد دو گھنٹے کھیتوں میں ضرور گزارتا ہوں۔ عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ پو پھٹنے سے پہلے ہر تیسرے منٹ مطلع اور منظر کا موڈ آنکھوں کے سامنے بدلتا نظر آتا ہے۔ اُجالے کی ہر لہر کے ساتھ چڑیوں کی چہکار کی لے بھی بدلتی جاتی ہے۔ پھر ایک ایک پھول سے باتیں ہوتی ہیں۔ سب سے اپنی یاری ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی پھول ڈالی سے نہیں توڑا۔ گیہوں کی سنہری بالیں دیکھتے ہی جھومنے لگتی ہیں۔ کبھی کوئی بوٹا اُداس یا بیمار دکھائی دے تو دن بھر خلش سی رہتی ہے۔ زندگی کو سمجھنا چاہو تو کوئی درخت، کوئی پودا، کوئی پھول...... ایک ہی سہی...... گھاس ہی کیوں نہ ہو...... لگا کر دیکھو تو سہی۔ زمین کسان سے، اپنے چاہنے والے سے، بار بار بے وفائی کرتی ہے۔ وہ پھر اس پہ اعتبار کرتا ہے۔ دھوکے پہ دھوکا کھاتا ہے۔ پھر بھی پیار کیے چلا جاتا ہے۔ اور جب وہ پیار کے لائق نہیں رہتا تو گاؤں چھوڑ دیتا ہے۔ شہر آکر اپنا تھکا ہارا بنجر کسی بل کے سپرد کردیتا ہے۔ شہر میں پھر اسے جیتے جیتے زمین اپنی صورت نہیں دکھاتی۔ دری، چٹائی، سنگِ مرمر، سیمنٹ، ٹائلز کے فرش اور تارکول تلے اپنا منہ چھپائے رہتی ہے۔

بائل سے دینے والے ایسے آسماں نہیں ہم

ایک دوست نے اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ دی جس کا ''سائی لینسر'' پھٹا ہوا تھا۔ اس کے ۱۰۱ دھماکوں سے اپنی سلامی آپ دیتے اور لیتے ہوئے ہم پارٹی میں پہنچے تو آٹھ بج رہے تھے۔ اس وقت کاک ٹیل پارٹی اپنے شباب پر تھی۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس کے نصف حصے میں تو شباب بھی شباب پر تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ رنگ پہ آنے کے بعد کاک ٹیل میں اتنی تاخیر سے شریک ہونا ایسا ہی ہے جیسے تیز چلتے ہوئے MERRY-GO-ROUND (پھرکی کی طرح گھومتے والا جھولا) میں بیٹھنے کی کوشش کرنا۔ لان پر بڑے جگ چکے تھے۔ درختوں اور جھاڑیوں میں اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے قمقمے انھی رنگوں کے پیرہنوں کو آنکھ مار رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ بیشتر مہمان نہ صرف آچکے ہیں بلکہ بعضے تو اس قابل بھی نہیں رہے کہ واپس جاسکیں۔ بات بے بات ہنسی کہ اُن ہوئے کو پیار آئے۔ آنکھیں گلابی، پنڈے گرم، چہرے گلنار۔

دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

لان کے پرلے کنارے پر بیرے مغل بادشاہوں کی یونیفارم، مع راجپوتی پگڑی، پہنے ڈرنکس بنا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بیرا نظر بچا کر چیکوسلواکیہ کے بنے ہوئے گلاسوں کو منہ کی بھاپ سے نم کرکے پیمانہ تابدار کو اور بھی تابدار کردیتا تھا۔ کافی مہمان ایسے تھے جو کسی کاک ٹیل سے آرہے تھے یا کسی اور کاک ٹیل میں جانے والے تھے۔ ہم اُصول نمبر ۳ پر سختی سے کاربند تھے کہ جو شخص اپنے سے کم مرتبہ نظر آئے یا آگے چل کر کام نہ آسکے، اس کا نوٹس نہ لو۔ کچھ دیر بعد یکا یک منکشف ہوا کہ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ کوئی ہمارا نوٹس نہیں لے رہا ہے! چاروں طرف نظر دوڑائی، ہمیں کوئی اپنے سے کم حیثیت نظر نہ آیا، سُن ہوگئے۔ اب جو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بڑے لوگ ہمیں ''اِگنور'' کرنے کی انتھک کوشش کررہے ہیں۔ کنارہ کش ہوتے ہوتے ہم نے خود کو ایک کونے میں چینی نارنگی کی جھاڑی کے پاس ایستادہ کرلیا۔ اور نمکین بادام اور خلال کے تنکوں میں اٹکی ہوئی مرغی کی کلیجی سے شغل کرنے لگے۔

ترک مے

اس سے پہلے ہم کسی کاک ٹیل میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ سُنا ہی سُنا تھا۔ چنانچہ بے حد سراسیمہ، دمشش‌در۔ ایک INHIBITION ہو تو بیان کریں۔ ہمارے ساتھ کے اکثر لوگ بھی کے گھس گھسا کر نٹری کی چکنی بیٹا

ہو گئے تھے۔ لیکن ہم ہنوز اس درجہ دقیانوسی اور ناتراشیدہ تھے کہ ڈرنکس کا ترجمہ شراب اور غم غلط کرنے والوں کو شرابی کہتے تھے۔ انھی ایام حیرت کی بات ہے، ہم نے مرزا سے کہا کہ شراب اسلام میں حرام ہے۔ پھر کیا وجہ کہ جتنا ذکر، جتنے قصیدے شراب کے اُردو اور فارسی شاعری میں ہیں، اتنے دنیا کی تمام زبانوں کو ملا کر نہیں نکلیں گے!

فرمایا "چودہ سو سال سے طاقِ عصیاں پہ رکھے رکھے، اس کا نشہ صدی بہ صدی تیز تر ہوتا چلا گیا"۔

بعدازاں تشریح فرمائی کہ مغل بادشاہوں نے کبھی اس گناہ کو تعزیری جرم قرار نہیں دیا۔ اگر ایسا کرتے تو بیشتر تاجداروں کی زندگی زنداں میں کٹتی تخت پر کون بیٹھتا؟ فیض کے اسباب..... پُل' چاہ' مسجد اور بھینسوں کے غسل خانے یعنی تالاب کون بنواتا؟ لیکن مستثنیات کہاں نہیں۔ جناب محمد باقر شمس، مصنف تاریخ لکھنؤ، مرزا یحییٰ آصف الدولہ وزیر الممالک رستم جنگ کے پاس شریعت اور دینداری کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ "دیندار بھی بہت تھے، پہلے شراب پیتے تھے۔ غفران مآب کے موعظے سے متاثر ہو کر توبہ کی اور بھنگ پینا شروع کی۔ انہوں نے بھنگ کی حرمت بھی بیان کی اور اس کو بھی ترک کر کے افیون پر اکتفا کر لی"۔

ہم تاریخ داں تو نہیں، لیکن ہماری چھٹی حس کہتی ہے کہ مرزا یحییٰ آصف الدولہ نے اس مرحلہ پر غفران مآب کی صحبت کو بھی ترک کر دیا ہوگا۔

للی پٹ کے دیو

سوا آٹھ بجے ہمارے پیرِ مغاں ہنستے کھلکھلاتے وارد ہوئے اور ہماری جان میں جان آئی۔ انھوں نے خواتین وحضرات سے ہمارا تعارف کرانا شروع کیا۔ اور ہم نے "سرکولیٹ" کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر مرتبہ کھوٹے سکے کی طرح واپس کر دیے گئے۔ ایک صاحب نے تو ہم سے صرف دو انگلیوں سے مصافحہ کیا۔ سَو سوا سَو مردانِ خوش اوقات کی اس محفل میں ہمیں ایک بھی ایسا نظر نہ آیا جس کی آمدنی ہم سے کم ہو۔ جدھر نگاہ اٹھائی، جہاں گئے، وہی ایک منظر..... مایا کو مایا اور روپ کو روپیہ ملے کر کر لمبے ہاتھ۔ اس لنکا میں سبھی باون گزے تھے۔ اور یہاں یہ حال کہ نہ فضیلت، نہ عزت نہ فرمانروائی، ہر دیو سے ہاتھ ملانے کے بعد ہم نے اپنا قد ایک انچ کم ہوتا محسوس کیا۔ ساڑھے آٹھ بجے تک ہم لان پر رینگنے لگے۔

ہم نے مرشد سے جا کر پوچھا حضرت! آپ نے تو ہدایت فرمائی تھی کہ خلوئے معدہ وِسکی نہیں پینی چاہیے۔ آپ نے دو پیگ ہماری آنکھوں کے سامنے نوش فرمائے اور مرغ کی کلیجی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ فرمایا تمھاری نظر ٹھیک کام کر رہی ہے۔ ہاتھ نہ لگانے کی وجہ یہ کہ انگریزوں کے بیرے مرغی ذبح کرتے وقت ٹھیک سے کلمہ نہیں پڑھتے۔ ایسا گوشت مکروہ ہوتا ہے۔ ممانعت آئی ہے۔

پیگے بعد دیگرے ٹماٹر جوس کے چار گلاسوں کے بعد ہماری زندگی کا واحد نصب العین یہ رہ گیا کہ، بلاصنبت غیرے، ٹائلٹ کا نزدیک ترین راستہ دریافت کر لیں۔ (کاک ٹیل میں بیروں، بوڑھوں اور اپنی بیوی سے بات کرنے سے ہمیں سختی سے منع کر دیا گیا تھا) اتنے میں ایک قنات کے پیچھے سے ایک بوڑھے انگریز کو ایک ہاتھ سے اپنا سر اور دوسرے سے پتلون تھامے آتے دیکھا تو جن تاریک راہوں سے وہ نکلا تھا، اسی طرف ہم ایسے ہولے ہولے قدموں سے روانہ ہوئے کہ پیٹ کا پانی نہ ہلنے پائے۔ جان نکلی جا رہی تھی، خیر اس کا تو غم نہیں۔ خدشہ تھا جان نکلنے سے پہلے کچھ اور نہ نکل جائے۔ پچاس ساٹھ محتاط قدموں کے بعد، گویا مینا خانہ بار دوش ہے،

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رزیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

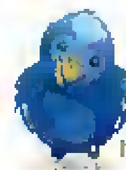
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan


Like us on Facebook

fb.com/paksociety


twitter.com/paksociety1

ہم نے اپنی منزل مقصود کو جالیا۔ باوردی بیروں کی قطار ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے رنگین تولیے لیے کھڑی تھی۔ ایک نستعلیق سے بارلیش بیرے نے بڑھ کر پوچھا:۔
"حضور کیے فرمائیں گے یا چھوٹا حاجت؟"

نیوٹن جونیئر

راستے میں میکفرن مل گیا۔ کہنے لگا کیا بات ہے؟ ابھی ابھی کچھوے کی طرح گئے اور الائیڈ ز بینک کے گھوڑے کی طرح سدکڑے لگاتے واپس آئے! تم اتنی دیر تک بجلی کے کھمبے کی طرح تن تنہا کھڑے رہے۔ زندگی بہت مختصر ہے۔ آؤ تمہیں ایک امریکن شعلہ بدن سے ملواؤں۔ ڈپلومیٹک کور کی پارٹیوں کی جان ہے۔ پاک امریکی دوستی کی حامی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی خیر سگالی کا مظاہرہ گھر پر ڈھیلی گرہ کا لاچا باندھ کر کرتی ہے۔ ذرا دیر باتیں سنو گے تو گرویدہ ہو جاؤ گے۔ کس طرح کی لذت ہے تو چکھ دیکھ مرے یار!

میکفرن بڑی خوبیوں کا آدمی تھا۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ کہ اس بھری محفل میں وہ تنہا یوروپین تھا جس سے ہماری شناسائی ہی نہیں، بے تکلفی بھی تھی۔ دوسری خوبی یہ کہ وہ کسی کو اداس نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہنس مکھ، بذلہ سنج، حاضر جواب۔ ان دنوں اس نے نیوٹن کی کشش ثقل کی تھیوری میں ایک انقلاب آفریں ترمیم کی تھی۔ معاشیات اور کم لباسی پر ان کے فرمودات محفل کو گھنٹوں گرم رکھنے کے لیے کافی تھے۔ ان کی تھیوری یہ تھی کہ ۱۹۵۲ء کے بعد سے زمین کی کشش ہر چیز کو نیچے کھینچتی ہے، سوائے قیمتوں، پاکستانی بیوروکریٹ کے سر اور ماڈرن BRA کے مشمولات کے جو بی زمانہ صرف آسمان کی کشش کے تابع ہیں۔ اس فلکیاتی دریافت کی بنا پر یہ کلب میں نیوٹن جونیئر کہلاتے تھے۔ ہمیں اداس اور بے آسرا جان کر عزیز رکھتے اور اکثر اپنی چلبلی گفتگو سے ہماری سوئی ہوئی بلکہ خراٹے لیتی ہوئی امنگوں کو بیدار کرتے۔ اس وقت ہمیں للچانے لگے کہ اسے ایک نظر دیکھو گے تو دل ہی نہیں، تمہاری گھڑی کی دھڑکن بھی تیز ہو جائے گی۔

بے وقوف

دو بے وقوفوں کو ٹرانسفارمر لگانے کی غرض سے کھمبے کی اونچائی معلوم کرنے کیلئے بھیجا گیا۔ کافی دیر تک وہ اسے اُچھل اُچھل کر ناپنے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکامی ہوئی۔ اس دوران ایک شخص کا وہاں سے گزر ہوا، یہ سب دیکھ کر اس نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دھات کا بنا ہوا ہے اس کو زمین سے کھود کر لٹا لو اس طرح لمبائی ماپنے میں آسانی رہیگی"۔ اس شخص کے جانے کے بعد دونوں بے وقوف قہقہے لگانے لگے۔ پھر ایک نے کہا۔ "دنیا میں کیسے کیسے بے وقوف پڑے ہیں..... اس گھامڑ کو اتنی عقل بھی نہیں ہے کہ ہم کھمبے کی اونچائی معلوم کرنے آئے ہیں لمبائی نہیں۔

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

نیوٹن جونیئر نے اس لذت چشیدہ کے بارے میں جو معلومات اپنا منہ ہمارے کان سے لگا کر فراہم کیں، ہم نے اس لذیذہ کو ان سے کچھ زیادہ ہی پایا۔ مردوں میں شتر بے مہار پھر رہی تھی۔ میکفرن نے یہ مژدہ بھی سنایا کہ شاید طلاق ہو جائے۔ موٹی اسامی کی گھات میں ہے۔ جلتے ہوئے مکان کو کرائے پر اٹھانا چاہتی ہے! وہ اس وقت اس تنکے میں پرویا ہوا کھٹا زیتون کھا رہی تھی۔ ہاتھ ملایا تو محسوس ہوا گویا اسے ۱۰۵ ڈگری بخار ہے۔ باتوں میں بھی سرسامی کیفیت۔ سمندری نیلے رنگ کے چست لباس پر سے لگائیں اور چست تر فقرے پھسل رہے تھے۔ واشگاف V نیک لائن نے سمندر جھاگ گھاٹی میں ایسی آدمی ڈباؤ ڈبکی لگائی تھی کہ، ہو تیرنے والا شرمندہ اور ڈوبنے والا ناز کرے۔ پیٹھ بھی انگریزی کے U کی طرح تا حدِ ادب کھلی ہوئی۔ لیکن ہمارے لیے ان سب سے زیادہ یہ دلکشی کہ اس کا شوہر ایک امریکن کمپنی کا منیجر تھا اور اس کے اکاؤنٹ سے ہمارے دن پھر سکتے ہیں۔ دُگنا تگنا سالانہ انکریمنٹ مل سکتا تھا جس سے ہم نئی عینک بنوا سکتے تھے۔ قالین خرید سکتے تھے۔

یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا

یوروپین بیبیوں کے بارے میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ کچھ بھی پہن لیں، بھلی لگتی ہیں۔ کچھ بھی نہ پہنیں تو کچھ بہت ہو جاتی ہے۔ مگر سارا الزام جدید یوروپین فیشن پر رکھنا صریحاً ناانصافی ہوگی۔ یونہی ہوتا آیا ہے۔ سو سال پہلے اسی طور نظیر اکبر آبادی اس زمانے کی کتربیونت اور اپنے دوطرفہ ردِعمل کا اظہار فرما گئے ہیں:۔

آگا بھی کھل رہا ہے، پیچھا بھی کھل رہا ہے
یاں یوں بھی واہ وا ہے اور ووں بھی واہ وا ہے

اسی سے ملتا جلتا نقشہ نواب درگاہ علی خان نے دلّی کی نامی گرامی طوائف امر بیگم کا اپنی فارسی تواریخ میں کھینچا ہے جس کا اُردو ترجمہ ''نادر شاہی قتلِ عام کی دلی'' حضرت خواجہ حسن نظامی نے کیا ہے۔ فرماتے ہیں ''اس کا کمال یہ ہے کہ یہ حسین اور طوائف ہونے کے ساتھ ساتھ اکثر ننگی رہتی ہے اور مجلسوں میں بالکل برہنہ آتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جسم کے اسفل حصہ کو بالکل عریاں کر کے اس پر پاجامے کی نقاشی کرواتی ہے۔ کمخواب کے تھان کی طرح اور بُوٹے دار پائجامے کی مانند اس کے زیریں جسم پر پائجامے کی تصویر بنی ہوتی ہے جو بالکل پائجامہ معلوم ہوتی ہے جب امر بیگم امیروں کی مجلسوں میں عریاں پائجامہ پہنے ہوئے آتی ہے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ننگی ہے۔ اس راز کو اس کے مخصوص آشنا ہی جانتے ہیں۔ امر بیگم بہت محبوب خلائق ہے''۔ خیر امر بیگم کے محبوب خلائق ہونے کی وجہ تو ظاہر ہے، مگر اگلے وقتوں کے بزرگوں کی شان ہی کچھ اور تھی۔ ہر بات میں ثواب کا پہلو نکال لیتے تھے۔ چنانچہ سلیس و لذیذ اُردو میں ترجمہ کے بعد حضرت خواجہ حسن نظامی نے کہ دلّی کے روڑے اور شیدائی تھے صرف یہ حاشیہ لگایا ہے کہ ''اس سے دلی کی مصوری کا کمال ظاہر ہوتا ہے!'' ہائے ہائے! نہ ہوئی امر بیگم۔ سُن لیتی تو پاجامہ پھٹ کے رہ جاتی۔



”خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں“



husain_sayyed2001@yahoo.com

قلندر حسین سید سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گزشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جا رہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سید نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیرِ نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی کھٹاس، کوڑ تما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

حاصل مطالعہ

☆ زمانہ بُرے لوگوں کی بُرائی کی وجہ سے خراب نہیں ہوتا بلکہ اچھے لوگوں کی خاموشی کی وجہ سے خراب ہوتا ہے (حضرت علیؓ)۔

☆ گلی گلی شہر شہر ملاں کا شور ہے کہ ”مسجد زیر تعمیر ہے“ چندہ دے کر ثواب دارین حاصل کریں۔ پھٹے پرانے کپڑے بھوکے پیٹ ننھا بچہ سوچ رہا ہے کہ کاش! ”میں بھی مسجد ہوتا“۔

☆ آج کل تعلیم سے ہم صرف اتنا سیکھ رہے ہیں کہ اوروں کو کہہ سکیں ”جاہل“۔

☆ بموں سے لوگوں کو مارنا دہشت گردی کہلاتا ہے اور بھوک سے مارنا جمہوریت ہے۔

☆ ”اینٹی بائیوٹک“ دوائیوں کے کچھ سائیڈ ایفیکٹس ایسے بھی ہیں جنھوں نے گردے کی پتھری نکالتے نکالتے معدے اور پتے کو بُری طرح متاثر کر دیا۔

دیکھتا ہے میرے منہ کی طرف
قائداعظم کا پاکستان دیکھ

☆ جو عدالتیں عوامی احتجاج سے متاثر ہو کر فیصلے بدل دیں وہ عدالتیں نہیں بادبانی کشتیاں ہیں جن کی منزلوں کا تعین ملاح نہیں ہوائیں کرتی ہیں۔

☆ جو قومیں اپنے سے بدتر جاہل اور بدکردار لوگوں کو اپنا آقا بنا لیں۔ ان کے لیے کبھی کوئی موسیٰ نہیں اُترا کرتا۔

☆ جو وطن اپنے شہریوں کو روٹی نہیں دے سکتا،

اس کے وجود کا کوئی جواز نہیں ہے، بھوک سے مرنے کے لیے مادر وطن کی ضرورت نہیں ہوتی بھوک سے کہیں بھی مرا جاسکتا ہے۔

☆ہمیں پاکستان کی ایک ایک اینٹ سے اس قدر عشق ہے کہ ہم نے پاکستان کی بنیادوں کی اینٹیں نکال کر اپنے گھر تعمیر کیے ہیں۔

☆ماں کل بھی روتی تھی کہ میرا بیٹا روٹی نہیں کھاتا اور آج بھی روتی ہے کہ میرا بیٹا روٹی نہیں دیتا۔

"آزادی"

☆اپنی سوچ دبا کر رکھنے سے بڑی غلامی اور کیا ہے؟ (یوریپڈیس)

☆آزادی اظہار کے اس کے علاوہ کیا معنی ہیں کہ وہ کہنے کی آزادی ہو جو لوگ نہیں سننا چاہتے (جورج اورویل)

☆اگر آزادی اظہار سلب ہو جائے تو پھر گونگوں بہروں کے ہجوم کو ایسے ہی ہانکا جاسکتا ہے جیسے بھیڑوں کے ریوڑ کو مذبح خانے کی جانب (جارج واشنگٹن)

☆مجھے کسی بھی آزادی سے پہلے آزادی ضمیر چاہیے (جارج ملٹن)

☆جو بھی کسی قوم کو غلام بنانا چاہے اس کی ابتدا آزادی اظہار چھیننے سے کرنی چاہیے۔ (بنجمن فرینکلن)

☆اگر ہم اپنی حکومت پر تنقید نہیں کرسکتے تو پھر یہ حکومت ہماری کیسے ہوگی؟ (مائیکل ٹمپلٹ)

(وسعت اللہ خاں کا کالم بی بی سی ڈاٹ کام سے اقتباس)

....

ہمارے حکمرانوں کا نظریہ یہ ہے کہ بھلے سارا شہر جل جائے مگر ہمارا گھر محفوظ رہے۔

"تصدیق' تردید' تصدیق"

کسی سیٹ کے رومانوی ماحول سے متاثر ہو کر وہ اور عدیل ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ حسب روایت خفیہ شادی، تصدیق' تردید' تصدیق کا سلسلہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ یہ شادی ختم بھی ہوگئی کہ ان کا Pair ٹوٹ چکا تھا۔ عدیل کسی اور "سیٹ" پر کسی نئی اداکارہ کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ اس کی آخری محبت ہے۔ فلمی اور غیر فلمی دونوں۔

لیکن نہ جانے ایسا کیوں ہوا؟ کہ چاہنے کے باوجود کسی کے قریب نہ جاسکی۔ اپنے آپ کو بار بار یقین دلانے کے باوجود وہ اپنے شعور کو قائل نہ کرسکی تھی کہ اسے عدیل سے وقتی محبت تھی یا شاید یکے بعد دیگرے تین شادیوں کی ناکامی سے دل برداشتہ ہوگئی تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو اب وہ محبت اور شادی، دونوں کو بکواس گردانتی تھی۔ کسی نئے جوڑے کو دیکھ کر اس قسم کی پیش گوئیاں کرنا اس کا مشغلہ تھا" دیکھنا چند ہی دن میں خمار اُتر جائے گا"۔ "سب وقتی جذبے ہیں" وغیرہ۔ اس منفی رویے کے باعث لوگ اس سے چڑنے لگے تھے۔ مگر اس کی بلا سے۔ وہ اس ملک کی چوٹی کی اداکارہ تھی۔ بڑے بڑے فلمساز پروڈیوسر، اس کے گھر کے چکر لگاتے نہ تھکتے تھے۔ پبلک آج بھی اس کی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتی تھی۔ سال میں کئی بار علالت کے سبب فارن کے چکر، کینالوں پر پھیلی آراستہ کوٹھی، نئے نئے ماڈل کی کاریں۔ اسے اور کیا چاہیے تھا؟ اسے ہر وہ نعمت میسر تھی۔ جس کے لیے بیویاں دن رات، اپنے خاوند کو کوسنے دیتی ہیں۔ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔

کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے وہ کہیں کھو جاتی۔ سیٹ پر، میک اپ روم میں، گھر میں، دوستوں کے درمیان۔ اچانک اس کی نگاہیں کسی ان دیکھی چیز پر ٹک جاتی تھیں۔ اس لمحے اس کی خوبصورت آنکھیں بے تاثر ہو جاتی تھیں اور صرف انہی کمزور لمحوں میں اس کا چہرہ ایکٹنگ کا نقاب اُتار کر اپنے ہونے کا ثبوت دیتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ یہ لمحے کسی کی گرفت میں آئیں۔ وہ سنبھل جاتی "Excuse me"

دراصل میں کچھ بہتر محسوس نہیں کر رہی" اور پھر ایک جاندار قہقہہ۔ وہ اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنے کا فن بہت اچھی طرح جانتی تھی وہ ایک پیدائشی اداکارہ تھی۔

وہ ایسے جرنلسٹوں سے، ایسے لوگوں سے دُور بھاگتی تھی جو اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کریں۔ اپنے فن کی پبلسٹی کی خاطر اداکاری کی خاطر۔ وہ گھنٹوں انٹرویو دے سکتی تھی لیکن بات جہاں نجی معاملات پر پہنچی۔ بڑی خوبصورتی سے ٹال دی گئی "Exeuse me" دراصل یہ اس کا تکیہ کلام تھا" مجھے اس وقت ایک پارٹی میں جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے پھر سہی" اور اپنی مسحور کن مسکراہٹ کی آڑ لے کر وہ غائب ہو جاتی۔

کسی سرپھرے جرنلسٹ نے ایک دفعہ خبر لگا دی کہ باخبر ذرائع کے مطابق میڈم رات کو بہت ڈسٹرب رہتی ہیں۔ اس خبر سے کسی قسم کا Reaction Show نہیں ہوا۔ "ان لوگوں کو کچھ تو چاہیے نا، اپنا اور اخبار کا پیٹ بھرنے کو" محض اس نے اتنا کہا اور ٹال گئی۔

پھر ایسی بات نہ لکھی گئی کہ کچھ ہوتا تو لکھتے نا! بستر سے اٹھنے سے لے کر رات بستر میں جانے تک، اس کی آہٹ لینے والے کئی لوگ تھے مگر کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہ دکھائی دی نہ سنائی دی حتیٰ کہ تھک ہار کر اخباروں رسالوں نے اپنی توجہ دوسرے لوگوں کی جانب کر لی۔ وقت بہت ظالم ہے، اپنے خونخوار پنجوں سے اس کے چارم کو کھروچتا رہا۔ گھنے سیاہ بالوں پر پھپھوندی نے ڈیرے ڈالے۔ چہرے کی ملائم جلد پر مکڑی نے جالے بن دیئے۔ خمدار ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہہ کے باوجود دراڑیں نمایاں ہوتی گئیں لیکن ڈھلتا شباب اور ڈھلتا سورج کب تک چھپتے ہیں بھلا!

سو یہی ہوا مس وردانہ کے ساتھ، صبح کافی دیر تک بیڈ ٹی طلب نہ کی گئی تو ملازم نے دروازہ بجایا۔ جواب ندارد۔ ہمت کر کے کھولا تو مس وردانہ بستر کے قریب قیمتی قالین پر گھٹنوں میں سر دیئے، گٹھڑی سی پڑی تھی۔ آواز دی، ہاتھ لگایا تو لڑھک کر ایک طرف ہو گئیں۔ ایک کہرام مچ گیا۔ ٹیلی فون، تار، اخبار، سب حرکت میں آ گئے۔ اس اچانک موت کا سبب ہارٹ اٹیک تھا۔ کئی دن ہنگامہ رہا، بیانات جاری ہوئے۔ لوگوں کو مس کی جائیداد کی فکر تھی۔ کون وارث ہوگا، اتنی ڈھیر ساری جائیداد کا، اس سارے ہنگامے میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو موت کا سبب اور دولت کے مصرف سے واقف تھا۔ وہ تھا محسن، وہ ملازم جس نے سب سے پہلے مس کو مُردہ حالت میں دیکھا تھا اور اسے ایک ایسے راز کی حفاظت مرتے دم تک کرنا تھی جو اس کے سوا کسی پر ہویدا نہ ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ البم گھوم رہی تھی جو اس کے گھٹنوں میں دبی ہوئی تھی۔ جس میں ان کے ساتھ عدیل اور ایک بچہ بھی تھا اور پھر۔ اس بچے کی ڈھیروں تصویریں، قالین پر کچھ خطوط بکھرے پڑے تھے کچھ نئے اور کچھ پرانے۔ دل کے رُک جانے کا سبب شاید مٹھی میں بند وہ خط تھا جو اس کے بیٹے نے لکھا تھا:

"امی! اب تو میں نے اُردو بھی سیکھ لی ہے، مجھے آپ اپنے پاس بلالیں (I miss you)۔ کل پاکستانی لڑکے نے بڑی عجیب سی بات کہی۔ اس نے مجھے کہا کہ تم ایک (Bastard) لڑکے ہو۔ جبھی تمہاری ماما تمہیں اپنے پاس نہیں رکھتیں۔ امی! کیا یہ سچ ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں خود کو شوٹ کر دوں گا، ورنہ مجھے اپنے اور ابو کے پاس بلالیں کون ہیں میرے ابو؟"۔

آپ کا رضی

("سچے جھوٹ" شہلا گیلانی کی کتاب سے اقتباس)

"تاج محل"

علی گڑھ میں تین دن قیام کے بعد ہم نے اگلی منزل کا رُخ کیا۔ پاکستان سے روانہ ہونے سے قبل علی گڑھ اور دہلی کے ساتھ آگرہ کا ویزہ بھی حاصل کر لیا تھا تاکہ دنیا کے سات عجائبات میں شامل تاج

محل و دیگر عمارات دیکھ سکیں۔

ہندوستان میں قیام کے چوتھے روز علی الصبح چھ بجے علی گڑھ سے آگرہ کے لیے بذریعہ کار روانہ ہوئے۔ ہماری گاڑی شہر سے باہر سڑک پر رواں دواں تھی۔ راستے بھر کھیت، گندم کی فصل کھڑی تھی اور بجلی سے چلتے ٹیوب ویل نظر آرہے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف گھنے درخت اور سورج کی اولین کرنیں عجب دلربا منظر تھا۔ ہندوستانی عوام کی طرز زندگی کا مشاہدہ کرتے سوا آٹھ بجے آگرہ شہر میں داخل ہوگئے۔

جہانگیر کے بعد شاہجہاں بادشاہ بنا تو اس نے ہی تاج محل بنوایا۔ آگرہ کی تاریخی حیثیت اپنی جگہ مگر تاج محل نے اس کی شہرت کو دوام بخشا ہے اور آج تاج محل کے باعث آگرہ معروف عالم ہے۔ ہم آگرہ شہر سے گزرتے ہوئے۔ تاج محل کی طرف جارہے تھے کہ ہماری گاڑی ایک چوک میں جاکر کھڑی ہوگئی۔ سامنے ایک بڑی قلعہ نما فصیل نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ تاج محل کو آلودگی سے بچانے کے لیے کسی گاڑی کو تاج محل تک نہیں جانے دیا جاتا۔ گاڑیاں یہیں رُک جاتی ہیں۔ یہاں سے آگرہ ڈویلپمنٹ اتھارٹی (اے ڈی اے) کی بیٹری سے چلنے والی بس کے ذریعے صدر دروازے تک گئے۔ ان بسوں میں 96KV کی الیکٹرک بیٹری نصب ہے اور کرایہ صرف دو روپے ہے۔ ہم نے قلعہ نما گیٹ کے کونے میں قائم ٹکٹ بوتھ سے جس کے باہر نمایاں انداز میں تحریر ہے...... بھارتی شہری بیس روپے غیر ملکی 750 روپے، ٹکٹ خریدے اور سرخ پتھر کی مٹی سے بنے مین گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ اس عظیم الشان گیٹ پر کالے سنگ مرمر سے آیات کریمہ کندہ ہیں۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے رات دس بجے تک تاج محل کھلا رہتا ہے۔ مین گیٹ کے ساتھ سائیڈ گیٹ پر ایک قطار میں کھڑے ہوگئے۔ جہاں چند منٹوں کے بعد ہماری باری آنے پر تلاشی لی گئی اور ہاتھ کے اشارے سے آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ سکیورٹی اتنی سخت تھی کہ آپ تھرماس یا کھانے کی کوئی چیز اندر نہیں لے جاسکتے۔ مرکزی گیٹ جو سرخ پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ حیرت زدہ کردیتا ہے۔ لاتعداد سیاح تو مرکزی دروازہ دیکھ کر ہی حیرت زدہ کھڑے تھے۔ اندر داخل ہوئے تو نظروں کے سامنے تاج محل تھا۔ اس عظیم دلکش اور پرشکوہ عمارت کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس کی منظرکشی کے لیے الفاظ کا انتخاب مشکل ہے۔ یقین نہیں آرہا تھا جس کا ذکر ہم بچپن سے سن اور پڑھ رہے تھے وہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ بے اختیار پروفیسر رشید احمد صدیقی کا تاریخی جملہ ذہن میں آگیا کہ مغل بادشاہوں نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں۔ اُردو زبان، مرزا غالب اور تاج محل۔ 142 ایکڑ رقبے پر محیط دریائے جمنا کے مغربی کنارے واقع تاج محل سفید سنگ مرمر سے تعمیر شدہ بے حد خوب صورت، دلربا اور فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ اسم بامسمیٰ ہے۔ اگر اسے دنیا کی خوبصورت ترین عمارت قرار دیا جائے تو قطعی بے جانہ ہوگا۔ اس کی تعمیر میں جو پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ دن ہو یا رات چاندنی رات ہو یا اندھیری، سورج کی روشنی ہو یا بادلوں کی اوٹ یہ عمارت ہر حال میں اپنا حسن قائم رکھتی ہے۔

میں نے تاج محل کے بارے میں ساحر لدھیانوی کے اشعار تاج محل کو گواہ بنا کر آہستہ سے پڑھ دیئے:۔

یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

شاہجہاں اور ساحر دونوں عشق پیشہ تھے لیکن ساحر غریب بندہ تھا۔ ایسی صورت حال میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

تاج محل کی تعمیر مغلوں کے معروف بادشاہ شاہجہاں نے کرائی۔ وہ اپنی دوسری اہلیہ ارجمند بانو جسے وہ ممتاز محل کا نام دیتا تھا کو بہت چاہتا تھا۔ ان کی شادی 1612ء میں ہوئی اور ان کے ہاں چودہ بچوں کی ولادت ہوئی۔ ممتاز ہر لحہ شاہجہاں کے ساتھ رہتی تھی۔ 1631ء میں برہان پور کے مقام پر اپنے آخری بچے کی پیدائش پر وہ زچگی کے دوران انتقال کر گئیں۔ شاہجہاں کے لیے یہ صدمہ بڑا تھا۔ روایت ہے کہ ممتاز نے اپنے انتقال سے قبل بادشاہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی یاد میں شاندار مقبرہ بنوائے گا۔ دوسری شادی نہیں کرے گا اور بچوں پر مہربان رہے گا۔ شاہجہاں نے ممتاز محل کی وفات کے بعد وعدہ ایفا کرتے ہوئے فوری طور پر تاج محل کی تعمیر کا حکم دیا۔ شاہجہاں کا خلوص جب ان سنگ وخشت میں ڈھلا تو دنیا کی خوبصورت ترین عمارت معرض وجود میں آگئی جو برصغیر میں مسلم ثقافت کی پہچان ہے۔ جسے دیکھنا ہر آنکھ کی حسرت بن چکا ہے۔ یہاں شاہجہاں اور ان کی اہلیہ کا مقبرہ پہلو بہ پہلو ہیں۔ یہ عمارت ساڑھے تین سو سال قبل سترہویں صدی کے وسط میں تعمیر کی گئی۔ اس فن تعمیر کی شاہکار عمارت کی تکمیل پر تقریباً بائیس سال کا عرصہ صرف ہوا تھا۔ تاج محل کا داخلی دروازہ بے حد خوبصورت ہے۔ یہاں سے دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ عمارت بہت دور اور چھوٹی ہے۔ جوں جوں قریب جائیں تو اس کا گنبد بڑا ہوتا جاتا ہے۔

مین گیٹ اور تاج محل کے درمیان پانی کی گزر گاہیں اور فوارے نصب ہیں۔ اس پانی میں تاج محل کا عکس نہایت خوبصورت اور دلربا منظر پیش کرتا ہے۔ تاج محل کے صحن میں داخل ہونے والے پہلے دروازے کی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر تاج محل پر نظر ڈالیں تو کوئی مینار نظر نہیں آتا لیکن اگر ایک قدم اور دائیں طرف اُٹھائیں تو بایاں مینار نظر آتا ہے۔ اسی طرح ایک قدم بائیں طرف اٹھائیں تو دایاں مینار نظر آتا ہے۔ اُلٹے پاؤں چلیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تاج محل آپ کے پیچھے آرہا ہے۔ یہ سب فن تعمیر کا کمال ہے۔ یہ صدیوں پرانی عمارت ہے لیکن زمانے کے سرد وگرم جھیلنے اور ٹوٹ پھوٹ کے باوجود یوں لگتا ہے کہ ابھی ابھی تعمیر ہوئی ہے۔ تاج محل صرف ایک مقبرہ کا نام نہیں۔ یہ صرف تین گنبدوں اور چار میناروں کا مجموعہ نہیں بلکہ کئی عمارات کا مجموعہ ہے۔ اس میں صدر دروازے، شاندار باغ، مسجد اور فصیلیں شامل ہیں۔ شاہجہاں اور ان کی محبوب اہلیہ ممتاز محل کی اصل قبریں مقبرے کے تہہ خانے میں ہیں۔ البتہ فرش پر قبروں کے تعویز موجود ہیں۔

("امن کی آشا" حکیم راحت نسیم سوہدروی کا کالم جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

"کلام بہادر شاہ ظفر"

لگتا نہیں ہے جی مرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالم نا پائیدار میں
بلبل کو پاسباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید تھی لکھی فصل بہار میں
کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دل داغ دار میں
اک شاخ گل پہ بیٹھ کے بلبل ہے شادماں
کانٹے بچھا دیے ہیں دل لالہ زار میں
عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہو گئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنج مزار میں
کتنا بدنصیب ہے ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ مل سکی کوئے یار میں

(دیوان بہادر شاہ ظفر سے انتخاب)

"سوال"

میرا سوال بہت سادہ ہے کہ بی بی کے جان

دینے' زرداری کے جیل کاٹنے اور نواز شریف کی بے وطنی نے اس ملک اور اس کی عوام کو کیا دیا؟ یہ سب قربانیاں نہیں، پاور پلے تھا اور تخت سے لے کر تختہ دار تک یہ سب کچھ اس پیکیج کا حصہ ہوتا ہے۔ داراشکوہ' شجاع' مراد جمہوریت نہیں بادشاہت کے لیے مارے گئے تھے۔

عوام کے حصے میں بھوک' افلاس' بے روزگاری' بدامنی کے علاوہ نہ کچھ تھا نہ ہے اور نہ ہی ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ سوائے ان قرضوں کے جو بتدریج بڑھتے جارہے ہیں۔ عوام کو نہ کسی کی جان چاہیے، نہ جلاوطنی انہیں صرف اناج' علم' علاج اور تھوڑی سی عزت کی ضرورت ہے۔ جسے سابقہ 66 سالوں میں کوئی پورا نہیں کرسکا۔

''دیکھ کبیرا رویا'' ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی کتاب (سفرنامہ) سے اقتباس'

طرفہ فیشن

یہاں لوگوں کو لباس کے بارے میں عجیب لاپرواہی برتتے یا اس کا تماشہ بناتے دیکھا۔ یہاں خاص کپڑا جین ہے۔ جین کے نکر، سکرٹ، کوٹ، قمیص، پتلون، جیکٹ عام پہناوا ہے۔ پتلی جین پر سب فدا ہیں۔ چلو جین پہننے میں تو کوئی عیب نہیں۔ کھردرا' موٹا' نہ پھٹنے والا دیرپا کپڑا ہے مگر عجب تماشا اس وقت دیکھنے میں آتا ہے جب پتلون کی جین کو چاقو' قینچیوں بلکہ دانتوں سے کاٹ کر بدنما کیا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں (امریکہ) اچھے خاصے شریف نما قسم کے خواتین وحضرات کی پتلون کو قینچی سے گھٹنوں تک کٹا ہوا پایا۔ کاٹا اس طرح جاتا ہے کہ دھاگے اور ریشے لٹکتے نظر آئیں۔ بعض زیادہ من چلوں/چلیوں نے پتلون کو کئی جگہ سے پھاڑا ہوتا ہے۔ مزے کی بات ہے کہ اوپر والے کپڑے ٹھیک ہوتے ہیں مگر صرف پتلون اور وہ بھی جین کی پتلون کے ساتھ یہ ناگفتہ بہ سلوک کیا جاتا ہے۔ وجہ آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ موقع لگا تو کسی نیک دل واقف حال امریکی سے پوچھ لیں گے۔

ہم نے کل یہاں ایک خاتون کو دیکھا، فرسٹ کلاس گاڑی سے نکلیں لباس عمدہ تھا خود بھی خوب صورت اور سفید فام مگر ایک پاؤں میں اونچی ایڑھی کی جوتی اور دوسرے میں ایک جاگر پہنا ہوا تھا۔ ہم حیران ہوکر وہیں ٹھٹھک گئے ہم نے سوچا شاید پاؤں میں نقص ہوگر وہ سگریٹ خرید کر نکلیں پاؤں ٹھیک ٹھاک تھے۔ نشہ میں بھی وہ نہ تھیں۔ ایک اور نیک بخت کو دیکھا کہ بٹنوں والے ٹھیک ٹھاک سویٹر کو اُلٹا پہنا ہوا تھا۔ یعنی بٹنوں والا حصہ پیچھے تھا۔ پتہ نہیں پیچھے بٹن کس نے لگائے تھے۔ ایک اور خاتون کو ایک عجیب حرکت کرتے دیکھا۔ تخت بارش تھی ہم بس سٹاپ پر کھڑے تھے۔ بس آئی ایک نوجوان خاتون اُتریں دیکھا کہ بارش ہے انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنا گرم بلاؤز اُتار کر سر پر ڈالا اور بھاگ کر سڑک کراس کرگئیں۔ سر تو بارش سے بچ گیا بلاؤ سے باقی کچھ چھپایا نہیں چھپا۔

دنیا کا سب سے طویل پل

ہماری نگاہ میں شہر کی سب سے بڑی خصوصیت یہاں کا مشہور عالم پل ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ دنیا کے اس عجوبہ روزگار پل کا شہرہ امریکہ اور دنیا بھر میں کہیں نہیں ہے۔ سمندر کے اوپر کنکریٹ کا پل ڈالنا ہماری نگاہ میں معجزہ ہے۔ ایک بھی نہیں دو پل ساتھ ساتھ چلتے ہیں ایک آنے کے لیے دوسرا جانے کے لیے۔ ہر چند میل پر دونوں پلوں کو ملانے والے کشادہ حصے ہیں۔ 16 میل کے فاصلے پر پلوں کو اٹھا کر جہازوں کو راستہ دینے کا سسٹم ہے۔ ہر آدھے میل پر ٹیلی فون بوتھ نصب ہیں۔ دونوں پلوں پر پچاس پچاس منٹ کے پچیس ہزار سے زیادہ (Span) ہیں۔ ہر سپان کے نیچے چھ ستون ہیں گویا تین لاکھ ستون، سب پل اور ستون سیمنٹ کے بنے ہیں۔ کیسے بنے ہیں اور سمندر میں کس طرح

نصب کیے گئے ہیں۔ خدا جانتا ہے۔ ہماری عقل تو جواب دے گئی ہے۔ پل سائنسی ترقی کے موجودہ دور سے 35 سال قبل 1956ء میں صرف 51 ملین ڈالر کے خرچ سے چودہ ماہ کے عرصے میں بنایا گیا۔ یہ اس دور کی نشانی ہے جب ریاست لوسیانا تیل کی دولت سے مالامال ایک مالدار ریاست تھی۔ لوسیانا کا صدر مقام (Baton Rouge) جو اورلین سے سو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس علاقے میں پیٹروکیمیکل انڈسٹری کا راج ہے۔ اس علاقے کو گنے کی پیداوار اور پیٹروکیمیکل کی بہتات کی وجہ سے امریکی پیٹروکیمیکل گولڈ کوسٹ اور امریکی چینی کا پیالہ (Sugar Bowl) بھی کہا جاتا ہے۔ ہم نے جب یہ پل دیکھا تو حیرت و استعجاب سے ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہم اسے دنیا کے ساتویں عجوبہ سے کم نہیں سمجھتے۔

"قدیم ترین زبان"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی قدیم ترین زبان کون سی ہے۔ اس سوال کا آج قطعی جواب دینا آسان نہ ہوگا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قدیم ترین زبانوں کی حامل تہذیبیں اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ جہاں تک لسانیات، آثارِ قدیمہ اور علم الانسان کے ماہرین کی تحقیقات کا تعلق ہے تو دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں دو نام نمایاں تر نظر آتے ہیں۔ ان میں سے پہلی "سامی" (یا آرامی) کہلاتی ہے جبکہ دوسری کا نام "میری" (یا کاری) ہے۔ اول الذکر حضرت نوحؑ کے عہد کی زبان تھی مگر "عہد نامہ عتیق" کے بموجب جب بابل میں مینار تعمیر کرنے کی پاداش میں ان کی زبانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا گیا اور وہ سب جدا ہو کر مختلف علاقوں میں الگ بستیاں بنا کر رہنے لگے تو ان کی زبانیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو گئیں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ان کے الفاظ اور تلفظ میں اتنا فرق پیدا ہو گیا کہ اصل سے کوئی تعلق باقی نہ رہا۔

"دہشت گردوں کے حملے"

پاکستان کے حساس اداروں پر دہشت گردوں کے حملوں کی تفصیل:۔

	جی ایچ کیو	مہران بیس	کامرہ ایئر بیس	پشاور ایئر پورٹ	کراچی ایئر پورٹ
تاریخ	10 اکتوبر 2009ء	27 مئی 2011ء	16 اگست 2012ء	15 ستمبر 2012	8 جون 2014ء
وقت	صبح 11 بجے	شام 10½ بجے	رات 2 بجے	شام 10 بجے	شام 10½ بجے
حملہ آور	6	6 جبکہ دو فرار	9	10	10
لباس	فوجی وردیاں	عام	پاک فضائیہ کی وردیوں میں	عام	اے ایس ایف کی وردی
شناخت	پاکستانی	غیر ملکی	4 پاکستانی	6 غیر ملکی اور 4 پاکستانی	غیر ملکی ازبک
آپریشن کی مدت	22 گھنٹے	16 گھنٹے	4 گھنٹے	4 گھنٹے	5 گھنٹے
ذمہ داری	تحریک طالبان پاکستان	تحریک طالبان پاکستان	تحریک طالبان پاکستان	تحریک طالبان پاکستان	تحریک طالبان پاکستان

حضرت نوحؑ کے بیٹے کا نام سام تھا جن کے نام پر ان کی زبان "سامی" کہلوائی۔ سام کے بیٹے آرام، عیلام اور آشور تھے۔ ان سب کے ناموں پر بھی زبانیں بنیں۔ آرام کی نسل حجاز سے لے کر کریمن تک کے علاقے میں آباد تھی، ان کی زبان "آرامی" کہلاتی تھی۔ یہ چار ہزار ق۔م کی بات ہے، آشور کی اولاد شام (جس کا قدیم نام سوریا تھا) میں آباد تھے۔ ان کی زبان "سریانی" تھی جبکہ عابر کے نام پر عبری یعنی عبرانی زبان بنی۔ قدیم بائبل میں "سمری" اور "اکاری" زبانیں بولی جاتی تھیں۔ یہ زبانیں تاریخی تغیرات کے باوجود ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتی رہیں اور تقریباً 2 ہزار برس ق۔م تک یہ کسی نہ کسی صورت میں بولی جاتی تھیں۔ اب یہ سب ختم ہو چکی ہے۔ البتہ توریت کی صورت میں سریانی محفوظ رہ گئی یا پھر ہمارے زمانے میں اسرائیل نے اپنی مردہ زبان عبرانی کو زندہ کر کے دفتر اور تعلیم و تدریس کی زبان بنا دیا۔

حضرت نوحؑ کے بیٹے بیٹوں سے نسل انسانی پھیلی۔ چنانچہ دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلی انسانی آبادی کو اب ان ہی ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ بیٹے سام، حام اور یافث تھے۔ سام کی نسل سے آرین اور بیشتر یورپین اقوام کا تعلق ہے۔ حام کی نسل افریقہ کے سیاہ فام باشندوں پر مشتمل ہے یعنی حبشی اور قدیم ہندوستان کے دراوڑی۔ جبکہ یافث سے منگول اور زرد فام نسلوں کا تعلق ہے۔ یوں دیکھیں تو سفید (سام)، سیاہ (حام) اور زرد (یافث) نسلوں سے ہی زبانوں کے بڑے گروہوں نے بھی جنم لیا۔

قدیم ترین یا مُردہ زبانوں کا سراغ لگانے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ وہ تہذیبیں ہی باقی نہ رہیں۔ جن سے ان زبانوں کا تعلق تھا۔ واضح رہے کہ وہ تہذیبیں اپنے زمانے کے لحاظ سے خاصی ترقی یافتہ ہوں گی۔ اس ضمن میں قدیم عراق کی تہذیب کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جہاں خط میخی میں لکھی ہوئی گلگامش کی داستان دنیا کی قدیم ترین داستانوں میں ممتاز مقام کی حامل ہے۔ یہ صرف ایک ہی مثال ہے۔ اگر قدیم تہذیبوں اور زبانوں کی شاعری اور نثر کے نمونے آج دستیاب ہو سکتے تو ان کے مطالعے سے ان کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ان کی زبان اور اس کے ذخیرہ الفاظ کے بارے میں بھی کارآمد معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

("اُردو زبان کیا ہے؟" ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب سے اقتباس)۔

"غیرت ایسی بے غیرت"

ہم دہشت گردوں سے لے کر ملک لوٹنے والے سیاسی و دیگر مجرموں کو سزائیں نہیں دے سکتے ہم ان مگرمچھوں کو تو نشانِ عبرت بنانے کے قابل نہیں لیکن کیا ہم غیرت کے نام پر سرعام بے غیرتی کا ارتکاب کرنے والوں کو بھی لگام نہیں دے سکتے؟ کیا ان کے سامنے بھی ہمارے آہنی ہاتھوں کو فالج ہو جاتا ہے؟

یہ کیسے غیرت مند ہیں جن کی بے غیرتی میں لپٹی غیرت کسی ڈھنگ کے معاملے میں بھی بیدار نہیں ہوتی۔ اردگرد ظلم، زیادتی، جبر و استحصال کے ہمالیہ کھڑے ہیں لیکن غیرت سوتی رہتی ہے، کسی دکان پر تول پورا نہیں۔ غیرت خراٹے لیتی رہتی ہے۔ گلیوں بازاروں میں کسی عورت کا تنہا نکلنا ممکن نہیں۔ غیرت خواب دیکھ رہی ہوتی ہے۔ ساتھ گیس، بجلی چوری ہو رہی ہوتی ہے، سب جانتے ہیں چونکہ چور تگڑا ہوتا ہے اس لیے غیرت خوابِ خرگوش کے مزے لینے کو ترجیح دیتی ہے۔ محلے علاقے میں غلاظت کے ڈھیر لگے ہیں، گٹر نے اُبل اُبل کر دُور دُور تک سوئمنگ پول بنایا ہوتا ہے لیکن غیرت اس گندے جوہڑ کے کنارے محوِ خواب رہتی ہے۔ سب کو خبر ہوتی ہے کہ فلاں کے پچھواڑے میں جعلی کیپسول بھرے جا رہے ہیں۔ دو نمبر گھی اپ بن رہی

ہے۔ جعلی دودھ تیار ہو رہا ہے لیکن غیرت ایسی بے غیرت ہے کہ جاگنے کا نام نہیں لیتی۔ پورا محلہ جانتا ہے کہ تھانے دار جسے چھتر مار مار کر اٹھا لے گیا وہ بے قصور ہے لیکن غیرت کروٹ بدلنے کے بعد دوسری طرف منہ کر کے سوئی رہتی ہے۔

سب کچھ گل سڑ چکا ہے، پوری طرح ادھڑ چکا ہے۔ اگر عدالت کے احاطے میں ایک عورت سرعام سنگسار کی جا سکتی ہے تو کون سی ریاست؟ کیسی رٹ؟ کہاں کی بلٹ ٹرینیں اور کون سی میٹرو؟

("چوراہا" حسن نثار کے کالم جنگ ڈاٹ کام سے)

"انٹرویو

قاسم خاں پیشے کے لحاظ سے ماہر نفسیات ہیں۔ 70 کی دہائی سے بسلسلہ تعلیم جرمنی گئے۔ ان کا ایک سفر نامہ "تہذیب کا سفر" یورپ کا تہذیبی، لسانی، ثقافتی اور سیاحتی منظر نامہ بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ جس میں انہوں نے قوموں کی تہذیب' ثقافت، تاریخ رہن سہن کے حوالے سے اپنے تجربات، مشاہدات کو منفرد انداز میں متعارف کرایا ہے۔ قاسم خاں جرمنی کے علاوہ سرزمین روم' سپین' یونان' فرانس' آسٹریا' ترکی' پولینڈ' بلغاریہ سمیت بہت سے خطوں کا بارہا سفر کر چکے ہیں۔ ان سے کی گئی گفتگو قارئین کی نذر ہے:۔

سوال: تحقیق پر آپ نے گراں قدر کام کیا ہے۔ پاکستان میں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے، اس سے آپ مطمئن ہیں؟

جواب: ہمارے ہاں تحقیق کا معیار یہ ہے کہ جس موضوع پر طالب علم تحقیق کر رہا ہے اسے بازار یا مارکیٹ کا پتہ بتا کر وہاں بھیجا جاتا ہے۔ وہ متعلقہ موضوع پر کسی کے پہلے سے ہوئے تحقیقی مقالے کے شروع اور آخر کے صفحات پھاڑ کر کچھ مواد خود لکھ کر اپنے نام سے تحقیقی مقالہ شائع کرا لیتا ہے۔ پی ایچ ڈی کے بیشتر مقالے چوری شدہ ہوتے ہیں۔ مضافاتی یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے۔

سوال: ترقی یافتہ ممالک میں تحقیق کا معیار کیا ہے؟

جواب: ہمارے اور ان کے تحقیقی کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں تحقیق کرنے والے طلبہ کو حکومت جو سہولتیں دیتی ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں لائبریریوں کی کوئی سیکورٹی نہیں ہے۔ صرف ایک کارڈ پر پانچ کتابیں ایشو کرا سکتے ہیں جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں صرف پاکستانی 70 روپے ایک سمسٹر کی رجسٹریشن کراتے ہیں۔ دو ہزار آٹھ سو ڈالر ریاست دیتی ہے۔ ٹرانسپورٹ مفت ہوتی ہے۔ میڈیکل طالب علموں کا فری ہوتا ہے۔ گیسز کھلائی جاتی ہیں،

مگرمچھ اور کچھوے کی حیران کن دوستی

دوستی پر فخر سے متعلق بول تو ہر کسی کی زبان پر کبھی نا کبھی ضرور آئے ہوں گے۔ اور اس کی مثالیں حقیقی زندگی میں بھی اکثر و بیشتر انسانوں کے حوالے سے سامنے آتی رہتی ہیں۔ لیکن یہاں پر کسی انسانی جوڑی کی بات نہیں کی جا رہی بلکہ یہ ایک کچھوے اور مگرمچھ کی دوستی کی کہانی ہے جو ایک دوسرے سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ نا صرف اکثر و بیشتر ساتھ نظر آتے ہیں بلکہ کبھی کبھار تو کچھوے میاں بڑے مزے سے مگرمچھ کے مضبوط خول پر بیٹھ کر دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر جانے کیلئے سواری کے مزے لیتے نظر آتے ہیں۔ انسان ہو یا جانور ہمیشہ اپنے سے کئی گنا تیز چلنے والی سواری پر بیٹھنا پسند کرتا ہے۔ لیکن کچھوے اور مگرمچھ کی اس دوستی میں اور ہی نظارہ ہے جہاں سست رفتار کچھوے نے اپنے سے کئی گنا سست رفتار مگرمچھ کو سواری کیلئے منتخب کیا ہے۔

(مرسلہ: ارم خان، فیصل آباد)

سوئمنگ کرائی جاتی ہے۔ ذہن کو تروتازہ رکھنے کے لیے طلبہ کو تمام سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ کھانا فری ہوتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں آیا کپڑے دھو کر استری کر کے کمروں میں پہنچا دیتی ہے۔ جیب سے کچھ بھی ادا نہیں کرنا پڑتا۔ تحقیق کے دوران جرمنی میں طلبہ کو ایسی سہولیات مہیا کی جاتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی فائیو سٹار ہوٹل میں قیام کر رہے ہیں۔

سوال: کیا ہمارے ہاں سینئر ادیب جونیئر کی رہنمائی کا حق ادا کر رہے ہیں؟

جواب: ہمارے ہاں سینئر جونیئر کی تربیت کرنے سے عاری ہیں ہر بڑا ادیب اس زعم میں مبتلا ہے کہ میں بڑا ہوں۔

سوال: آپ کو کتنی زبانوں پر عبور ہے اور ادب و ثقافت کے لیے کون سی زبان پسند کرتے ہیں؟

جواب: پاکستانی زبانوں میں اُردو، پشتو، ہندکو، پنجابی، سرائیکی زبانوں پر عبور ہے۔ بین الاقوامی زبانوں میں انگلش، اطالوی، جرمن، قدیم یونانی، لاطینی، ہسپانوی زبان میں کام کر چکا ہوں۔ تمام زبانوں میں لاطینی زبان پسند ہے اسے تمام زبانوں کی ماں کہتا ہوں۔

سوال: دنیا کی کون سی زبان اُردو کے قریب ترین لگتی ہے؟

جواب: میرے خیال میں اُردو نے لاطینی زبان سے استفادہ کیا ہے۔ اُردو میں بہت سے الفاظ لاطینی سے لیے گئے ہیں۔ اس موضوع پر مکمل کتاب بھی لکھنے کا ارادہ ہے۔ ہم احساس کمتری کا شکار لوگ ہیں۔ آج بھی طلبہ کو پڑھاتے ہیں کہ اُردو لشکری زبان ہے۔ اُردو میں ترکی کے الفاظ شامل ہیں۔ جبکہ ترکی زبان کو مرے ہوئے بھی سوسال ہو گئے۔ جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو ترکی کی زبان ختم ہو گئی تھی۔ اس وقت جو ترکی زبان چل رہی ہے وہ لاطینی والی ترکش زبان ہے۔ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اُردو کو لاطینی زبان میں ضم کرنا ہوگا۔ اگر آج دنیا میں اُردو کے پانچ چیئرز ہیں تو میرا دعویٰ ہے کہ دس سال میں 50 سے زائد چیئرز ہوں گے۔

نئی نسل میں سیکھنے کی صلاحیت نہیں، ہر نوجوان شاعر خود کو احمد فراز سمجھتا ہے۔

(شگفتہ بلوچ کا کالم جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

"تشکک کی آلودگی"

لڑکپن کا زمانہ بھی عجیب زمانہ ہوتا ہے۔ نظر کا دائرہ تنگ ہونے کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی چیزیں اصل سے بہت بڑی نظر آتی ہیں اور دماغ چونکہ بے یقینی اور تشکک کی آلودگی سے پاک ہوتا ہے، اس لیے ہر بات پر بہت جلد یقین آ جاتا ہے۔

مجھے اپنے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا، جس میں کوتاہ نظری اور "یقین" کا کرشمہ ملاحظہ ہو۔

آج سے کوئی بیالیس برس پہلے کا ذکر ہے راقم بٹالہ میں تعلیم پاتا تھا۔ ایک دن دادا کے کتب خانے کی قلمی کتابیں نکال نکال کر دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً ستر دیا کی کتاب پر نظر پڑی۔ اسے کھول کر دیکھا تو ایک نئی دنیا نظر آئی۔ کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی تھی اور اس میں کیمیا، سیمیا، ہیمیا، ولیمیا کے بے شمار نسخے، لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جانے کی ترکیبیں، پوشیدہ دفینوں کا پتہ چلانے کا ڈھنگ، غرض بے شمار پراسرار باتیں درج تھیں۔ لڑکپن کا زمانہ تھا اس کتاب نے راقم کے تخیل کا اس طرح احاطہ کیا، دن رات اس کتاب کے سوا اور کسی چیز کا ہوش نہ تھا اور بزعم خویش یہ سمجھ لیا گیا کہ اب کیا ہے؟ دنیا بھر کے خزانوں کی کنجی ہاتھ آ گئی ہے۔ جب چاہیں گے سونا بنا لیں گے اور جب جی میں آئے گا گڑھے دبے خزانے نکال لیں گے۔

اس گوہر بے بہا کی یافت کی حدت اتنی زیادہ تھی کہ دل میں سما نہ سکی۔ راقم نے اپنے ایک ہم جماعت بشیر کو اپنا راز دان بنایا اور بڑے تامل اور اہتمام کے بعد وہ کتاب اسے دکھائی۔ دوست بھی اس کتاب کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ ہم دیر تک

اکٹھے بیٹھ کر اس کتاب کو پڑھتے رہے اور آخر یہ قرار پایا کہ اس کے کسی نسخے کو آزمانا بھی چاہیے۔ اس کتاب میں ایک مقام پر درج تھا کہ اتوار کے دن جب "پکھ پچھتر" ہو۔ اگر کوئی شخص شہر کے باہر جا کر چیل یا الو کے گھونسلے کی تلاشی لے تو کچھ عجب نہیں کہ اسے پارس پتھر مل جائے جس کے چھونے سے ہر چیز سونا بن جایا کرتی ہے۔ یہ کام نسبتاً بہت آسان معلوم ہوا کہ آئندہ اتوار ہی کو پک پچھتر آرہا ہے۔

انتظار کے دو چار دن بے انتہا مشکل سے کٹے۔ آخر خدا خدا کر کے اتوار آیا اور ہم دونوں شہر کے باہر نکل گئے۔ بشیر نے بتایا کہ فلاں درخت پر الو کا گھونسلا ہے۔ وہاں چل کر پارس پتھر ڈھونڈیں گے چنانچہ ہم اس درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ قرار پایا کہ راقم اس درخت پر چڑھ کر الو کے گھونسلے کی تلاشی لے۔ چنانچہ راقم اس درخت پر چڑھ گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ الو کا گھونسلا اسی درخت کے تنے میں ہے جو اندر سے کھوکھلا ہے۔ تنا زمین سے کوئی نو دس فٹ اونچا تھا۔ جس میں سے دو تین بڑے بڑے ٹہنے نکل کر دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ جس مقام سے وہ ٹہنے نکل کر دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے وہاں گھونسلے کا دہانہ تھا اور اس کے اندر بالکل اندھیرا معلوم ہوتا تھا۔

بشیر نے کہا بس یہی گھونسلا ہے اس میں بے تکلف اتر جاؤ۔ راقم نے اس دہانے کے کناروں پر دونوں ہاتھ جما کے ٹانگیں تنے کے اندر لٹکا دیں لیکن پاؤں کو گھونسلے کی "تھاہ" نہ ملی۔ بشیر نے پھر کہا "ہاتھ چھوڑ کر کود پڑو تا! بہت زیادہ گہرا نہیں ہے"۔

چنانچہ میں نے ہاتھ چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا پر چھوڑا اور دھڑام سے کود پڑا۔ ایک دم ایسا معلوم ہوا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور کوئی شخص گلا گھونٹ رہا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ اس درخت کا تنا اوپر سے نیچے تک کھوکھلا تھا اور راقم اب تنے کے اندر زمین کی سطح کے برابر کھڑا تھا۔ اوپر نگاہ اٹھائی تو گھونسلے کے دہانے میں سے صرف تھوڑا سا آسمان دکھائی دیا۔ بدبو کا یہ عالم تھا کہ دماغ پھٹا جاتا تھا اور تنکوں اور پروں کے ٹکڑے، ہڈیاں اور دوسری الا بلا چیزیں چبھ رہی تھیں۔ اندھیرے میں دم گھٹ رہا تھا اور موت سامنے دکھائی دے رہی تھی۔

دفعتاً خیال آیا کہ پارس پتھر تو گیا بھاڑ میں، یہاں سے جان لے کر نکلنا کیونکر ہوگا، بشیر کو آواز دی۔ ارے میاں میں مر چلا، مجھے باہر نکالنے کی تدبیر کرو لیکن بشیر صاحب ابھی تک کیمیا اور سونے ہی کے خیال میں مستغرق تھے۔ ایک دم بول اٹھے شاباش پالا مار لیا۔ اب ذرا ہاتھ مار کر دیکھو تو، کہیں پارس پتھر بھی ہے یا نہیں۔ راقم نے جھنجلا کر کہا "کم بخت میری جان نکل رہی ہے اور تجھے پتھر پارس کی پڑی ہے۔ اگر میری زندگی چاہتا ہے تو خدا کے لیے اس "زندان سیاہ چاہ" سے کسی طرح مجھے نکال۔

اب تو بشیر کو بھی فکر ہوئی کہ آخر گھونسلے سے باہر نکلنے کی کیا تدبیر کی جائے۔ بڑے غور و فکر کے بعد قرار پایا کہ بشیر درخت پر چڑھ کر اپنی پگڑی کا ایک سرا درخت کے بڑے ٹہنے سے باندھ دے اور دوسرا تنے کے اندر لٹکا دے تاکہ راقم اس کے سہارے سے باہر آسکے چنانچہ یہی کیا گیا اور کوئی ایک گھنٹے بعد راقم اس تنگ نائے سے باہر نکلا لیکن گرنے اور نکلنے کے دوران میں چہرے، بازوؤں اور ٹانگوں پر اس قدر خراشیں آئیں کہ سارا جسم لہولہان ہو گیا اور کپڑے پھٹ گئے۔ ہم دوست اپنی حماقت پر افسوس کرتے ہوئے گھر کو روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ دن اور یہ دن ہم نے کبھی پارس کا خیال بھی نہ کیا اور نہ وہ کتاب کہیں نظر آئی ہے اور نہ اس "فتنۂ دوریا" پر اعتبار ہی باقی رہ گیا ہے۔

(مولانا عبدالمجید سالک کا لڑکپن " آتش زیرپا" آغا شیدا کاشمیری کی کتاب سے اقتباس)

رم جھم برسات اور اس کی بیماریاں

صغیرہ بانو شیریں

چھوٹی چھوٹی باتیں، بڑے بڑے فائدے.........کارآمد ٹپس!

برکھا رت آئی۔ پہلے زمانے میں جہاں بارش کا چھینٹا پڑا، گھر کے اندر خواتین نے کڑھائی چڑھا کر پکوڑوں کا انتظام سنبھالا۔ پکوڑے، گلگلے تلے جا رہے ہیں۔ آم بالٹیوں میں ٹھنڈے پانی میں دھو کر ڈال رہے ہیں۔ برسات کا عجب ہی لطف تھا مگر اب تو برسات کے ساتھ ساتھ بیماریاں بھی آتی ہیں۔ برسات میں زکام، فلو، ٹائیفائیڈ، دمہ، ہیضہ اور معدے کی خرابیاں، جسم کا درد، بھوک کا نہ لگنا اور









اب تو سب سے زیادہ مچھروں کا مسئلہ ہوتا ہے۔ڈینگی بخار سے سب گھبراتے ہیں۔ ہمارے ہاں صفائی کا نظام ناقص ہے جگہ جگہ پانی ٹھہر جاتا ہے۔ گندے پانی میں مچھروں کی افزائش ہوتی ہے۔ کیڑے، مکوڑے، حشرات الارض بھی ایسا لگتا ہے پانی کے ساتھ اُبل پڑے ہیں۔آلودہ پانی صحت اور صفائی کی طرف سے لاپرواہی ہیضہ کی بیماری پیدا کرتی ہے۔ معدے کی سوزش اور انتڑیوں میں ایک جرثومہ کی وجہ سے ہیضہ ہوتا ہے۔پانی کی طرح دست آتے ہیں جس سے جسم کا پانی تیزی سے ختم ہونے لگتا ہے۔ بروقت طبی امداد نہ ہو تو مسئلہ خراب ہو جاتا ہے۔ پیٹ میں درد ہو مروڑ ہوتے آرہی ہو کمزوری بڑھ رہی ہو تو فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ پانی پینا چاہیے۔ کولا مشروبات کے بجائے صاف پانی استعمال کریں۔ کھانا سادہ اور تازہ زود ہضم کھائیں۔ باسی کھانے، گلے سڑے پھلوں' بازاری چٹ پٹے کھانوں سے مکمل پرہیز کریں۔ مکھیاں جس کھانے پر بیٹھ جائیں وہ اسے خراب کر دیتی ہیں۔ ڈھانک کر چیزیں رکھیے۔ پھل اگر تھوڑا سا بھی خراب ہے تو گلا ہوا حصہ نکال کر پھینکنے کے بجائے پورا پھل ضائع کریں۔ صحت کا دھیان رکھیے۔ کہنے کو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں مگر ان پر عمل کیا جائے تو انسان بہت سی بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ برسات میں بارشیں ہوتی رہتی ہیں۔ سبزہ گھاس پھوس تیزی سے بڑھتا ہے۔ گھاس اور خودرو پودوں میں نمی کی زیادتی سے پولن کا اخراج بڑھ جاتا ہے۔ گلے ناک اور دمہ کے بیمار لوگوں کو سانس لینے میں دقت ہوتی ہے۔ پولن الرجی سے بے شمار لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ماحولیاتی آلودگی سے الرجی ہوتی ہے۔ ہسپتال میں ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو الرجی کا شکار ہوتے ہیں۔

برسات میں عموماً ہیضہ' اسہال' پیٹ درد' معدہ کی تکالیف' ہماری اپنی بد پرہیزی کی وجہ سے ہوتی ہیں' بچے ہیضہ سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ خصوصاً گاؤں اور دیہات میں تو وبا کی طرح یہ بیماری پھیلتی ہے۔ صاف ستھرا پانی نہ پینے سے یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ گندے باسی کیڑے زدہ پھل، باسی کھانا اور احتیاطی تدابیر سے ناواقف ہونے کی بناء پر بے شمار بچے ہیضہ سے مر جاتے ہیں۔ گندا پانی صحت کے لیے مضر ہے۔ برسات کے موسم میں پانی صاف ستھرے برتن میں اُبال کر ٹھنڈا کر کے پئیں۔ اس سے جسم میں پانی کی کمی نہیں ہوتی۔ بلڈ پریشر نارمل رہتا ہے۔ قبض بھی نہیں ہوتا اور پیشاب کھل کر آتا ہے۔

مکھیوں کی بھرمار

برسات میں مکھیاں بہت نظر آتی ہیں۔ آپ اپنے گھر میں خصوصاً کچن میں صفائی کا خاص خیال رکھیے۔ صبح شام فینائل سے فرش دھویئے۔ کوڑے کی باسکٹ ڈھانک کر رکھیے۔ پھلوں کے چھلکے ادھر اُدھر نہ ڈالیے۔ ان پر زیادہ مکھیاں آتی ہیں۔ بازار سے تھوڑا سا لیونڈر کا تیل خرید لائیے۔ اسفنج کا ایک ٹکڑا لیجیے۔ شیشے کی پلیٹ میں اسفنج کے ٹکڑے کو کھولتے گرم پانی میں بھگو کر پلیٹ میں رکھیے اور اس پر آدھا چمچہ لیونڈر کے تیل کا ڈالیے۔ اس سے سارا کچن خوشبو سے مہک جائے گا۔ دن میں دوبار گرم پانی سے اسفنج کو بھگویئے۔ ہفتہ میں صرف ایک بار لیونڈر کا تیل ڈالنا ہے۔ مکھیاں نہیں آئیں گی۔ پودینہ کا گلدستہ بنایئے دس بارہ ٹہنیاں پودینہ کی لے کر کسی گلدان یا گلاس میں لگایئے۔ پودینہ کی ٹہنیاں پانی سے دھو کر لگانی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ کچن میں جب بھی ٹاکی لگائیں اسے پہلے فینائل یا ڈیٹول سے

دھوئیں تاکہ کیڑے مکوڑے فرش پر نظر نہ آئیں۔

لال بیگ (کاکروچ)

برسات میں گٹر بند ہو جائے یا پانی کھڑا ہو تو لال بیگ بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ان میں کچھ بڑے اُڑنے والے بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح چوہے بھی گٹر سے نکل آتے ہیں۔ یہ سب بیماریوں کی وجہ بنتے ہیں۔ بازار میں چوہے مار گولیاں ملتی ہیں آپ وہ لا کر ڈالیے۔ چوہے مر جائیں تو انہیں کسی لفافہ میں ڈال کر پھینکیں۔ اسی طرح تھوڑا سا پیپر منٹ اور اتنی ہی سفید پھٹکری باریک پیس کر ملائیں اور گھر کے ہر کونے میں چھڑکیے۔ چوہے بھاگ جائیں گے۔ مچھروں کے لیے آپ ہر ہفتہ لوبان، حرمل، کلونجی، نیم کے پتوں کی دھونی دیجیے۔ نیاز بو جسے تلسی بھی کہتے ہیں اس کے پھولوں کی ٹہنیاں گلدان میں سجایئے۔ مچھر نہیں آئیں گے۔ چھپکلیاں ہوں تو مور کا پر رکھیے بھاگ جائیں گی۔ کچن کی کیبنٹ میں اخبار کا کاغذ مت بچھایئے۔ یہ کاکروچ کو بہت پسند ہے۔ برسات سے پہلے کچن کی کیبنٹ صاف کر کے بازار سے خاکی کاغذ لا کر بچھائیں۔ بچھانے سے پہلے آپ یہاں کیوبیکس پاؤڈر ضرور چھڑکیے۔ یہ سستا اور کیڑے بھگانے کے لیے اچھا ہے۔ برساتی سفید لمبے کیڑے، چیونٹے وغیرہ نہیں آئیں گے۔ کاکروچ کے لیے آپ بازار سے بورک پاؤڈر خریدیے۔ ایک کپ بورک پاؤڈر، ایک کپ پسی چینی، ایک کپ میدہ اور ایک کپ خشک دودھ ملا کر اس میں تھوڑا سا پانی ڈال کر بیر جتنی گولیاں بنایئے۔ کچن میں الماریوں میں یہ گولیاں رکھیے کاکروچ نہیں تنگ کریں گے۔

ڈھائی مہینہ بعد نئی گولیاں بنا کر رکھ دیں۔

چینی کے ڈبہ میں چیونٹیاں گھس جاتی ہیں۔ باریک باریک منفی مخلوق بہت تنگ کرتی ہے۔ چینی کے ڈبہ میں چھ سات ثابت لونگ ڈالیے۔ چیونٹیاں نہیں آئیں گی۔ بعض دفعہ نمک دانی کے سوراخ برسات میں سیلن اور نمی سے بند ہو جاتے ہیں۔ نمک دانی میں تھوڑے سے ثابت چاول چٹکی بھر ڈالیے۔ سوراخ بند نہیں ہوں گے۔ آٹے کے کنستر کو ڈھانک کر رکھیں اس میں تیز پات کے چند پتے ڈال دیں تاکہ برسات میں کیڑا۔ سسری نہ لگے۔ آٹا خراب نہ ہو۔

برسات میں یہ چیزیں ضرور گھر میں رکھیے۔

او۔ آر۔ ایس (نمکول) کے پیکٹ، سونف، پودینہ، چھوٹی الائچی، لیموں، ہرا دھنیا، پودینہ، اسبغول کا چھلکا، شہد، اجوائن، پھلوں کا مربہ، ہمدرد کی قلوم، انار دانہ، سفید زیرہ، ادرک وغیرہ گھر میں ضرور رکھیے۔ برسات میں ماحول کی آلودگی بڑھ جاتی ہے۔ آپ لوگ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ ہرا دھنیا گھر میں لگانے سے کافی حد تک آلودگی کم ہو جاتی ہے۔ پہلے لوگ گھروں میں ہرا دھنیا پودینہ ضرور کیاریوں میں لگاتے تھے۔ اب یہ جدید تحقیق بھی ہرے دھنیے کی کاشت پر زور دے رہی ہے۔ تاکہ ماحول صحیح رہے اور آلودگی ختم ہو جائے۔ ہرا دھنیا کھانے کا جزو ہے۔ اس کی چٹنی لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ ہرا دھنیا یا خشک دھنیا پیس کر تھوڑے سے پانی میں اس کا رس ملا کر پینے سے قے رک جاتی ہے۔ اسی طرح حاملہ خواتین بھی قے کے لیے برسات میں اسے لے سکتی ہیں۔ پودینہ کے پتے پیس کر لیموں کا رس ڈال کر کھانے سے بھی متلی رک جاتی ہے۔ برسات میں دل متلائے تو فوراً ٹھنڈے پانی کے گلاس میں ایک لیموں نچوڑ کر چینی ملا کر گھونٹ گھونٹ کر کے پینے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اکثر خواتین لیموں کاٹ کر اس پر پسی ہوئی کالی مرچ کا سفوف اور چینی اچھی طرح لگا کر چوستی ہیں۔ اس سے بھی متلی کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔ صرف نمک کالی مرچ، لیموں کے

ٹکڑے پر لگا کر چوسنے سے فائدہ ہوتا ہے جو لوگ اپنا وزن کم کرنا چاہتے ہوں وہ ایک لیموں کا رس نیم گرم پانی کے ایک گلاس میں ڈالیں۔ تھوڑا سا شہد بھی ملا سکتے ہیں۔ اس سے چربی آہستہ آہستہ کم ہوتی ہے۔ شیشے کے پیالے میں دو لیموں کا رس نچوڑیے اور اتنا ہی پیاز کا رس ملایئے۔ چینی ملایئے۔ حسب ضرورت انگلی سے تھوڑا تھوڑا چاٹنے سے قے اور متلی میں فائدہ ہوتا ہے۔ گھریلو خواتین برسات کے موسم میں لیموں کا استعمال ضرور کرتی ہیں۔ لیموں کا اچار ہری مرچ کے ساتھ ڈالا جاتا ہے۔ کھانے کے ساتھ استعمال کرنے سے ہاضمہ رہتا ہے۔

اروی بیگن ماش چنے کی دال، گوبھی آلو وغیرہ بنائیں تو اس میں آپ ادرک ضرور ڈالیں۔ پیاز کاٹ کر دھو کر اس پر ہرا دھنیا، پودینہ ہری مرچ کاٹ کر ڈالیں ہضم ہو جائے گا۔ باسی کھانا بالکل استعمال نہ کریں۔ خواتین چاول فریج میں رکھ کر دو تین دن بعد بھی استعمال کرتی ہیں۔ ایک دن سے زیادہ نہ رکھیے۔ اسی طرح آپ پھلوں کا سرکہ لیں۔ جیم کی بوتل دھو کر اس میں ایک کپ پیاز کاٹ کر ڈالیے۔ تھوڑی سی ادرک کاٹ کر ملایئے۔ ہری مرچ دو عدد کاٹ کر ڈالیے اور ایک یا دو چھوارے کاٹ کر ملایئے۔ نمک ڈال کر کھانے کی میز پر رکھیے۔ سرکہ ہاضم ہے۔ برسات میں استعمال کیا جائے تو پیٹ ٹھیک رہتا ہے۔ سرکہ جیم کی بوتل میں اتنا ڈالیے کہ پیاز سے ایک انچ اوپر رہے۔ دال کے ساتھ ضرور کھایئے۔ گیس، پیٹ درد نہیں ہوگا۔

اجوائن کے ننھے بیج

اجوائن کے بیج ہمارے ہاں استعمال ہوتے ہیں مچھلی فرائی بنتی ہے تو اجوائن ضرور ملاتے ہیں۔ پکوڑوں میں بھی ذرا سی اجوائن ڈالنے سے ہاضمہ رہتا ہے اور ذائقہ بھی بہتر ہو جاتا ہے۔ حال

گاڑی کو ہی چلتے پھرتے سوئمنگ پول میں تبدیل کر ڈالا

ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں پر بھی یہ بات صادق آتی ہے جن کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اپنی گاڑی کو ہی چلتے پھرتے سوئمنگ پول میں تبدیل کر ڈالا۔ اپنی گاڑی کے عقبی حصے کو پانی سے بھرا اور پھر تیز رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے سڑکوں پر خوب ہنگامہ مچایا جو پولیس کو ایک آنکھ نہ بھایا اور اب تیزی سے ان منچلوں کی تلاش جاری ہے۔

(مرسلہ: شبیر حسین۔ نارووال)

میں کی گئی امریکہ کی ایک تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ بڑھاپے کے اثرات کو اجوائن کم کرتی ہے۔ حافظہ کی قوت برقرار رکھتی ہے۔ یادداشت میں کمی نہیں ہونے دیتی۔ بھلکڑپن نہیں ہوتا بلکہ بوڑھے لوگوں کا حافظہ صحیح رہتا ہے۔ اجوائن معدے اور جگر کے لیے مفید ہے اس کا عرق بھی ملتا ہے گھریلو طور پر آپ ایک پاؤ اجوائن لیں۔ اسے صاف کریں، مٹی کنکر تنکے نکال کر کسی شیشے کے کھلے پیالے میں ڈالیں۔ اس میں پانچ تولے کالا نمک پیس کر ملائیں اور اب اس پر اتنا لیموں کا عرق ڈالیں کہ اجوائن اور نمک اچھی طرح حل ہو جائیں اور لیموں کا رس اوپر تک آجائے۔ اب اسے لکڑی کے چمچے سے دن میں دو تین بار ہلائیں لیموں کا رس خشک ہو جائے تو اور ڈال دیں۔ اس طرح پانچ دفعہ لیموں کا رس ڈالیں خشک ہونے پر پیس کر رکھ لیں۔ اجوائن اور نمک کا یہ آمیزہ پیٹ کے درد، گیس، اپھارہ کو دور کرتا ہے۔ کھانے کے بعد چٹکی بھر کھالیں تو کھانا ہضم ہو جاتا ہے۔ ایک ماشہ سے زیادہ نہیں کھانا چاہیے۔ یہ چورن مزیدار ہے اور پیٹ کی گیس کی بیماریوں میں

فائدہ مند پانی کے ساتھ کھائیے۔ اجوائن کے چند دانے کھانے سے بھوک لگتی ہے۔ پیٹ کے امراض دور ہوتے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ پیٹ کی چربی بھی کم ہونے لگتی ہے۔

برسات میں چٹنیاں ضرور کھائیے

انار دانہ کی چٹنی بنائیے۔ انار دانہ صاف کر کے چوتھائی کپ، لہسن کے چھ دانے اور ادرک کا چھوٹا سا ٹکڑا۔ پودینہ کے پتے ڈیڑھ کپ، آدھا کپ ہرے دھنیے کے پتے لیں۔ سفید زیرہ چائے کے دو چمچے ہری مرچ چھ عدد ثابت سرخ مرچ چار عدد نمک حسب خواہش لے کر چٹنی پیس کر کے رکھ لیں۔ کباب کے ساتھ پراٹھے کے ساتھ یہ چٹنی استعمال کریں۔ اس سے بھوک لگے گی ہاضمہ رہے گا۔

کیری کی چٹنی

کچے آم دو عدد چھیل کر گٹھلی نکال کر ٹکڑے کریں۔ ایک کپ پودینہ کے پتے لیں دو ہری مرچیں، تھوڑا سا نمک، سفید زیرہ، دو چائے کے چمچے ثابت لال مرچ سات عدد، لہسن کے چار دانے لے کر پیس کر رکھ لیں۔ تھوڑی سی چٹنی علیحدہ پیالے میں نکال کر ایک ٹیبل سپون چینی ملالیں۔ یہ کیری کی میٹھی چٹنی بن جائے گی اور دوسری سادہ۔ دال سبزی کے ساتھ، دال چاول کے ساتھ کبابوں کے ساتھ کھائیے۔ سوکھے آلو بخارے کی چٹنی بھی ہاضم ہوتی ہے۔ خشک آلو بخارے لے کر پانی میں پکاتے ہیں۔ چینی ملا کر اس میں چہار مغز ملاتے ہیں۔ ایک پاؤ خشک آلو بخارے میں آپ ڈیڑھ پاؤ چینی ملائیے تقریباً دو کپ پانی ہو اور اس میں ایک چمچہ چہار مغز، تھوڑی سی ادرک کاٹ کر ملائیں۔ یہ سادی چٹنی سب کو پسند آتی ہے۔

سونف

آدھ پاؤ سونف لے کر صاف کریں اور اسے فرائی پان میں ہلکا سا بھون لیجیے۔ بادامی یا سرخ نہ کریں۔ ٹھنڈا کر کے اس میں اتنی چینی ملا کر پیس کر رکھیے۔ دو تین چھوٹی الائچی کے دانے بھی ملائیے۔ بدہضمی ہو بچے کھانا نہ کھائیں تو ان کو کہیے یہ سونف کھائیں۔ مزے کی ہے، اس کے کھانے سے بھوک لگے گی۔ ثابت سونف بھون کر رکھیے۔ اس میں تھوڑے سے بادام کاٹ کر ملائیے۔ ثابت چھوٹی الائچی مصری کے چھوٹے ٹکڑے ملائیے۔ کسی خوب صورت بوتل میں بھر کر رکھیے۔ سونف بدہضمی نہیں ہونے دیتی معدے کو طاقت دیتی ہے۔ اس میں ایک ٹکڑا ناریل کا بھون کر باریک کاٹ کر ملائیں تو اس کا ذائقہ بڑھ جاتا ہے۔ سونف، الائچی، پودینہ کا قہوہ بنا کر رکھیے پیٹ کے امراض میں مفید ہے۔ دن میں تین چار بار پئیں۔ بدہضمی اور پیٹ کا مسئلہ ٹھیک ہو جائے گا۔ بچوں کے لیے سونف مفید ہے۔ تھوڑی سی سونف پیالی بھر پانی میں پکا کر رکھ کر ٹھنڈا کر کے بچوں کو دینے سے پیٹ کا درد گیس کا مسئلہ صحیح رہتا ہے۔ پودینہ کے ست کو مینتھول کہتے ہیں، فوڈ پوائزننگ میں دیا جاتا ہے۔ پودینہ اور اجوائن کا ست ملتا ہے۔ گھریلو طور پر اسے ہم وزن ملا کر دھوپ میں رکھنے سے گاڑھا سیال بن جاتا ہے۔ کچھ اس میں کافور کا ست ملاتے ہیں۔ آج کل تو ہر چیز میں ملاوٹ ہے آپ بازار سے قلوم خرید کر گھر میں رکھیے۔ خدانہ کرے برسات میں ہیضہ یا پیٹ درد قے وغیرہ ہو تو تین قطرے تھوڑی سی چینی پر ڈال کر دینے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح O.R.S دینے سے پانی کی کمی نہیں ہونے پاتی۔ کہنے اور لکھنے کو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں مگر ان کے فائدے بہت بڑے ہیں۔ آپ ان باتوں پر عمل کریں گے تو یقیناً برسات میں ہونے والی تکالیف سے بچ سکتے ہیں۔ برسات کے موسم سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں کیونکہ صحت ہے تو سب کچھ ہے۔

چھاؤں

جاوید بسام







ایک شخص کی بپتا، جسے دُور گاؤں میں ممتا کی چھاؤں میسر آ گئی تھی

ایک موڑ مڑ کر جب میں اس گلی میں داخل ہوا تو ایسا لگا جیسے کسی آبی تالاب کے کنارے آ گیا ہوں۔ پرندوں کی قیں قیں کی آوازوں سے گلی گونج رہی تھی۔ میں حیرانی سے آگے بڑھتا رہا۔ اگلا موڑ قریب ہی تھا۔ مڑنے پر تجسس تو دُور ہوا لیکن قدم بے اختیار رُک گئے۔ بسا اوقات غیر متوقع نظارہ انسان کو اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔ ایک پرانے گھر کے احاطے میں پیپل کے درخت کی چھاؤں میں بہت ساری بطخیں موجود تھیں، چھوٹی اور بڑی، بھوری اور کالی لیکن زیادہ تر دودھ کی طرح سفید تھیں، ایک طرف

ایک چھوٹا سا تالاب بھی تھا کچھ اس میں تیر رہی تھیں۔ قریب ہی ایک عمر رسیدہ فربہ عورت ایک مونڈھے پر بیٹھی انہیں بالٹی سے خوراک نکال کر کھلا رہی تھی۔ میں دلچسپی سے انہیں دیر تک دیکھتا رہا۔ گاؤں' دیہات میں عموماً ہر کوئی مرغیاں اور بطخیں پالتا ہے لیکن نہ جانے کیوں اس دن اس نظارے نے مجھے حیرت زدہ کردیا تھا۔

پھر مجھے پیاس محسوس ہوئی میں نے کہا "اماں جی! ایک گلاس پانی مل جائے گا؟"

"ہاں بیٹا" انہوں نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن پھر بیٹھ گئیں۔ میں نے دیکھا ان کے گھٹنوں پر موٹے کپڑے لپٹے تھے۔ لگتا تھا وہ جوڑوں کے درد میں مبتلا ہیں۔

"بیٹا! میرا اٹھنا مشکل ہے تم خود ہی پی لو" انہوں نے مٹکے کی طرف اشارہ کیا میں احاطے کا چھوٹا سا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ بطخیں' اجنبی کو دیکھ کر چونکیں کچھ تو ڈر کر پیچھے بھاگیں اور کچھ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور بہادری سے گردن نیچے کیے مجھ پر چڑھ دوڑیں۔ اماں جی نے کوئی مخصوص آواز نکالی تو وہ رُک گئیں۔ میں نے مٹکے سے پانی نکالا "بیٹھ جاؤ بیٹا" انہوں نے دوسرے مونڈھے کی طرف اشارہ کیا' میں اس پر بیٹھ گیا۔

وہ اپنے کام میں لگی تھیں کبھی بطخوں سے باتیں کرتیں تو کبھی انہیں ڈانٹنے لگتیں۔ پھر انہوں نے پوچھا "کیا شہر سے آئے ہو؟" "جی" میں نے کہا۔ اس کے بعد انہوں نے اور کچھ نہ پوچھا شاید کچھ اور پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر وہ بمشکل اٹھیں اور بولیں "اس کانے سردائی بطخ کو پکڑنے میں میری مدد کرو گے" میں نے کہا "آپ بیٹھیں میں پکڑتا ہوں"۔

اس لنگڑی بطخ نے مجھے پورے احاطے میں نچایا اور مشکل سے پکڑی گئی۔ میں ہانپتا ہوا اسے ان کے پاس لے آیا "ذرا مضبوط پکڑ لگتا ہے تم نے کبھی کوئی جانور نہیں پکڑا" وہ بولیں۔

میں زیرلب مسکرایا کیونکہ یہ حقیقت تھی میں نے بچپن میں چند چوزوں اور طوطوں کے علاوہ کبھی کوئی جانور نہیں پالا تھا۔ انہوں دوائی نکالی اور بولیں "اس کی داہنی ٹانگ آگے کرو" یوں میں نے دوا لگانے میں ان کی مدد کی۔

"سبز چائے پیا کرو، نزلے کو فائدہ دیتی ہے" انہوں نے کہا۔

میں نے سعادت مندی سے گردن ہلائی، کچھ دیر اور وہاں بیٹھا اس ماحول سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر سلام کرکے باہر نکل گیا۔

میرا پیشہ قدیم دور کے سوداگروں جیسا ہے۔ بعض چیزیں میں شہر سے گاؤں اور قصبوں میں لے جاتا ہوں اور بعض چیزیں وہاں سے شہر لے آتا ہوں۔ اس اول بدل سے جو یافت ہوتی ہے اس سے میرا گزارہ ہوتا ہے۔ وہاں میں کافی عرصے سے جارہا تھا۔ ایک دکاندار سے میری اچھی نبھ رہی تھی۔ مہینے میں ایک بار میرا وہاں ضرور چکر لگتا تھا۔ سٹیشن سے نکل کر میں پیدل بازار تک جاتا۔ آج اتفاق سے اس گلی میں جانکلا تھا۔ دکاندار کا نام عبدالکریم تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے "مرحبا یا اخی!" کا نعرہ بلند کیا اور اُٹھ کر گلے ملا "آؤ بیٹھو! آج تو منہ پر رونق نظر آرہی ہے لگتا ہے سفر اچھا کٹا ہے؟"۔

میں نے سامان کا تھیلا اسے دیتے ہوئے کہا "سفر تو جیسا کٹتا ہے ویسا ہی کٹا البتہ تمہارا گاؤں بہت اچھا ہے"۔

"گاؤں تو تم بہت عرصے سے دیکھ رہے ہو آج کیا نیا دیکھ لیا؟"

میں نے اسے اماں جی کا بتایا "اچھا ام بطہ کی بات کررہے ہو میں نے بھی انہیں ہمیشہ بطخوں کے

درمیان دیکھا ہے۔" کریم کو عربی زبان سے بہت دلچسپی تھی ایک موٹی لغت ہر وقت اس کے پاس ہوتی تھی، فرصت میں وہ اسے پڑھتا رہتا تھا۔

"مجھے ان کے بارے میں بتاؤ" میں نے کہا۔

"بس اخی! وہ بیچاری اکیلی ہے۔ ایک بیٹا فوج میں تھا۔ غیروں کی جنگ میں اپنوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب وہ بطخیں ہی اس کی دوست اور معاشی سہارا ہیں"۔

اس دن کے بعد میں جب بھی اس گاؤں میں جاتا میرے قدم از خود اس گلی کی طرف اٹھ جاتے۔ وہ ہمیشہ اسی طرح بیٹھی نظر آتیں۔ میں سلام کرکے موڑھا سنبھال لیتا بطخیں اب مجھے پہچاننے لگی تھیں۔ اماں جی پوچھتیں! "اور سناؤ تمہارا شہر کیسا ہے؟"۔

"ویسا ہی بگ ڈٹ بھاگتا ہوا، بیمار بیمار سا" میں جواب میں دیتا۔ "بیمار تو نہیں بھاگتے" وہ مسکرا کر کہتیں۔

میں خاموش ہو جاتا۔ شہروں کے بارے میں میری سوچ دوسروں سے الگ تھی۔ وہاں کی مصروف زندگی مجھے پسند نہیں تھی۔ وہ بھی چپ سادھ لیتیں۔

انہوں نے میرا کام، میرے حالات یہاں تک کہ کبھی میرا نام بھی نہیں پوچھا۔ میں بھی ان سے ذاتی سوالات نہیں کرتا تھا۔ وہ مجھے چھوٹے سے کپ میں سبز چائے پلاتیں۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہتا پھر سلام کرکے اُٹھ جاتا۔ وہ لمحات جو میں اس گھر میں گزارتا تھا میرے اندر نئی ہمت اور تازگی بھر دیتے۔ تصنع اور خود غرضی سے پاک اس کچے صحن میں ایک الگ دنیا آباد تھی۔ جتنی دیر میں وہاں رہتا اپنے خوف، فکریں اور اندیشے بھلا دیتا۔ میرا دل مسرتوں سے لبریز ہو جاتا اور واپس آنے کے بعد بھی کئی دنوں تک میں خوشی اور خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا تھا۔

ایک دن میں وہاں بیٹھا تھا وہ بولیں "یہ بطخ کے دو چوزے لے جاؤ تمہارے بچے کھیل لے گے"۔ ان کی نظریں میرا چہرہ ٹٹول رہی تھیں۔

"جی...... کھیل تو لیں گے لیکن میں انہیں رکھوں گا کہاں؟" میرے چھوٹے سے فلیٹ میں نہ دھوپ آتی ہے نہ ہوا!" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش ہو گئیں پھر کچھ دیر بعد بولیں "کبھی بال بچوں کو ملانے کے لیے لے آؤ"۔

"جی کسی دن لاؤں گا" میں نے کہا لیکن وہ دن کبھی نہ آسکا۔ ایک روز کریم کے پاس بیٹھا باتیں کررہا تھا کہ میرے منہ سے بے اختیار نکلا "میں گاؤں میں آکر رہنا چاہتا ہوں"۔

"ماشاء اللہ یا اخی! ایسا ہرگز نہ کرنا، لوگ شہروں کو جا رہے ہیں اور تم شہر سے بھاگ رہے ہو" وہ تیزی سے بولا۔

میں حیران تھا کہ یہ بات میرے منہ سے کیسے نکل گئی، میں نے کبھی یہ بات نہیں سوچی تھی۔ شاید

اچھی باتیں

☆ سمجھوتہ کرنا سیکھو، کیونکہ تھوڑا سا جھک جانا کسی رشتے کو ہمیشہ کیلئے توڑ دینے سے بہت بہتر ہے۔

☆ لفظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر صرف بولنے سے پہلے تک، بولنے کے بعد انسان اپنے لفظوں کا غلام بن جاتا ہے۔

☆ دُکھ انسان کے مرنے سے نہیں ہوتا بلکہ اپنائیت، محبت اور خلوص کے رشتوں کے ٹوٹ جانے کا ہوتا ہے۔

☆ ایک دیوتا کے سامنے سو سال تک سر جھکائے کھڑے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ ایک پرہیزگار شخص کی صحبت میں تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔

☆ الفاظ اپنے اندر بڑی تاثیر رکھتے ہیں۔ یہ کبھی شعلہ اور کبھی شبنم کبھی زخم تو کبھی مرہم بن جاتے ہیں۔ کبھی زندگی میں رنگ بکھیرتے ہیں تو کبھی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں۔

(ایس۔ امتیاز احمد۔ کراچی)

میرے لاشعور میں کہیں موجود تھی جو اچانک زبان پر آگئی۔ بہت عرصے تک میں وہاں اسی طرح جاتا رہا۔

ایک دن جب میں وہاں گیا تو گلی میں قدم رکھتے ہی چونک پڑا۔ میرے کان وہاں آتے ہی آوازوں کے عادی ہوچکے تھے لیکن اس دن وہاں خاموشی طاری تھی۔ موڑ مڑ کر دیکھا تو احاطہ خالی پڑا تھا۔ ایک بھی بلخ وہاں نہیں تھی۔ میں حیران و پریشان کھڑا تھا کہ سامنے کوٹھری سے ایک ادھیڑ عمر عورت باہر آئی۔ میں نے اسے اکثر پڑوس کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اماں جی کہاں ہیں؟ اس نے کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ میں جھجکتا ہوا اندر چلا گیا۔ مدھم روشنی میں وہ جھلنگا سی چارپائی پر بیمار پڑی تھیں۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور بولیں "آگئے...... تمہارا شہر کیسا ہے؟" "آپ بتائیں آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"۔

"بس اللہ کا شکر ہے" وہ دھیرے سے بولیں۔

"دوائی لی ہے؟"، "ہاں لی ہے"، "شہر چلیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں گے"۔ "تم تو کہتے تھے کہ شہر بیمار ہے" انہوں نے ہنسنے کی کوشش کی۔

"چھوڑیں، میرے ساتھ چلیں" میں نے کہا۔

"نہیں...... نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولیں۔ میں نے بہت ضد کی لیکن وہ نہیں مانیں، میں نے بلخوں کا پوچھا "وے دیں...... انہیں تو دینا ہی تھا" انہوں نے چہرہ گھماتے ہوئے کہا۔ میرا دل بوجھل ہو رہا تھا میں وہاں سے اٹھ کر کریم کے پاس چلا گیا۔ کریم نے بتایا کہ انہوں نے بیوپاری کو بلا کر تمام بلخوں کا سودا کر دیا مکان بھی انہوں نے ایک فلاحی ادارے کو دے دیا ہے۔

"لیکن کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ بولا "اخی...... ام بلہ چپش بلنہ ہیں، انہیں چاپ سنائی دینے لگی ہے"۔

"کیسی چاپ؟" میں نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

"بچے نہ بنو، وہ ستر سال سے اوپر کی ہیں"۔

میں اس سے نظر چرا کر باہر دیکھنے لگا۔ اس نے اپنی لغت اٹھائی اور کوئی لفظ تلاش کرنے لگا۔

اس واقعہ جب میں وہاں گیا تو راستے میں بارش شروع ہوگئی۔ سامان زیادہ تھا۔ ریل سے اتر کر میں سیدھا کریم کے پاس پہنچا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خاموش ہے اور مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا۔ سامان کا حساب کرکے جب ہم فارغ ہوئے تو میں نے پوچھا "کیا حالات ہیں" اس نے دھیرے سے کہا "یا اخی! ام بلہ کا انتقال ہوگیا"۔ میرے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ مجھے ان سے پچھلی ملاقات یاد آرہی تھی۔ کریم نے مجھے ادھر اُدھر کی باتوں میں لگانے کی کوشش کی لیکن میں نے دلچسپی نہیں لی۔ پھر میں وہاں سے اٹھ گیا "ادھر جاؤ گے؟" اس نے پوچھا۔

"شاید" میں نے کہا اور سلام کرکے چل دیا۔

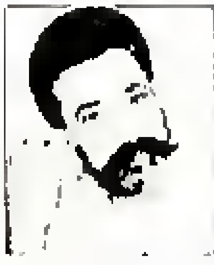
میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے قدم ایک بار پھر مجھے وہاں لے آئے۔ آج بھی گلی سنسان پڑی تھی، کوئی آواز نہ تھی، کوٹھری میں پرانا زنگ آلود تالا لگا تھا۔ خالی صحن میں سوکھے پتے ہوا سے اُڑتے پھر رہے تھے۔ مونڈھوں پر گرد جمی تھی۔ احاطے کی دیوار پر ایک کوا خلاف عادت خاموش بیٹھا گردن گھما گھما کر جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری بے چینی لگا ہیں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں، اچانک مجھے لگا کہ گرمی کی شدت بڑھ گئی ہے۔ سورج نیچے چلا آیا ہے اور وہ چھتنار درخت کٹ کر گر چکا ہے۔ جس نے دوڑتی اور جھلستی زندگی میں کچھ دنوں کے لیے مجھے اپنے سایے میں لے لیا تھا۔ جب میرے پیر وجود کا بوجھ اٹھائے احتجاج کرنے لگے تو میں بوجھل قدموں سے گلی پار کر گیا۔





موہنجوداڑو کی تصویری تحریریں

ماہرین ابھی تک ان تصویری تحریروں کو پڑھنے سے قاصر ہیں!



عارف محمود اپل

برصغیر میں قبل از مسیح کا انسان کس طرح زندگی بسر کرتا تھا ؟ اس بات کا اندازہ صدیوں پرانی تہذیب "موہن جوداڑو" سے لگانا قطعاً مشکل نہیں۔ یہ پاکستان میں آثار قدیمہ کی ایک عظیم نشانی ہے۔ اگر لفظی اعتبار سے اس کا ترجمہ کیا جائے تو موہن ایک نام اور داڑو کا مطلب قلعہ ہے۔ یعنی موہن کا قلعہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس شخص نے اس علاقے میں کسی وقت میں حکومت کی اُس کا نام موہن تھا اور اسی کے نام کی نسبت سے یہ علاقہ موہنجوداڑو کے نام سے مشہور ہوگیا۔ موہنجوداڑو ایک ایسی جگہ ہے، جہاں قدیم وادی سندھ کی تہذیب کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔

موہنجوداڑو کا علاقہ تقریباً 2500 قبل مسیح میں آباد ہونا شروع ہوا۔ اگرچہ اس ابتدائی سوسائٹی کی وہ

فہرست، جس میں دنیا کے محفوظ ترین آثار قدیمہ کے نام درج ہیں، اُن میں موئنجودڑو کا نام سرفہرست ہے۔ 20 ویں صدی کے آغاز میں ایک انگریز سرجان مارشل نے اس جگہ کی کھدائی کروانا شروع کی۔ کھدائی کے بعد یہاں سے ایک مکمل شہر دریافت ہوا جو آج ہر کسی کی زبان پر موئنجودڑو کے نام سے مشہور ہے۔ سرجان مارشل نے اس علاقے کی کھدائی کے آغاز کے وقت ہی یہ کہہ دیا تھا کہ یہاں کسی زمانے میں کوئی ایسی بستی قائم تھی جہاں لوگ اس طرح روزمرہ زندگی کے امور نمٹاتے اور زندگی گزارتے تھے جیسے آج لوگ زندگی گزار رہے ہیں۔ اس شہر کی کھدائی کے دوران بے شمار تصویری تحریریں بھی ملی ہیں مگر بے حد کوششوں کے باوجود ماہرین ان تصویری تحریروں کو مکمل طور پر سمجھنے اور اُن کا مفہوم اخذ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

آج بھی موئنجودڑو کے عجائب گھر میں سرجان مارشل کے زیر استعمال گاڑی کھڑی ہے جو انہوں نے علاقے کی کھدائی کے دوران استعمال کی۔ موئنجودڑو کی کھدائی کے بعد اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس علاقے میں باقاعدہ گھر، کوٹھیاں اور گلیاں بنی ہوئی تھیں جو اب بھی اسی حالت میں قائم ہیں۔ موئنجودڑو میں رہنے والے لوگوں کی آبادی تقریباً پانچ ہزار لوگوں پر مشتمل تھی۔ یہاں لوگ ایسے گھروں میں رہتے تھے جہاں غسل خانے، صحن، برآمدے اور باورچی خانے بھی بنے ہوئے تھے۔ علاقے میں حفاظت کے لیے اس کے گرد پتھروں کی مدد سے مضبوط دیوار تعمیر کی گئی تھی۔

پینے کے پانی کے لیے باریک اینٹوں کی مدد سے بہت ہی خوبصورت کنواں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہاں لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے دو بڑے بڑے ہال بنے ہوئے ہیں۔ ہال میں داخل ہونے کے لیے اُن کے درمیان راستہ بنایا گیا ہے۔ یہ شہر دو حصوں میں تقسیم تھا، ایک بالائی حصہ اور ایک زیریں۔ بالائی حصے میں وہ لوگ رہتے تھے جو اس شہر پر حکومت کرتے تھے۔ اس حصے میں خوبصورت گھروں کے علاوہ بڑے بڑے غسل خانے بھی بنے ہوئے ہیں۔ جہاں غسل کرنے کی ہر خاص و عام کو اجازت ہوتی تھی۔ موئنجودڑو کے زیریں حصے میں عام لوگ رہائش پذیر تھے۔ اس علاقے میں گھروں کے ساتھ گلیاں بالکل 90 ڈگری کے زاویے پر بنائی گئی تھیں۔ جن کی زیادہ سے زیادہ لمبائی 35 فٹ تھی۔ اس کے بعد ایک دوسری گلی شروع ہو جاتی تھی۔ گلیوں کے ساتھ ہی نکاسی آب کے لیے نالیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ موئنجودڑو میں نکاسی آب کے لیے بنائے جانے والا سسٹم اس وقت کے لحاظ سے ایک جدید اور بہترین سسٹم تھا جس کی مثال آج کے زمانے میں بھی نہیں ملتی ہے۔

اگر موجودہ دور کے نکاسی آب کا مقابلہ اس زمانے سے کیا جائے تو اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ موئنجودڑو کا نکاسی آب کا نظام زیادہ بہتر ہے۔ یہاں پتھر کے چوکور ٹکڑوں سے گھر تعمیر کیے گئے تھے۔ جن میں کھلے روشن دان بھی ہوتے تھے۔ اُن میں سے کچھ گھر تو بہت بڑے تھے اور کچھ کا سائز درمیانہ تھا۔ اُن میں اکثر گھروں پر باقاعدہ پلستر بھی ہوا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ اب بالکل ختم ہو چکا ہے۔ موئنجودڑو کے بارے میں لوگوں کی متضاد آراء ہیں کچھ کا کہنا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا، جس سے یہ پورا کا پورا شہر تباہ ہو گیا تو کسی کا کہنا ہے کہ اس علاقے میں ایک بہت بڑا زلزلہ آنے کی وجہ سے یہاں پر آباد تمام لوگ ہلاک ہو گئے۔ ماہرین کے نزدیک موئنجودڑو آج بھی ایک معمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماہرین ابھی تک یہ جان نہیں پائے کہ اعلیٰ تہذیب و تمدن کا گہوارہ "موئنجودڑو" کیوں کر تباہ ہوا؟

یک درگیر

اشرف صبوحی



اُجڑے دیار کی کہانی، اُردو کے نام ور ادیب اشرف صبوحی کی زبانی

جنوں والی مسجد کے حاجی صاحب کو جانتے ہو؟ وہ جھاڑا پھونکی کرتے ہیں، نہ تعویذ گنڈا۔ کوئی پچیس برس ہوئے جب انہوں نے اس مدتوں کی غیر آباد مسجد میں ڈیرا جمایا تو دس پانچ ہی دن میں وہ شہرت ہوگئی تھی کہ ہر وقت عورتوں اور مردوں کا تانتا لگا رہتا۔

جنوں کی مسجد کے متعلق ہزاروں روایتیں مشہور تھیں کہ فلاں عامل نے چلّہ کھینچنا چاہا، آدھی رات نہ گزری تھی کہ کسی نے گردن مروڑ دی۔ لوگوں کو دن دہاڑے

وہاں جن دکھائی دیتے تھے۔ ایسی جگہ کوئی آکر ٹھہرتا اور سلامت رہتا تو اس کے کامل ہونے میں کیا شک ہوسکتا تھا لیکن حاجی صاحب نے ایک کو منہ نہیں لگایا۔ اوّل تو کسی سے بات ہی نہ کرتے پھر اگر کوئی زیادہ سر ہوتا تو وضو کر، نماز پڑھنے لگتے یا کہیں نکل جاتے اس لیے رفتہ رفتہ آنے والوں نے بے فیض سمجھ کر اُن کے پاس آنا چھوڑ دیا اور یہ جب تک زندہ رہے خدا کی یاد کے سوا کسی نے کبھی کوئی شغل کرتے نہیں دیکھا۔ کھانے پینے کا سامان تھا؟ اس کا بھی کسی کو پتہ نہیں چلا۔ کب مرے؟ اس کی خبر نہیں۔ ہاں کئی برس ہوئے مسجد کے صحن میں ایک پختہ قبر بنی ہوئی ضرور دیکھی گئی کہ پہلے نہ تھی۔ قبر حاجی صاحب کی ہے یا کسی اور کی، اور اگر انھی کی ہے تو کس نے دفن کیا؟ خدا ہی خوب جاننے والا ہے۔

اچھا تو یہ حاجی صاحب کون تھے؟ ڈوم بچے، چاندنی محل کے رہنے والے، محبوب نام تھا۔ امیر خاں قوال کا بیٹا۔ امیر خاں کی جوانی تو رنڈیوں کی استادی میں گزری چکنا چپڑا سانولا سلونا ناک نقشے کا درست لڑکا تھا۔ آواز میں بھنبیری تھی، گلے کے ساتھ آنکھیں کچھ اس طرح چلتیں کہ صوفیوں کی رال ٹپکنے لگتی یہاں تک کہ تھوڑے ہی دن میں محبوب صوفیوں کا ایمان مشہور ہوگیا۔

محبوب کی عمر کوئی چودہ پندرہ برس کی ہوگی کہ امیر خاں کا انتقال ہوگیا۔ قوالوں کی دوسری چوکیوں نے اسے اپنے ساتھ ملانا چاہا اور یہ دو برس کے قریب کئی چوکیوں کے ساتھ عرسوں میں جاتا بھی رہا لیکن اسے بہت جلد ان صوفیوں سے نفرت سی ہوگئی۔ جس کو حال آتا، وہ اچھلتا ناچتا اسی پر آ گرتا۔ آخر ان داڑھیوں کے ہجوم سے نکل کر اس نے طوائفوں کے ہاں جانا شروع کردیا۔ ہر جگہ کھلے چھپے سارنگیے عموماً اسی کے بھائی بند تھے۔ پھر وہ جو کہتے ہیں کہ مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے۔ اگرچہ محبوب نے نہ باقاعدہ گانا سیکھا تھا، نہ بجانا لیکن اس کی گھٹی میں تو یہی چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ استاد نہ سہی امیر خاں کا بیٹا سمجھ کر سب اس کی خاطر کرتے۔ ہرمزی ایک طوائف اس کے باپ کی شاگرد تھی۔ رنڈیاں عمر سے اتر کر عموماً مرد پرست ہو جاتی ہیں۔ محبوب کا اٹھتا شباب تھا۔ اس کی جو نظر پڑی، بلائیں لینے لگی، محبوب کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اچھے سے اچھا کھلاتی اور کپڑے لتے سے ایسا بنا سنوار کر رکھتی کہ نوچیاں تک جلنے لگیں۔

ادھیڑ عمر کا اٹھتی جوانی سے کیا میل۔ اُدھر تو محبوب کو قدرتی طور پر ہرمزی کی لگاوٹ بازیاں پسند نہ تھیں، اُدھر بندی جو ہرمزی کی لے پالک تھی۔ وہ بیچ میں آ کودی۔ محبوب اور بندی میں وہ سہاگ بڑھا کہ بی ہرمزی جان آخر صبر نہ کرسکیں۔ پہلے تو دونوں کو الگ الگ اپنے اپنے طریق پر سمجھایا جب سمجھانے سے کام نہ بنا تو ایک دن چولہے میں سے جلتا ہوا سوختہ نکال لائی اور بندی سے کہنے لگی توبہ کر، نہیں تو تیری جوانی کو ابھی آگ لگائے دیتی ہوں‘‘۔

محبوب اس وقت تھا نہیں۔ بندی بے چاری نے ڈر کر توبہ کرلی محبوب آیا تو اسے بھی آنکھیں دکھائیں۔ محبوب اور بندی میں پہلے ہی سے صلاح مشورے ہو چکے تھے۔ اسی رات موقع پا کر دونوں نکل بھاگے قطب صاحب میں جا کر دونوں نے پناہ لی۔ ہرمزی نے صبح اٹھتے ہی شور مچا دیا۔ کوتوالی پہنچی رپٹ لکھوائی کہ محبوب میرا نوکر میری بیٹی بندی کو پانچ ہزار روپے کے زیورات کے ساتھ بھگالے گیا ہے۔

پولیس والے رنڈیوں کے ایسے معاملات میں رقمیں چیرنے کے سوا کبھی کچھ نہیں کرتے چنانچہ نہایت معمولی تفتیش کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہرمزی رو پیٹ کر بیٹھ رہی اور وہ دونوں مہرولی میں

چھپے مزے اُڑایا کیے۔

مہرولی کی بستی میں آئے پورے بارہ مہینے ہوگئے تھے۔ بندی ایک پوٹلی میں کچھ زیور ضرور لائی تھی لیکن خالی بیٹھے بیٹھے قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جائے۔ دوسرے چونکہ ابھی ان دونوں میں میاں بیوی کا پکا رشتہ قائم نہیں ہوا تھا جو آئندہ زندگی بسر کرنے کے لیے کوئی دھندا کر بیٹھتے اس لیے دونوں وقت اچھا کھاتے اور گھر کے اندر ہی پڑے پڑے طبلہ ہارگاتے رہتے۔

[illegible] انھی دنوں میں ایک روز رنڈی کو [illegible]سی سے [illegible] کر دیا۔ محبوب اور بندی ناسمجھ بچے تو تھے نہیں جو اس واردات کو اس کان سنتے اور اُس کان اُڑا دیتے۔ دونوں سوچ میں پڑ گئے کہ ہماری حرام کاری کا انجام دیکھیے کیا ہوتا ہے کیونکہ جوں جوں رقم کم ہوتی جاتی تھی اور ساتھ ہی عیش سے دل بھرتا جاتا تھا۔ ایک کو دوسرے کے ساتھ دلچسپی کم ہوتی جاتی تھی۔ دوسرے تیسرے دن یوں ہی ذرا سی بات پر کھٹ پٹ ہونے لگی۔ آخر ایک دن محبوب نے کہا "دیکھو بی! اس رات دن کے کھولنے اور جلانے سے کیا فائدہ، میرے ساتھ نباہ نہیں کرسکتیں تو اپنا رستہ لو"۔

بندی بولی "میاں! ہوش کی دوا لو! اندر باہر سے لوٹ کر اب رستہ دکھاتے ہو مجھے نباہ نہ کرنا ہوتا تو تمہارے ساتھ آتی کیوں۔ تم اپنی کہو مجھے دوزخ کے دروازے میں دھکیل کر اگر تمہیں کہیں جنت مل جائے تو شوق سے میرا پاپ کاٹ دو"۔

محبوب کی فطرت بُری نہ تھی۔ بندی کی ان باتوں سے اُس پر بڑا اثر ہوا اور کچھ کہے سنے بغیر باہر نکل گیا۔ بندی کچھ اور بکی لیکن خود بخود اسے ایک قسم کی تسکین سی ہوگئی کہ محبوب ایسا بے مروت نہیں۔ میں نے اسے کیا دُکھ دیا ہے جو وہ مجھے اس طرح چھوڑا۔ یہ پر چھوڑ کر کہیں چلا جائے گا اور گھر کے دھندوں میں [illegible]ی۔

اگر طبیعت میں کھوٹ نہیں اور دل کا آئینہ صاف ہے تو دوسرے کی صورت کچھ دھندلی نظر آتی ۔ بندی نے چونکہ محبوب کے ساتھ اب تک کسی قسم کی بے وفائی یا محبت میں کوتاہی نہیں کی تھی اس لیے اُسے یقین تھا کہ وہ بھی میری ناقدری نہیں کرے گا اور درحقیقت محبوب کے خیالات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے سوا کہ وہ کبھی کبھی یہ سوچا کرتا کہ آئندہ زندگی بسر کرنے کے لیے کیا تدبیر کرنی چاہیے؟ اسی سلسلے میں بعض اوقات اس کی طبیعت میں خلجان سا پید[illegible] ہوجاتا۔ [illegible] جس دن سے قتل ہرجری کا واقعہ ہوا تھا اس کے مزاج کی کیفیت برابر بدلتی جارہی تھی چنانچہ اب اس کے جذبات کچھ اور ہوگئے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ یا تو نکاح ہوجائے یا بالکل علیحدگی۔

محبوب پڑھا لکھا نہ تھا نہ اسے پڑھے لکھوں کی صحبت میسر آئی تھی تاہم اس کے جذبات اچھے تھے۔ آج جو بندی سے جھڑپ ہوئی اور اپنی تلخ بات کے جواب میں اس کی نیت کا حال معلوم ہوا تو وہ فوراً بستی کے قاضی صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ قاضی صاحب غیر معمولی نیک آدمی تھے۔ پڑوس میں رہنے کے سبب محبوب سے اُن کی جان پہچان بھی تھی۔ عرسوں کے موقعوں پر اسے گاتے بھی سنا تھا۔ پوچھنے لگے "کیوں میاں! کس لیے تکلیف کی؟"

محبوب نے ساری داستان کہہ سنائی اور درخواست کی کہ "آپ ہم دونوں کا نکاح پڑھا دیں"

قاضی جی بڑی خوشی سے تیار ہوگئے اور کہا کہ "جاؤ اس کو بھی نہلاؤ، آپ بھی نہاؤ، پاک کپڑے پہنو، میں ابھی آتا ہوں"۔

قصہ مختصر یہ کہ [illegible] کے بعد قاضی صاحب نے آکر پہلے دونوں سے توبہ کرائی، گناہوں سے بچنے،

نیکی کے راستے چلنے اور نماز روزے وغیرہ کی تاکید کرکے دونوں کے سر جوڑ دیئے۔ محبوب اور بندی کا نکاح ہوگیا۔ چلتے وقت قاضی جی نے یہ بھی کہا کہ حلال کی کمائی میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ گانا بجانا چھوڑ دو، کوئی اور دھندا کرو، نوکری ڈھونڈ کر سوکھے ٹکڑے کھانا حرام کی آمدنی کے قورمے پلاؤ سے بدرجہا بہتر ہے۔"

اللہ جس کو توفیق دے، قاضی جی کے کہنے کا اُن دونوں پر ایسا اثر ہوا کہ محبوب نے تو مزدوری شروع کردی اور بندی بستی میں جاتی اور چکی پیستی۔ ساتھ ہی محبوب کو نماز کی بھی لو لگ گئی۔ نماز آتی نہ تھی، قاضی جی سے پانچ سات دن میں سیکھ لی اور اب وہ پانچوں وقت مسجد میں دکھائی دینے لگا۔

لیکن مہرولی کی بستی دلی کے قریب تھی، اس کے علاوہ حضرت قطب صاحب کا مزار شریف، رنڈیاں، ڈوم، صوفی برابر آتے رہتے کچھ تو شرم کہ کسی نے مزدوری کرتے دیکھ لیا تو کیا کہے گا، کچھ یہ ڈر کہ کسی کی اگر نظر پڑ گئی تو پکڑا نہ دے اس لیے مصلحت یہ سمجھی کہ کسی ایسی جگہ چل کر رہنا چاہیے جہاں جاننے پہچاننے والا کوئی نہ ہو۔ صلاح کرکے دونوں اپنا بوریا بستر سمیٹ بلب گڑھ روانہ ہوگئے۔ بلب گڑھ پہنچ کر سرائے میں اترے پھر مکان تلاش کیا۔ مکان کے بعد ایک چرخا اور چکی خریدی۔ بندی چرخا کاتتی، چکی پیستی اور محبوب بھی ادھر اُدھر سے مزدوری کرکے کچھ نہ کچھ کما لاتا۔ پیٹ بھرنے کے لیے اس سے زیادہ کیا چاہیے۔

اتفاق سے مکان کے برابر ہی شہر کی بڑی مسجد تھی۔ محبوب ہر نماز کے وقت سویرے سے جا بیٹھتا اور اللہ اللہ کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ اذان بھی دینے لگا۔ آواز سریلی اور گلا لوچ دار تھا۔ لوگ اس کی اذان کے مزے لینے لگے اور کچھ دن بعد وہ باقاعدہ موذن

بن گیا۔ اللہ کی شان ہے، ایک ڈوم بچے کی کیا کایا پلٹ ہوتی ہیں یہ الفاظ صرف اُس کے منہ سے نکلا کرتے تھے کیسی نماز کیسا روزہ، اور اب مسجد کے سوا کہیں اس کا دل ہی نہ لگتا تھا۔ اَن جان آدمی یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ محبوب سدا کا نمازی نہیں۔ جو دیکھتا، یہی جانتا کہ کسی اچھے نمازی گھر کا لڑکا ہے۔

اسی طرح بندی کا بھی خدا نے ایکا ایک ایسا دل پھیرا کہ رنڈی پنا اس میں نام کو نہیں رہا۔ بننے سنورنے کے سارے جذبات فنا ہوگئے۔ معشوقانہ انداز جن کی تعلیم اس نے برسوں پائی تھی سب چرخے اور چکی میں صرف ہونے لگے۔ اندھیرے سے اُٹھ کر چکی پیستی پھر کھانے پکانے سے فارغ ہوکر چرخا کاتتی۔ ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے لیکن اس کی زبان سے کبھی نہ خدا کی شکایت سنی نہ قسمت کا گلہ۔ نہ اس نے ہنسی مذاق کے طور پر بھی محبوب سے یہ کہا کہ تمہارے ساتھ آکر تو میری تقدیر پھوٹ گئی، وہاں رہتی تو نہ جانے کیسی کیسی میری ناز برداریاں ہوتیں۔ چاہنے والے مجھے آنکھوں پر بٹھاتے، عطر میں نہاتی، سونے کا نوالہ کھاتی، بلکہ جب پایا مگن اپنے حال میں خوش۔ مذہب سے البتہ اسے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اوّل معلوم نہیں کہ کس کی لڑکی تھی، دوسرے جس گھر میں پلی بڑھی وہاں دین ایمان کا کیا کام۔ شراب کباب، گانے اور حرام کاری کی باتوں کے سوا نماز روزے وغیرہ کا ذکر بھولے سے بھی آجاتا ہوگا۔

محبوب کے ساتھ بھاگنے تک بندی صرف اتنا جانتی تھی کہ میں مسلمان ہوں۔ کلمہ بھی اسے یاد تھا۔ مہرولی میں آنے کے بعد روزے نماز اور اسی قسم کے دو چار دوسرے فرائض بھی اس نے پاس پڑوس کی عورتوں سے سن لیے تھے لیکن اب تک نہ رمضان میں ایک روزہ رکھا تھا نہ ایک وقت کی نماز

پڑھی تھی۔ پڑھتی کس طرح؟ نہ وضو کرنا آتا تھا، نہ یہ کہ نماز میں کیا پڑھتے ہیں۔ محبوب کو روزانہ اپنے ساتھ اٹھتا دیکھتی۔ مسجد سے اس کی اذان سنتی اور مزے لیتی۔ بہت دل چاہتا کہ خود بھی نماز پڑھے، دل مسوس کر رہ جاتی۔

اس طرح پورا سال گزر گیا۔ محبوب اب پکا نمازی تھا۔ کچھ بھی حال ہوتا کیسی ہی سردی پڑتی یا گرمی، آندھی چلتی یا مینہ برستا، وہ سارے نمازیوں سے پہلے مسجد میں جا پہنچتا۔ محبوب کے اس رنگ کا آخر بندی پر اثر پڑنا تھا اور پڑا۔ خدا کو کب تک بھولی رہتی۔ شوہر نماز کا اتنا پابند اور بیوی اتنی آزاد۔ ناممکن سی بات تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے دل میں بھی نماز کا شوق پیدا ہوا۔ ایک روز عشاء کی نماز پڑھ کر جو محبوب گھر میں آیا تو بندی کہنے لگی "اب تو تم ملاجی ہو گئے ہو۔ ایک بات پوچھتی ہوں، بتاؤ گے؟"

محبوب "نیک بخت! ملاؤں کے تو بڑے درجے ہیں، چار ٹکریں مارنے سے کوئی ملا تھوڑی بن جاتا ہے مگر خیر تم کیا پوچھتی ہو، پوچھو۔ مجھے نہیں معلوم ہوگا تو کسی دوسرے سے پوچھ کر بتادوں گا"۔

بندی "میں یہ پوچھتی ہوں کہ کیا عورت ذات کو نماز معاف ہے؟"

محبوب "نماز تو کسی کو معاف نہیں، عورت ہو یا مرد"۔

بندی "پڑوس والی سیدانی کہتی تھی کہ شادی ہونے کے بعد عورت کی نیکی بدی کا ذمے دار مرد ہوتا ہے"۔

محبوب "میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں؟"

بندی "جب تک ہم تم آشنا رہے اس کو جانے دو جیسی میں تھی، ویسے تم تھے مگر نکاح کے بعد بھی تم نے تو مجھے ویسا ہی سمجھ رکھا ہے"۔

محبوب "بات کیا ہے کھل کر کیوں نہیں کہتیں"۔

بندی "تم نے کبھی مجھ سے نماز کے لیے کیوں نہیں کہا؟"

محبوب "میں نے تو نکاح کرنے کو بھی تم سے نہیں کہا تھا"۔

بندی "اے واہ کیا کہنا میں ہی تو قاضی کو بلا کر لائی تھی"۔

محبوب "تم اکیا تمہیں گناہوں سے بچا لیا"۔

بندی "میں کب کہتی ہوں لیکن دوزخ کے دروازے کا ایک پٹ بند کر کے دوسرا تو کھلا رکھا"۔

محبوب "ایک پٹ اگر میں نے بند کر دیا تھا تو دوسرا تم بند کرلیتیں"۔

بندی "مجھے بند کرنے کی ترکیب تو بتائی ہوتی، ایک دفعہ تو نماز پڑھنے کو کہا ہوتا"۔

محبوب "ایک دفعہ نہیں، دن میں پانچ مرتبہ کہتا ہوں"۔

بندی "کیوں جھوٹ بولتے ہو؟"

محبوب "جھوٹ نہیں بولتا منہ سے نماز پڑھنے کو نہیں کہتا مگر تمہیں جتا کر نماز پڑھنے جاتا ہوں تاکہ تمہیں بھی نماز کا خیال آ جائے اب تم نہ سمجھو تو اس کا کیا علاج"۔

بندی نے شرما کر آنکھیں نیچی کرلیں اور محبوب کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا "اچھا اب مجھے نماز سکھا دو۔ کتنے دن میں آجائے گی"۔

محبوب "نماز کوئی گانا بجانا تو ہے نہیں کہ برسوں سیکھو پھر بھی کسر رہ جائے۔ اس سے آسان کون سی بات ہوگی۔ اللہ شوق دے تو دو چار دن میں نماز سیکھ سکتی ہو۔ قرآن کی دس پانچ چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرلو اور بس"۔

بندی نے اسی وقت سے نماز میں جو پڑھا جاتا ہے یاد کرنا شروع کر دیا۔ حافظہ اچھا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس قابل ہوگئی کہ اپنی جبیں عبودیت

بارگاہ ایزدی میں جھکا سکے۔

اب محبوب کی اذان میں پہلے سے زیادہ حقانی سُر لگنے لگے۔ جب وہ اذان دینے کھڑا ہوتا تو اس کے دماغ کی عجیب کیفیت ہوتی یہ تصور اُس کے اندر کچھ اور لطف پیدا کردیتا کہ بندی بھی چرخا چھوڑ کر وضو کے لیے کھڑی ہوگئی ہوگی۔ بندی کو بھی اذان کی آواز سنتے ہی کام میں مزہ نہ آتا۔ یوں تو چکی پیسنے کی غرض سے وہ سورج نکلنے سے گھنٹے دو گھنٹے پہلے ہی اٹھ بیٹھتی تھی دو سیر آٹا پیس چکتی تو سورج نکلتا اور اس میں اسے خاص قسم کی مسرت محسوس ہوتی لیکن وہ مسرت اور اطمینان کچھ اور ہی تھا جو پہلے دن صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد اس نے اپنے قلب و دماغ کے اندر پایا۔

گندگی سے نکل کر پاکیزگی کے ساتھ رہتے سہتے کئی برس ہو گئے تھے۔ محبوب بھی اپنی اس حالت میں خوش تھا اور بندی بھی ایسی نہال کہ کسی نواب کے محل میں جا کر بھی شاید یہ اطمینان اور مسرت کی زندگی میسر نہ آتی۔

مزدوری کے سلسلے میں ایک مرتبہ صبح سے چار بجے تک کے لیے محبوب کو قریب کے کسی گاؤں میں جانا پڑا۔ واپس آ کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک سفید لمبی داڑھی والے بزرگ مسجد میں رونق افروز ہیں۔ مولوی قسم کے پردیسی عالم اس مسجد میں ٹھہرا کرتے تھے۔ گر یا ان شرعی تحصیل داروں کا یہ ڈاک بنگلا تھا۔ مولوی صاحب کی ظاہری صورت اور وضع نہایت متبرک تھی۔ تقریر بھی ایسی دلچسپ اور وقت کے لحاظ سے اس قدر برجستہ اور موزوں کرتے کہ دیہاتی مسلمان اُن کا کلمہ پڑھنے لگتے۔ مولانا کے وعظوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو دن میں دو دو بار لوگ بلا کر لے جاتے۔ اس اثناء میں محبوب تو ان کی صورت کا ایسا دیوانہ ہوگیا کہ سارے کام چھوڑ کر مولوی صاحب کے ساتھ رہنے لگا۔ اُن کی باتوں میں شیرینی اور آنکھوں میں عجیب طرح کی کشش تھی۔ محبوب کے لیے ان سے بڑھ کر پیر نہ تھا جھٹ مرید ہوگیا اور بیوی کو بھی مرید کرا دیا۔

عورت اس معاملے میں مردوں سے بہت زیادہ خوش اعتقاد ہوتی ہے۔ بندی جو اپنے آپ کو گنہگار سمجھتی تھی پیر کی خدمت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگی۔ پیروں کو ایسے ہی مرید چاہئیں۔ مولانا نے بھی پاؤں پھیلا دیے۔ جس دن کہیں دعوت نہ ہوتی محبوب کے ہاں کھانا تناول فرماتے۔ بندی بڑے شوق اور محبت سے ان کے لیے کھانا پکاتی۔ اگر خود جَو کھاتی تو انہیں گیہوں کھلاتی۔ آپ تنگی میں گزر کرتی تو پیر کی خاطر گھی منگاتی۔

کوئی پندرہ سولہ دن بعد مولانا اپنا کام کر کے چلنے لگے تو جتنا محبوب اور بندی کو اُن کی جدائی کا صدمہ تھا بستی بھر میں شاید کسی کو نہ ہوگا۔ رات کو جب آخری دعوت کا کھانا دونوں میاں بیوی کھلا رہے تھے تو محبوب نے بڑی عاجزی سے کہا۔ حضور! حج کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کو ہمارے حالات تو معلوم ہی ہیں۔ ہمارے گناہوں کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ کیا تعجب ہے کہ وہ اپنے گھر کا طواف کرتے دیکھ کر ہماری خطاؤں سے چشم پوشی کرے"۔

پیر صاحب "بڑا مبارک خیال ہے لیکن تمہارا روپیہ تو گندہ نہیں؟"

محبوب "میری بیوی نے چکی پیس پیس کر اور چرخا کات کات کر کئی برس میں سو روپے جمع کیے ہیں نا گراتنے میں کام ہو جائے تو خدا کے لیے مجھے کسی کے ساتھ کر دیجیے کہ میں نبی جی کے روضے کی زیارت کر آؤں"۔

وقت کی بات ہے اور سچے شوق کا اثر محبوب نے یہ فقرے کچھ ایسے موثر لہجے میں کہے کہ مولوی

سیلز منیجر

بیمہ کمپنی میں ایک دُبلا پتلا، شرمیلا نوجوان داخل ہوا۔ وہ سیدھا سیلز منیجر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ منیجر کے قریب جا کر اس نے کہا "جناب آپ بیمہ پالیسی لینا تو پسند نہیں کریں گے"۔

"نہیں" سیلز منیجر کی کرخت آواز گونجی "قطعی نہیں برخوردار"۔

"جی مجھے بھی یقین تھا" نوجوان نے سہم کر جواب دیا اور مایوسانہ انداز میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

"ٹھہرو" سیلز منیجر نے کہا "میری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے تم جیسا گیا گزرا سیلز مین میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ لاؤ فارم دو۔ میں پانچ لاکھ روپے کی پالیسی پر دستخط کرتا ہوں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ تمہاری حوصلہ افزائی ہو اور تم ایک اچھے سیلز مین بن سکو"۔

فارم پر دستخط کرنے کے بعد سیلز منیجر نے اسے سمجھایا "پالیسی فروخت کرنے کے لیے تمہیں چند اچھے طریقے سیکھ کر انہیں شخصیت کے اعتبار سے استعمال کرنا چاہیے"۔

"بہتر ہے جناب!" نوجوان نے کہا "مجھے وہ طریقے آتے ہیں جو طریقہ میں نے آپ پر استعمال کیا ہے، یہ صرف سیلز منیجروں کے لیے مخصوص ہے"۔

صاحب کی آنکھوں میں سچ مچ کے آنسو بھر آئے۔ رانوں پر ہاتھ مار کر ایک لمبی سانس لی اور کہنے لگے "محبوب، تمہاری روح بڑی سعید ہے اور واقعی تم خدا کے محبوب بندے ہو، تمہارے پاس صرف سو روپے ہیں اور تم نے ان کو حج کے سفر کی نذر کردینے کی ہمت کی۔ شاباش صد رحمت۔ افسوس ہے میری حالت پر اور لعنت ہے میرے جھوٹے وعظوں اور پیری مریدی کے ڈھکوسلوں پر۔ اس وقت میرے پاس کئی ہزار روپے نقد موجود ہیں، ذاتی مکان بھی رہنے کو ہے لیکن میرے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہ آیا۔ آہ جس کے نام سے دنیا کو دھوکا دیتا پھرتا ہوں اس کی راہ میں ایک قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ بے شک محبوب، بے شک۔ روپے کا جو مصرف تم نے تجویز کیا ہے وہ سب سے بہتر ہے"۔ مولوی صاحب پر اتنا کہنے کے بعد ایک خاص حالت طاری ہوگئی۔ وہ دیر تک اپنی گندم نمائی اور جو فروشی کے تصور میں سر دھنتے اور اشک ندامت بہاتے رہے۔ محبوب بھی اُن کے ساتھ روتا رہا۔ تھوڑی دیر میں جب مولوی صاحب کی رقت کم ہوئی تو انہوں نے اپنی آنکھیں پونچھ کر فرمایا۔ میاں محبوب امیں بڑا خوش نصیب ہوں کہ تم جیسا مرید ملا اور میں نے وہ راہ دیکھی جس سے آج تک بھٹکتا پھرتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ دو چار دورے اور لگا کر پندرہ ہزار کرلوں تو سو روپے ماہوار کی جائیداد خریدی جاسکتی ہے اور پھر میں بڑے عیش و آرام سے زندگی بسر کرسکتا ہوں۔ پیری مریدی کا سلسلہ الگ رہے گا۔ حیف دنیا کی یہ ساری باتیں سوچیں لیکن دین کا ایک کام نہ کیا۔ کماتے کماتے عمر گزر گئی اور پیٹ نہ بھرا میں بارہ مہینے گشت کرتا ہوں اور نیت یہ ہوتی ہے کہ اپنی وضع قطع اور چرب زبانی سے خدا کی بھولی بھالی مخلوق کو مغالطہ دوں اور جس داؤ سے ہاتھ لگے، اُن سے روپیہ وصول کر، اپنی پونجی بڑھاؤں۔ کہیں مسجد کے نام سے چندہ کرتا ہوں، کہیں اسلامی و دینی مدرسہ کا مہتمم یا یتیم خانے کا منتظم بن کر لوگوں کی جیبیں کاٹتا ہوں۔ شکر ہے کہ آج میری خدا کے ساتھ فریب کاری ختم ہوگئی۔ تم نے مجھے خوابِ غفلت سے چونکا دیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ انسان کو کس راہ پر چلنا چاہیے۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ تم میرے

مرید نہیں، پیر ہو۔ میں تمہارا صرف ممنون ہی نہیں بلکہ تم کو اپنا مرشد ہادی اور نجات دہندہ سمجھوں گا۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ اگر میں حج کو جاؤں تو تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں"۔

محبوب (بے تابی کے ساتھ) "تو پھر حضور کا کب ارادہ ہے؟"۔

پیر صاحب "اسی سال انشاء اللہ جن آنکھوں کو تم نے کھولا ہے وہ کیا اب گنبد خضرا دیکھے بغیر بند ہو سکتی ہیں"۔

محبوب "یہ شب برات کا مہینہ ہے، رمضان گزرتے ہی چلنا چاہیے"۔

پیر صاحب "شب برات اور رمضان کیا۔ تم تو میرے ساتھ ابھی سے ہو لو اپنے سو روپے بیوی کے واسطے چھوڑ دو۔ میں اتنا روپیہ لے چلوں گا جو ہم دونوں کے لیے کافی ہوگا"۔

محبوب "نہیں قبلہ! میری نیت ڈانواڈول نہ فرمایئے حضور کے صدقے میں حج ہو جائے گا یہی میرے لیے بڑی دولت ہے۔ یہ روپیہ تو میں اپنے ساتھ ہی لے چلوں گا۔ میں مزدوری بھی کر سکتا ہوں اور اگر ضرورت ہوئی تو محنت کر کے گزارا کر لوں گا"۔

بندی "واہ مولوی صاحب واہ، آپ مجھے ثواب سے محروم کرتے ہیں۔ میں حج کو نہیں جا سکتی تو اسی طرح مجھ کو حج میں شریک ہونے دیجئے"۔

مولوی صاحب پر بندی کے اس کہنے کا بڑا اثر ہوا۔ حقیقت میں جب ایک گنہگار نیکی کے راستے پر آتا ہے تو اس کی ساری ادائیں نرالی ہوتی ہیں۔ اس کی صداقت، اس کے جذبات اس کی نیت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تاہم ان دونوں میاں بیوی کی غربت کا خیال کر کے بہت اصرار کیا اور طرح طرح سمجھایا مگر محبوب نے مولوی صاحب کی نقد امداد منظور نہیں کی۔

عید کے چوتھے دن پیر اور مرید اسباب سفر باندھ کر کراچی کے لیے سوار ہو گئے۔ پیر صاحب کے جاننے والے یہاں بھی تھے کئی روز تک دعوتیں رہیں، دعوتیں ختم ہو گئیں تو روانگی کا انتظام شروع ہوا۔ پیر صاحب پڑھے لکھے، نہایت تیز طرار اور جہاں دیدہ آدمی تھے۔ سفر میں ایسے ہی انسان آرام اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے بڑی سہولت کے ساتھ سارا بندوبست کر لیا۔ ٹکٹ خریدنا، پاسپورٹ حاصل کرنا، ضروری سامان کی بہم رسانی۔ یہ سب پیر صاحب کے سپرد تھا۔ محبوب تو صرف اسباب کی نگرانی کیا کرتا۔

جہاز حاجیوں کو لے کر چلا تو پیر صاحب سرزمین وطن دفعتہً چھوٹنے سے اور سمندر کی موجیں دیکھ کر بہت پریشان اور افسردہ خاطر تھے لیکن محبوب کی خوشی کا کیا پوچھنا۔ اس کے قلب پر خانہ کعبہ اور روضہ رسول پاک کی کشش اس قدر غالب تھی کہ جہاز جتنی دور نکلتا جاتا اسی قدر اسے زیادہ خوشی محسوس ہوتی۔ سمندر کی موجوں میں وہ تسکین قلب کے عجیب و غریب ترانے سنتا۔ اسے ہر لمحے اپنے سینے کے اندر ایک خاص قسم کا جذبہ بڑھتا معلوم ہوتا۔ تیسرا دن تھا صبح کی نماز پڑھ کر مرید اور پیر دونوں بیٹھے تھے کہ محبوب نے پیر صاحب کو مخاطب کیا۔ "پیر صاحب! بندی کے نہ آنے کا بڑا قلق ہے، کیا کروں اتنا روپیہ نہ تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ حج کرتے۔ میں نے تو کہا بھی کہ اب کے نہ سہی بارہ مہینے اور دل لگا کر محنت کر لیں لیکن اس نے نہ مانا کہ روپے کے انتظار میں دوسرے سال پر اپنا ارادہ ٹال دوں۔ کہنے لگی زندگی کا کیا اعتبار ہے، تم کسی بات کا خیال نہ کرو اگر میرے نصیب میں حج ہوگا تو اگلے سال ہم دونوں چلیں گے، تم مجھے حج کرا لانا"۔

پیر صاحب بولے "تم کڑھو نہیں۔ ایک حج کا ثواب اب بھی اسے مل جائے گا۔ اس نے تمہیں حج کرایا ہے۔ خدا توفیق دے تو اگلے برس تم اسے حج

مُسکراہٹیں

فوجی کمانڈر ایک سارجنٹ کے ساتھ نئے بھرتی ہونے والوں کے سامنے پہنچا۔ اس نے تعارفی تقریر شروع کی۔ چند تعارفی کلمات کے بعد وہ بالوں کی حجامت کے موضوع پر آیا" بالوں کے معاملے میں آپ بالکل آزاد ہیں" لمبے لمبے بال والوں نے اطمینان کی سانس لی۔کمانڈر نے کہا "آپ لوگ اپنی پسند کے بال رکھ سکتے ہیں مگر اُن کی لمبائی میرے بالوں سے زیادہ......"۔ اُس نے اپنے سر سے ٹوپی اٹھا کر اپنی سولجر کٹ حجامت دکھائی" اور سارجنٹ کے بالوں سے کم نہ ہو" سارجنٹ نے بھی اپنی ٹوپی اُٹھائی۔وہ گنجا تھا۔

☆

ریل میں ایک خاتون اپنے کتے کو ساتھ لے جارہی تھیں۔ انہوں نے گارڈ سے کہا "میں نے اس کا ٹکٹ بھی خریدا ہے لہٰذا اسے بھی دوسرے مسافروں کی طرح سیٹ پر بیٹھنے کا حق ہے"۔
"آپ نے بجا فرمایا" گارڈ بولا "مگر دوسرے مسافروں کی طرح اسے بھی سیٹ پر پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی"۔

☆

ایک فضائی کمپنی مسافروں سے اُن کا وزن دریافت کرتی ہے۔ایک بار کمپنی کی خاتون کلرک نے کسی مسافر سے سوال کیا "آپ کا وزن کیا ہے جناب"۔
"کپڑوں کے ساتھ یا کپڑوں کے بغیر؟" مسافر نے پوچھا۔"آپ کس طرح سفر کرنا پسند کریں گے؟"۔ جواب ملا۔

(فیاض الرحمان قادری)

کرا دینا"۔

یوں تو کراچی سے روانہ ہوتے ہی پیر صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ متلی قے نے پہلے ستایا۔ پھر بخار آ گیا اور اس کے بعد تو یکا یک اُن کی حالت ایسی بگڑی کہ زیادہ بات بھی نہ کرسکے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

دوران علالت محبوب نے پیر صاحب کی حد سے زیادہ خدمت کی۔ خدمت کے علاوہ اُن کی صحت کے لیے دعائیں بھی مانگیں مگر جب وقت آجاتا ہے تو دوا دُعا سے کچھ نہیں ہوتا۔ پیر صاحب اچھی پکی عمر کے آدمی تھے۔ اختلاف آب و ہوا کے اثرات ایسی بُری طرح اُن پر پڑے کہ عدن پہنچتے پہنچتے حالت بالکل ردی ہوگئی۔ جہاں بری کی کوئی امید نہ تھی۔

جس رات پیر صاحب کا انتقال ہوا شام کے وقت محبوب اُن کے پاؤں سہلا رہا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔ دوا پلانے کی غرض سے محبوب نے انہیں آواز دی۔ پیر صاحب نے آنکھیں کھول کر اپنے مرید کو دیکھا۔محبوب "حضور دوا پی لیجیے"۔
پیر صاحب "دوا نہیں اسے پھینک دو" (چند منٹ خاموش رہنے کے بعد) "محبوب میں بڑا بدنصیب انسان ہوں تم ملے تو کب کہ عمر ختم ہوچکی۔ حج کا ارادہ بھی کیا تو اس وقت جب بقول شخصے قبر میں پیر لٹک گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے یہ سعادت میری تقدیر میں نہیں لکھی......آہ!

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

غالباً چند گھنٹے کا مہمان ہوں تم گھبرانا نہیں خدا تمہارے ساتھ ہے۔ منزل مقصود پر پہنچ کر میرے لیے بھی دُعا کرنا۔ میری ساری عمر ریا کاری میں بسر ہوئی۔ وعظ کہے تو روپیوں کے، پیر بنا تو جھوٹا، خدا

اور رسولؐ دونوں کا چور تمہاری محبت سے یہ مرض دُور ہوا تھا اور تمہاری رہنمائی سے تمنا تھی کہ کعبے کا پردہ پکڑ کر توبہ کروں گا۔ آستانِ نبوی کی خاک سر پر ڈال کر اس شافعِ محشر کے طفیل مغفرت چاہوں گا لیکن مولا کی مرضی نہیں۔ اعمال کی سیاہی شاید اتنی گہری ہے کہ سمندر میں غوطے کھانے ہیں۔ اپنا سارا سامان تمہیں دیتا ہوں۔ جس طرح چاہو صرف کرو۔"

یہ کہتے کہتے پیر صاحب کی زبان بند ہو گئی۔ محبوب نے بہت کوشش کی کہ پیر صاحب بولیں جہاز کے ڈاکٹر کو بھی لایا کہ کوئی دوا دیں لیکن بے سود۔ پیر صاحب کا وقت آ گیا تھا۔ اسی رات انہوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

محبوب کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس برس ہو گی۔ پھر جاہل، ذوق وشوق اور توفیقِ الٰہی کے سوا کوئی اسے ڈھارس دلانے والا نہ تھا۔ اتنا لمبا سفر جس میں کوئی کسی کا پرسان نہیں۔ سب نفسی نفسی میں مبتلا۔ ناتجربہ کار اور تنہا پہلے تو کسی قدر گھبرایا، دل میں ہول اٹھے لیکن پھر اس نے طبیعت مضبوط کر کے کہا، دنیا میں تنہائی سے گھبرانا اور خدا کے سوا بندوں کا سہارا ڈھونڈنا سب سے بڑی حماقت ہے اور جہاز کے کپتان کو پیر صاحب کے متعلق اطلاع دی۔

پیر صاحب کو سمندر کی گہرائیوں میں دفن کرنے کے بعد محبوب نے اُن کے سامان کا جائزہ لیا۔ ایک ٹرنک کے سوا جتنی چیزیں تھیں وہ تقریباً مشترکہ تھیں۔ محبوب نے انہیں دو برابر کے حصوں میں تقسیم کر کے ایک اپنے لیے رکھ لیا اور دوسرا اللہ کے نام پر خیرات کر دیا۔ ٹرنک کھول کر دیکھا تو اُس میں کپڑوں کے چھ جوڑے اور نو سو روپے تھے چنانچہ اُن کا ذاتی سامان یعنی کپڑے اور روپے اس نیت سے اپنی حفاظت میں لے لیے اگر زندہ چلتا تو ان کے وارثوں کو پہنچا دوں گا۔

ذرا سی بات

ایک شخص شام کو اپنی کھڈی پر کام کرنے بیٹھا۔ اس کی بیوی ساتھ ہی باورچی خانے میں روٹیاں پکانے لگی۔ اس شخص نے روٹیوں کی گنتی شروع کر دی۔ جب روٹیاں پک چکیں تو اس نے اپنی بیوی سے کہا "آج تم نے آٹھ روٹیاں پکائی ہیں۔"

جب بیوی نے روٹیوں کی گنتی کی تو واقعی آٹھ تھیں۔ صبح اٹھ کر اس نے سارے گاؤں میں مشہور کر دیا کہ اس کا خاوند بہت پہنچا ہوا بزرگ ہے۔ وہ دیوار کے دوسری طرف کا حال بتا سکتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے رات والا قصہ بھی سنایا۔ شام تک پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ وہ شخص پریشان ہو گیا کہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ گاؤں والوں نے اسے مجبور کیا کہ گاؤں کی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دے اور اسے زبردستی مسجد لے گئے۔ اس شخص نے سوچا کہ بہت اچھا موقع ہے جونہی سارے نمازی مسجد میں گئے اس نے مسجد کی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اتفاق کی بات کہ اسی وقت زلزلہ آ گیا۔ مسجد کی چھت گر گئی لوگوں نے بھاگ کر جان بچائی۔ کئی نمازی شہید بھی ہو گئے۔ اب تو گاؤں والوں کا یقین پکا ہو گیا کہ زلزلے کے آنے کا اس کو پہلے سے کیسے علم ہو گیا۔ وہ شخص بھاگا جا رہا تھا اور گاؤں والے اس کو پکڑنے کیلئے دوڑتے رہے۔ بالآخر وہ کسی جنگل میں روپوش ہو گیا۔ بعد میں اس شخص کا کچھ پتہ نہ چلا۔

ذرا سی بات پر اس کی بیوی نے اپنا خاوند کھو دیا۔ ایسے ہی تو نہیں کہتے کہ عورتوں کے پیٹ میں بات نہیں ٹھہرتی۔

(تحریر: مرتضیٰ حسن۔ پشاور)

خدا نے محبوب کو اپنے حبیبؐ کے صدقے میں صحیح و سلامت مکہ معظمہ پہنچا دیا۔ نہایت خوش

اعتقادی اور سچے جوش کے ساتھ اُس نے مناسک حج ادا کیے۔ ہر جگہ پیر صاحب کے لیے دعائیں مانگیں۔ حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ روضہ اطہر کے دیدار سے اپنی آنکھیں منور کیں۔ یہاں آتے آتے اُس کا سرمایہ ختم ہو چکا تھا۔ پیر صاحب کی پوری رقم اُس کے پاس تھی جس کا علم کسی کو نہ تھا۔ اگر وہ چاہتا تو ضرورت کے مطابق بطور قرض حسنہ لے لیتا۔ گھر آ کر رقم پوری کر لیتا مگر ایک امانت کو اس نے ہاتھ لگانا کسی نیت سے سہی، حرام سمجھا اور اِدھر اُدھر چل پھر کر ایک دکان پر ملازمت کر لی اور اس طرح وقت گزاری کے ساتھ غیبی مدد کا انتظار کرنے لگا۔

حاجیوں کی واپسی کا وقت آ گیا۔ قافلے روانہ ہونے لگے۔ محبوب کے پاس کچھ نہ تھا کہ وہ بھی گھر کا رُخ کرتا محبوب کو محبوب رب العالمین کی گلی میں کچھ ایسی راحت ملنے لگی کہ وطن کی یاد اس کے دل سے جاتی رہی۔

پورے پانچ برس محبوب مدینہ منورہ میں مقیم رہا۔ اس عرصے میں اس نے نوکریاں بھی کیں اور مزدوری بھی۔ بیمار بھی رہا اور تن درست بھی، تکلیفیں بھی جھیلیں اور راحتیں بھی پائیں اسے سخت ضرورتیں بھی پیش آئیں لیکن اللہ نے اسے ایسی استقامت عطا فرمائی تھی کہ پیر صاحب کے روپے پر کبھی بھولے سے بھی للچائی ہوئی نظر تک نہ ڈالی۔ آخر بندی کی کشش اور دعاؤں کے اثر سے محنت مزدوری کے صدقے میں اتنی رقم جڑ گئی کہ لشتم پشتم وطن پہنچ جائے۔ اب کچھ دن قافلے کا انتظار کیا اور ایک دن واپسی کے قصد سے ارض بطحا کو نہایت رنج و ملال کے ساتھ الوداع کیا۔

اِدھر بندی نے پہلے سال تو بڑی خوشی سے انتظار کیا۔ روز محلے والوں سے پوچھتی رہتی کہ حاجی کتنے دن میں آ جائیں گے۔ بستی کے بھی کئی آدمی حج کو گئے ہوئے تھے۔ جب تک وہ نہیں آئے اُس وقت تک تو بے چینی سے انتظار کیا لیکن جب وہ آ چکے اور اُن سے پوچھ لیا اور انہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے تو نہ جہاز میں محبوب کو دیکھا نہ ریل میں، اسے ایک قسم کی مایوسی ہو گئی۔ کبھی کہ ضرور کوئی واقعہ پیش آ گیا۔ دوسرا سال آیا حاجی جانے لگے۔ پڑوس کے شیخ جی بھی چلے تو بندی نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر ان سے تاکید کی کہ ذرا محبوب کو بھی معلوم کرنا۔

لیکن دنیا میں کون کسی کا خیال کرتا ہے خاص کر ایسے مذہبی ہنگاموں میں شیخ واپس آئے اور بندی نے اُن سے اپنے شوہر کی نسبت پوچھا تو انہوں نے حاجی ہو کر پہلا جھوٹ یہ بولا کہ میں نے بہت تلاش کیا' محبوب کہیں دکھائی نہیں دیے، اس میں ایک ہفتے کی مجھے دیر ہو گئی۔ اب بندی کو مایوسی سی ہونے لگی۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے۔ ہر سال حاجیوں کی واپسی کے وقت شوہر کا انتظار کرتی اور جب یہ سن لیتی ہے کہ حاجیوں کے آنے کا وقت نکل گیا۔ کوئی جہاز باقی نہیں رہا تو سمجھ لیتی کہ اُن کی خاک مدینہ منورہ کی خاک میں مل گئی تاہم یہ وہم ہی وہم یا قیاس ہی قیاس ہوتا۔ دل گواہی نہ دیتا۔ بلکہ جب خواب میں دیکھتی یہی دیکھتی کہ محبوب کہہ رہا ہے "گھبراتی کیوں ہو، میں زندہ ہوں، سامان بندھا رکھا ہے جہاز کا ٹکٹ ملا اور سوار ہوا۔ سوار ہوا اور تمہارے پاس پہنچا"۔

وہاں محبوب جہاز سے اُتر کر بمبئی میں داخل ہوا تو اُس کے زادِ راہ میں صرف اتنی گنجائش رہ گئی تھی کہ تین چار روز تک کھا پی سکے گھر تک پہنچنے کے لیے ریل کا کرایہ نہ تھا مجبوراً مزدوری کرنی پڑی اور ایک ہفتے کی سخت محنت کے بعد جب کچھ جمع ہو گیا تو آگے چلا پھر بھی بلب گڑھ کا پورا ٹکٹ نہ لے سکا۔

جہاں ریل نے اُتار دیا وہاں سے اب اُس نے پیدل چلنا شروع کیا اور بڑی مشکل سے چوتھے دن بلب گڑھ پہنچا۔ جمعے کا دن تھا نمازی جمعے کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے۔ بندی نماز سے فارغ ہو کر چرخا کاتنے بیٹھی تھی کہ یکایک اُس کی بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ رات کو اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ محبوب مجھے مدینہ منورہ کی کھجوریں کھلا رہا ہے۔ اس وقت جو اس کی آنکھ پھڑکی تو اس کا دل بڑے زور سے اچھلنے لگا۔ عورتوں کا اعتقاد ہے کہ آنکھ پھڑکے بائیں، پیر ملے یا سائیں' بندی کو ایسے شگونوں پر اعتقاد تھا۔ وہ چرخا پونی کرنا تو بھول گئی۔ دیر تک دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کی۔ گویا محبوب آ رہا ہے کب اُس کی آہٹ پائے اور کب جھپاکے سے اُٹھ کر کنڈی کھولے۔

دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے عصر کا وقت ہو گیا۔ مسجد سے اللہ اکبر کی آواز نکل کر فضا میں پھیلی۔ آواز سنتے ہی بندی چونک پڑی، بے تاب ہو گئی، بس نہیں چلتا تھا کہ باہر جا کر دیکھے کیونکہ یہ آواز محبوب کی تھی۔ کیا آ گئے؟ آواز تو بالکل انہی جیسی ہے۔ سامان رکھ کر مسجد جاتے۔ کیا خبر میرے کان بجے ہوں، اُس کا دل ڈھکڑ پکڑ تھا کہ اتنے میں اذان ختم ہوئی اور اذان ختم ہوتے ہی محلے میں غل مچ گیا کہ محبوب آ گئے۔ پڑوس کی سیدانی بی نے پکار کر کہا "ہمسائی مبارک ہو، تمہارے میاں حاجی بن آئے"۔

بندی کی عجیب کیفیت تھی کبھی روتی کبھی ہنستی، کبھی سجدے میں گر پڑتی۔ نماز سے پہلے اور نماز کے بعد ایک گھنٹے تک محلے کے بوڑھے جوان حاجی محبوب کے ہاتھ چومتے رہے۔ لوگوں سے فرصت ملی تو گھر آئے۔ بندی دروازہ کھولے کواڑوں سے لگی کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ محبوب نے بھی آنسوؤں کا جواب آنسوؤں سے دیا اور صحن میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

بندی (آنسو پونچھتے ہوئے) "بیٹھو گے نہیں؟ کیا کہیں جانا ہے؟"

محبوب "ہاں ابھی میرا سفر ختم نہیں ہوا۔ ایک بوجھ میرے کندھوں پر ہے جب تک اسے نہ اُتار لوں گا حج پکا نہیں ہو گا"۔

بندی "دُور جاؤ گے یا پاس؟"

محبوب "کل رات کو آ جاؤں گا"۔

بندی "تو ابھی جاؤ گے؟"

محبوب "زندگی کا کیا اعتبار جلدی سے دو روٹیاں پکا دو اور دو چار روپے ہوں تو دے دو"۔

بندی نے جلدی جلدی آٹا گوندھ روٹیاں ڈالیں۔ محبوب اتنی دیر کھڑا ہی رہا اور جب بیوی نے روٹیاں رومال میں باندھ کر دیں تو وہ فوراً باہر نکل گیا۔

فیروز پور جھرکہ میں مرحوم پیر صاحب کا مکان تھا۔ صبح ہوتے ہی وہاں پہنچ کر اُن کی امانت اُن کی بیوی بچوں کے سپرد کی اور اپنے گھر لوٹ آیا۔

دوسرے دن صبح کی نماز کے بعد لوگوں نے پوچھا "حاجی جی چار وقت نہ تم نے اذان کہی، نہ جماعت میں آئے، کیا کہیں چلے گئے تھے؟"

محبوب نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا "بیچ بیچ کے حاجی ہونے میں ایک کسر رہ گئی تھی۔ فیروز پور جھرکہ جا کر اسے پورا کرنا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سے فرصت پائی"۔

حج کے بعد تقریباً دس سال میاں محبوب اپنی بیوی کے ساتھ نہایت پاکیزہ زندگی گزارتے رہے یہاں تک کہ لوگ اسے درویش کامل سمجھتے تھے لیکن یکایک بندی کا انتقال ہو گیا۔

بلب گڑھ میں طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ گھر یوں ہی چھوڑ دلی آ گئے اور جنوں والی مسجد میں رہنے لگے۔

.....❁.....❁.....



جاوید راہی

نوری اور توکل

وہ اس خبر کے لیے بالکل تیار نہ تھا مگر یہ سنتے ہی کہ نوری کی شادی ہوگئی وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کیا۔ وہ ملک صاحب کے اگلے پیغام کے انتظار سے پہلے ہی ایک رات چپکے سے اپنے ساتھیوں کی آنکھ بچا کر سٹین گن سمیت بھاگ نکلا۔

ایک شخص کا فسانہ جس کے محنت کرنیوالے ہاتھ بندوق اٹھانے پر مجبور ہوگئے تھے

ٹھائیں، ٹھائیں، ٹھائیں...... سیون ایم ایم کی کرخت آواز نے رات کے سکوت کا سینہ چیر ڈالا۔ حویلی میں یکدم بھگدڑ مچ گئی، کئی کمرے روشن ہوگئے۔ بڑے دلان کی بوگن بلیا کی بیل کی جڑ کے پاس کرم علی کی لاش تڑپ تڑپ کے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ جب تک کوئی جاگتا وہ گھوڑے کو شہر کی بڑی پکی سڑک پر ڈال چکا۔ سیون ایم ایم کی رائفل اس نے گلے میں ڈال کر مضبوطی سے بغل میں دبا رکھی تھی۔ میاں صاحب کے آدمی جب تک اس کے پیچھے آتے وہ ان کی دسترس سے بہت دور نکل آیا تھا۔ کیکر کے ایک درخت کی اوٹ لے کر اس نے اپنے پیچھے کے راستے کا جائزہ لیا۔ صرف اس کے گھوڑے کے پاؤں کی دھول چاندنی رات میں اڑ رہی تھی۔

”کب تک بچو گے میاں؟ آج کرم علی مرا ہے کل تم اس کی جگہ ہوگے۔“ اس نے منہ میں بڑبڑاتے ہوئے



گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک دو بھرپور کش لے کر دھواں ایک طرف پھینکتے گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔ اب اس کا رُخ ذخیرہ کی طرف تھا۔ اُسے ذخیرہ میں بھٹکتے دوسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ اس کا یہ دوسرا قتل تھا۔ پہلا قتل اس نے اس وقت کیا تھا جب وہ ایک محنت کش تھا اور نوری کے پیار میں سرشار ہر وقت وہ میاں نیاز علی کے کھیتوں میں کام کرتا اور شام کو حویلی کے بڑے ڈیرے پر گر پڑتا تھا۔

وہ دن خوشی اور سکون کے تھے۔ توکل ایک عادی مجرم نہیں بلکہ ایک محنت کش تھا۔ جب نوری حویلی سے نکل کر اسے روٹی دینے آتی تو اس کی تمام دن کی تھکن پل بھر میں ہوا ہو جاتی اور وہ آنکھوں میں ٹھاٹھیں مارتا محبت کا سمندر لیے نوری کے استقبال کے لیے اُٹھتا اور روٹی والے برتن اس کے ہاتھ سے پکڑ لیتا۔ نوری اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں پل بھر کو دیکھتی اور یوں سمٹ جاتی جیسے چھوئی موئی کی ڈالی اور جلدی سے ڈیرے کا اندرونی دروازہ پھلانگ جاتی۔ توکل مسکراتا ہوا روٹی کھانے میں مشغول ہو جاتا۔

توکل کے ماں باپ کب کے مر چکے تھے وہ کئی ملازموں کے ہمراہ بھی حویلی کا بے دام غلام ہو گیا۔ حویلی کا قانون باہر کے قانون سے ذرا مختلف تھا۔ یہاں نوکروں کو دن میں کام کرنا ہوتا تھا اور صرف رات آرام کرنے کی اجازت تھی۔ ان کے نزدیک کوئی خوشی اور رنج اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ سال میں دو تین بار لباس ملتا اور گاؤں کے موچی سے دو بار جوتے۔ حویلی کے اندر کام کرنے والی نوکرانیاں بڑی بی بی جی کے ماتحت تھیں۔ کس کی مجال تھی جو بڑی بی بی جی کی مرضی کے خلاف کام کر سکے۔ میاں صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی جو شہر میں پڑھ رہے تھے۔ وہ وہاں ان کی دوسری بیوی کے پاس رہتے جس کو چھوٹی بی بی جی کا رتبہ حاصل تھا۔ میاں صاحب اپنے علاقہ کے بااثر آدمی مانے جاتے تھے۔ نوری میاں صاحب کے پرانے ملازم علی محمد کی چھوٹی بیٹی تھی۔ بڑی بیٹی اس نے ساتھ کے گاؤں میں بیاہ دی تھی اور لڑکا شہر میں میاں صاحب کی کوٹھی پر رہتا تھا۔ توکل اور نوری ایک ساتھ پروان چڑھے تھے۔ اس لیے نظروں ہی نظروں سے ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے تھے۔ اکثر توکل نوری سے کہتا، "نوری میں تیرے بابا سے تیرا ہاتھ مانگ لوں مگر بڑی بی بی جی سے ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں وہ تیرے لیے کیا سوچتی ہے۔"

"میں کیا جانوں۔" نوری چاروں طرف دیکھ کر دھیرے سے جواب دیتی۔ "اچھا جاؤ کوئی دیکھ نہ لے۔" نوری اسے جانے کا کہتی اور توکل ٹھنڈی سانس بھرتا دوسری طرف نکل جاتا۔

ایک روز انھیں باتیں کرتے ہوئے ایک ملازم کرم علی نے دیکھ لیا اور اس نے منشی کو بتا دیا۔ منشی جو میاں صاحب کے لیے کھلی آنکھیں اور کھلے کان کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے جھٹ، یہ خبر میاں نیاز علی کے گوش گزار دی۔ [illegible] پھر کیا تھا اندر نوری کی اور باہر توکل کی شامت آ گئی۔

بڑی بی بی جی نوری کے دونوں ہاتھ چارپائی کے پائیوں کے نیچے رکھوا کر اوپر خود بیٹھ گئیں۔ نوری کی مارے درد کے چیخیں بلند ہونے لگیں۔ کیا مجال ہے علی محمد زبان سے اُف بھی کرتا۔ اس کی بیٹی کے ساتھ اس کی موجودگی میں وحشیانہ سلوک ہوا مگر وہ بے بس تھا۔ وہ حویلی کے قانون کو بخوبی جانتا تھا۔ ادھر ڈیرے پر توکل کو چارپائی سے جکڑ کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی جا رہی تھیں۔ میاں صاحب تخت پوش پر حقے کی نے منہ میں دبائے اس کی چیخوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب وہ اپنے دل کی حسرت نکال چکے تو اسے آزاد کرنے کا اشارہ کیا۔ پھر حکم ملا کہ آج سے تیرا حویلی آنا جانا بند۔ تُو صرف ڈھاری پر رہے گا اور مال ڈنگر کی رکھوالی کرے گا اور دودھ دھوئے گا گوبر سنبھالے گا۔ نوری اس کی آنکھوں سے دُور ہو گئی۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اسے اُس ملازم اور منشی پر بہت غصہ تھا مگر وہ بے بس تھا۔

میاں نیاز علی اور ملک تصدق کا آپس میں مقابلہ چلا آرہا تھا۔ کبھی میاں کے آدمی اس کا مال مار لاتے اور کبھی ملک تصدق کے آدمی میاں نیاز علی کا ڈھور ڈنگر چوری کر کے لے جاتے۔ بھر میدان لگتا دونوں طرف سے خوب رسہ کشی ہوتی، یہ سلسلہ دونوں طرف سے چلا آرہا تھا۔

توکل کو ڈھاری پر آئے کئی ماہ گزر چکے تھے اگر توکل کا نوری کے بغیر بُرا حال تھا تو نوری بھی اس کے لیے پریشان تھی مگر دونوں بے بس تھے۔ ایک رات وہ ڈھاری پر اکیلا ہی تھا۔ ہموارا کسی کام کی غرض سے شہر گیا ہوا تھا، گرمی کی راتیں بڑی جان لیوا ہوتی ہیں۔ مچھروں نے اسے تنگ کر رکھا تھا۔ اس نے مال سے ذرا ہٹ کر اپنی چارپائی ڈالی ہوئی تھی اور قریب ہی دھواں لگا رکھا تھا۔ تاکہ مچھر دور رہیں۔ ابھی اسے لیٹے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ کتوں نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ تیزی سے اُٹھ بیٹھا مگر اپنے سے چند قدم دور آٹھ دس آدمیوں کو دیکھ کر وہیں ٹھٹک گیا۔ وہ اسلحہ سے لیس تھے اور اُنھوں نے منہ پر کپڑے باندھے ہوئے تھے۔ دو آدمی قریب آ گئے۔ ''اگر آواز نکالی تو بھون کر رکھ دیں گے۔'' وہ سہم گیا مگر جلدی سنبھل کر اس نے حالات کا جائزہ لیا اور فوری فیصلہ کرتے ہوئے اس نے ان کو مخاطب کیا ''اگر تم ملک صاحب کے آدمی ہو تو میں خود یہ مال کھول کر تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں ورنہ جان دے دوں گا مگر تم ڈنگر میری زندگی میں نہیں کھول سکتے۔''

''تم ملک صاحب کے پاس کیوں جانا چاہتے ہو۔'' ان میں سے ایک آدمی نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں پناہ چاہتا ہوں۔'' توکل نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

ان مسلح آدمیوں نے چند لمحے آپس میں مشورہ کیا اور اسے ساتھ لے جانے پر رضامند ہو گئے۔ ساری ڈھاری کا مال اکٹھا کر کے وہ ان کے ہمراہ چل پڑا۔ اُس نے ایک انتہائی خوفناک فیصلہ کیا تھا، اس کے دل میں میاں نیاز علی کے لیے جو نفرت کا طوفان دبا ہوا تھا اسے صرف ملک تصدق کی پناہ میں ہی رہ کر پورا کیا جا سکتا تھا۔

دوسرے روز جب اسے ملک صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے ساری داستان کہہ سنائی۔ لوہا گرم دیکھ کر ملک تصدق نے چوٹ لگائی۔ ''توکل فکر مت کرو تیرا اور میرا ایک ہی دشمن ہے جلد نمٹ لیں گے۔ تم ابھی کچھ روز آرام کرو۔ جاؤ رفیق اسے ذخیرہ میں لے جاؤ باقی میں سنبھال لوں گا اور مال بارڈر پار بھجوا دو۔''

''بہتر ملک صاحب۔'' رفیق نامی اس آدمی نے احترام سے جواب دیا اور توکل کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ تقریباً ایک ماہ کے عرصہ میں توکل ہر کام میں ماہر ہو گیا۔ اس دوران وہ ملک کے آدمیوں کے ہمراہ دو تین بار چوری چکاری بھی کرنے لگا۔ وہ سارے گر سیکھ چکا تھا۔ ملک تصدق نے ایک روز اسے بلا بھیجا۔ اب وہ دوسری بار ملک صاحب کے پاس کھڑا تھا۔ ''جی ملک صاحب۔'' توکل نے نظریں جھکائے پوچھا۔

''اپنا انتقام یاد ہے یا بھول چکے ہو؟''

''ملک صاحب یہ کوئی بھولنے والی بات ہے۔ جس نے ساری عمر کی خدمت کا یہ صلہ دیا ہو اسے کیسا بھولنا۔'' توکل کے لہجے میں سارے جہان کی نفرت اُبھر آئی۔ ''تو ٹھیک ہے آج رات تیار رہنا، تم دو آدمی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو مگر جب واپس آؤ تمہارے ہاتھوں سے لہو کی بُو آنی چاہیے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ بزدل اور ناکام آدمی مجھے پسند نہیں۔''

''ایسا ہی ہوگا ملک صاحب۔''

''اب تم جا سکتے ہو!''

توکل نے اس سے پیشتر چوری چکاری میں تو ملک

صاحب کے آدمیوں کا ساتھ دیا تھا مگر جس کام کے لیے وہ جانے والا تھا یہ اس کے لیے نئی بات تھی۔ اس کے اندر ایک طرح کا خوف سر اٹھا رہا تھا۔ مگر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے بھروسے کے دو آدمی ساتھ لیے۔ گھوڑے کو میاں نیاز علی کے گاؤں کی طرف کر دیا۔ اسے معلوم تھا رات دس گیارہ بجے تک میاں ڈیرے میں ہی لوگوں کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے بعد وہ حویلی کے بڑے دالان والے دروازے سے گزر کر اندر چلا جاتا تھا۔ توکل نے ڈیرے کی پچھلی دیوار کا انتخاب کیا۔ وہ کھیتوں کے راستے ڈیرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دونوں آدمی اس نے پیچھے ہی چھوڑ دیے اور خود رینگتا ہوا ڈیرہ کی عقبی دیوار تک پہنچ گیا۔ رائفل اس نے دیوار کے اوپر رکھی اور بغیر آواز پیدا کیے اندر کود گیا۔ دیوار کے اندر لگی گارڈنیا کی باڑ کی اوٹ لیتا ہوا رائفل کو مضبوطی سے تھامے اس طرف بڑھنے لگا جہاں میاں نیاز علی بیٹھا اسے نظر آ رہا تھا۔ اس وقت میاں نیاز علی کے پاس تین چار نوکروں کے علاوہ گاؤں کے کچھ لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ منشی میاں نیاز علی کی ہی چارپائی پر بیٹھا شاید اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا۔ فاصلہ کم محسوس کر کے توکل نے پوزیشن درست کی اور رائفل کا منہ میاں نیاز علی کے سر کی طرف کرتے لبلبی دبا دی۔ ٹھائیں کی خوفناک آواز کے ساتھ وہاں شور برپا ہو گیا۔

اس نے اندھا دھند کئی فائر کیے اور یہ دیکھے بنا کہ کون مرا ہے بھاگ کھڑا ہوا۔ دیوار پھلانگ کر وہ کھیتوں کی طرف بھاگنے لگا جب تک میاں نیاز علی کے آدمی اسلحہ وغیرہ لاتے وہ تینوں گھوڑے دوڑاتے گاؤں کو پیچھے چھوڑ آئے۔ میاں نیاز علی تو بچ گیا مگر منشی پہلی گولی لگتے ہی ڈھیر ہو گیا تھا۔ دوسرے روز ملک صاحب نے اسے بلا کر بتایا کہ ”تمہارا نشانہ خطا گیا، بہرحال تمہاری گولی نے منشی کا کام تمام کر دیا ہے۔ یہ بھی تمہاری کامیابی ہے۔ اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا نشانہ بھی درست کرو۔ کیونکہ اب تم قاتل بن چکے ہو۔“ اب پولیس تمہارے پیچھے رہے گی اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنی حفاظت کے لیے پولیس سے مقابلہ بھی کرنا پڑے۔ اس لیے تمہارا نشانہ پکا ہونا ضروری ہے۔ جاؤ اور خوب مشق کرو۔ بارود کی تمہیں کوئی کمی نہیں۔“ ملک صاحب نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

توکل نے جھک کر شکریہ ادا کیا اور واپس ذخیرہ میں آ گیا۔ توکل دن بہ دن ملک صاحب کے قریب ہوتا گیا۔ ملک صاحب اس پر ہر طرح کا بھروسہ کرنے لگے۔ علاقہ کی پولیس اُس کی بڑھتی ہوئی وارداتوں کے ہاتھوں بہت پریشان تھی مگر ہزار کوشش کے باوجود اسے گرفتار نہ کر سکی۔ میاں نیاز علی، اب توکل کے خوف سے ڈیرہ پر کم ہی بیٹھتا تھا۔ جب بھی باہر نکلتا تو اپنے ساتھ اسلحہ سے لیس آدمی رکھتا۔ منشی کے قتل کا پرچہ توکل کے خلاف درج ہو چکا تھا۔ میاں نیاز علی کوشش کے باوجود ملک تصدق کو اس قتل میں ملوث نہ کر سکا۔ نوری کی شامت آئی رہتی۔ بڑی بی بی جی نے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ہر وقت اس پر طعنہ زنی کرتی رہتی کہ یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہو رہا ہے نہ تو اس حرام خور سے رابطہ بڑھاتی اور نہ یہ دن دیکھنے نصیب ہوتے۔ نوری دل میں کڑتی رہتی مگر زبان پر حرف شکایت نہ لاتی۔ ادھر توکل ہر رشتے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ وقت نے اس کے ماتھے پر گہری ناکامیوں کی داستان رقم کر دی تھی۔ اس کے دل میں صرف میاں نیاز علی کے قتل کی خواہش تڑپتی رہتی۔ جس کو پورا کرنے کے لیے وہ اس روز بھی حویلی آیا اور مداخلت کرنے پر اس نے کرم علی کو بھون ڈالا۔

کرم علی میاں نیاز علی کا باڈی گارڈ تھا۔ جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا۔ بڑے دالان میں اس کی چارپائی تھی جو عین میاں نیاز علی کے کمرے کے

آ گے تھی۔ توکل آگے بڑھتا مگر وہ جاگ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بندوق پکڑتا توکل نے چھوٹی سی پھرتی سے اوپر تلے فائر کر کے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا اور اس بار بھی وہ صاف بچ نکلا۔ ذخیرہ پہنچ کر وہ جگی میں بچھی پیال پر گر پڑا۔ تھکن سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ سجاول جو سب آدمیوں کے لیے کھانا وغیرہ بناتا تھا اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ توکل خالی نہیں لوٹا۔ "کیوں توکل کیا ہوا ہے؟" سجاول نے اس کی ٹانگ دبانے کے لیے اپنی طرف کرتے دریافت کیا۔

"اس بار بھی بچ نکلا ہے کمینہ، مگر میں نے اس کا آدمی بھون ڈالا ہے۔" توکل نے سگریٹ سلگاتے جواب دیا۔ "کب تک بچے گا ایک روز تیرے ہاتھوں اس کو ختم ہونا ہی پڑے گا۔ صبح ملک صاحب کو خبر مل جائے گی اور ہاں شاید اب یہ جگہ بھی تبدیل کرنی پڑے۔ ملک صاحب کو اطلاع ملی ہے کہ پولیس جلد ذخیرہ کا گھیراؤ کرنے والی ہے۔ ہو سکتا ہے بارڈر کی طرف نکلنا پڑے۔ ملک صاحب سے صبح بات ہو گی۔"

ملک صاحب نے توکل سمیت اپنے سارے آدمی خشک بیاس پار بھیج دیے۔ پولیس نے سارا ذخیرہ چھان ڈالا مگر کوئی بھی آدمی ہاتھ نہ لگا۔ میاں نیاز علی کو اس بات کا بھی صدمہ ہوا کیونکہ اس نے بڑی مشکل سے ایس پی صاحب کو یقین دہانی کروائی تھی کہ ملک تصدق کے آدمی ذخیرہ میں چھپے ہوتے ہیں۔ ملک صاحب کو اپنے خاص پولیس مخبر سے کارروائی کی اطلاع پہلے سے مل چکی تھی ورنہ اس بار میاں نیاز علی خاصا ہاتھ مار جاتا۔ اس آپریشن کے بعد علاقہ میں امن عامہ کی صورت حال کچھ ماہ کے لیے بہتر ہو گئی۔ میاں نیاز علی کو بھی یقین سا ہو گیا کہ اب ملک تصدق کی تخریبی کارروائیاں رک گئی ہیں۔ حالانکہ بات اس کے برعکس تھی۔

اسی دوران توکل کو اطلاع ملی کہ نوری کی شادی نیاز علی نے اپنے ایک ملازم شاہد ماچھی سے کر دی ہے۔ توکل کے دل پر چھریاں چل گئیں۔ وہ چیخ اٹھا اس کے دل کے اندر کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اسے یوں لگا جیسے ساری دنیا اندھیر ہو گئی ہے۔

وہ بالکل پاگلوں کی طرح سارا دن اکیلا جنگل میں بھٹکتا رہا۔ وہ اس خبر کے لیے بالکل تیار نہ تھا مگر یہ سنتے ہی کہ نوری کی شادی ہو گئی وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کیا۔ وہ ملک صاحب کے اگلے پیغام کے انتظار سے پہلے ہی ایک رات چپکے سے اپنے ساتھیوں کی آنکھ بچا کر اسٹین گن سمیت بھاگ نکلا۔ گھوڑا کھولتا تو ان کو شک ہو جاتا۔ اس لیے پیدل ہی نکل کھڑا ہوا۔ تمام رات سفر کرتا وہ بہت دور آ گیا تھا۔ دن کو تھوڑی دیر ایک جگہ آرام کرنے کے بعد دریا کی کندھی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسے سفر جاری رکھتے ہوئے کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ یہ علاقہ ذی روح سے پاک تھا۔ اس لیے وہ بغیر کسی خوف و خطر کے آگے بڑھ رہا تھا۔ گن اس نے اپنی چادر کے نیچے چھپا رکھی تھی۔ اسے ایک گھوڑے کی ضرورت تھی مگر راستے میں کسی بھی گاؤں کا ابھی نشان تک نہیں آیا تھا۔ دن ڈھلنے تک وہ بمشکل مچھیروں کی جھگیوں تک پہنچ سکا۔ بھوک سے وہ نڈھال ہو چکا تھا۔ یہاں اسے کھانا مل گیا اور رات بسر کرنے کے لیے جگہ بھی۔ دوسرے روز وہ منہ اندھیرے نکل کھڑا ہوا۔ توکل کو اگلے سفر کے لیے ان لوگوں سے خاصی معلومات مل چکی تھیں۔

دوپہر تک وہ بہادر پور گاؤں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ تھوڑی دیر تازہ دم ہونے کے بعد اس نے گن ایک جگہ چھپائی اور گاؤں میں داخل ہو گیا۔ وہ گھوم پھر کر جائزہ لینا چاہتا تھا کہ وہ گھوڑا کہاں سے چوری کر سکتا ہے۔ ایک ڈیرہ پر اسے گھوڑی بندھی نظر آ گئی۔ بڑی سبک رفتار گھوڑی دکھائی دے رہی تھی؟ کوئی شوقین لگتا تھا جس نے یہ گھوڑی رکھی ہوئی تھی۔ توکل راستے کو ذہن نشین کرتا واپس چل پڑا۔

گاؤں سے واپسی پر اس نے کھانے کے لیے کچھ

چیزیں خرید لی تھیں۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے بعد وہ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں لیٹ کر بے خبر سو گیا۔ رات گئے تک وہ سوتا رہا۔ اُٹھ کر اس نے جھاڑیوں میں سے اپنی سٹین گن نکالی اور گاؤں کی جانب قدم بڑھانے لگا جہاں گھوڑی بندھی تھی۔ اس ڈیرہ تک جانے میں اسے کوئی مسئلہ درپیش نہ آیا۔ کئی منٹ تک وہ دیوار کی اوٹ میں کھڑا اردگرد کا جائزہ لیتا رہا پھر وہ لکڑی کا جنگلا پھلانگ کر دبے قدموں چلتا کھرلی تک آ گیا۔ گھوڑی نے ناک کی پھنکار سے توکل کو دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کیا اور اپنے دونوں کان پیچھے کی جانب کھینچ کر کھڑے پر ادھر اُدھر بدکنے لگی۔ دُور چارپائی پر لیٹا ہوا آدمی ایک دم سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور چاروں طرف دیکھ کر دوبارہ کروٹ لیتا ہوا لیٹ گیا۔ توکل کچھ دیر ساکت و جامد وہیں پڑا رہا پھر رینگتا ہوا گھوڑی کے قریب پہنچ گیا۔

آہستہ آہستہ اس نے گھوڑی کی گردن سہلائی اور پھر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ گھوڑی نے اپنے اصیل ہونے کا ثبوت دیتے کان ہلانے شروع کر دیئے۔ توکل نے رسہ کھولا اور اس کے دونوں پچھلے پاؤں آزاد کرتے ہوئے گھوڑی کو لے کر باہر نکل آیا۔ جو راستہ اس نے منتخب کیا تھا وہ آبادی سے باہر جاتا تھا۔ ایک جگہ رُک کر توکل نے رسے کی باگ بنائی اور گھوڑی کی پیٹھ پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا دی۔ گھوڑی کمان سے نکلے تیر کی طرح سرپٹ دوڑنے لگی۔ توکل گھوڑ سواری میں اتنا ماہر ہو چکا تھا کہ بغیر کسی تکلیف کے مسلسل سفر کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ راستے میں ایک دو بار رُک کر اس نے راستے کا تعین کیا۔ پھر صحیح سمت کا اندازہ کر کے مطمئن انداز میں آگے بڑھتا رہا۔ وہ اذان ہونے سے پیشتر میاں نیاز علی کے گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اب جس راستے پر وہ چل رہا تھا وہ اس کا دیکھا ہوا تھا۔ اس لیے آگے بڑھنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دریا کی کندھی چھوڑ کر ذخیرہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ گھوڑی نے شاید پہلی بار اتنا سفر کیا تھا۔ اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا اس کے سینے میں میاں نیاز علی کے لیے نفرت کا الاؤ اتنا ہی شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ گاؤں سے باہر رُکتے ہوئے اس نے گھوڑی ایک درخت کے ساتھ باندھ دی اور اپنی سٹین گن کو اچھی طرح چیک کرتے ہوئے حویلی کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔ وہ بغیر کسی خوف کے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ فجر کی اذان کب سے ہو چکی تھی۔ گاؤں میں نمازی مسجد کی طرف آ جا رہے تھے۔ وہ حویلی کے دروازے پر پہنچ کر رُکا اور پھر گھوم کر ڈیرے کی طرف آ گیا۔ سامنے دالان کے بڑے تھڑے پر میاں نیاز علی بیٹھا مسواک کر رہا تھا اور ایک نوکر پانی کا لوٹا پکڑے قریب کھڑا تھا۔ توکل نے سٹین گن کا لیور کھینچا اور ایک دم میاں نیاز علی کے سامنے آ گیا۔

"میاں دیکھو میں تمہاری موت بن کر آیا ہوں۔ تمہیں کہا تھا ناکسی بے قصور پر ظلم مت کرو۔ مگر تُو اپنی فطرت سے مجبور فرعونیت کا دعویدار بنتا تھا۔ تُو نے مجھ پر بے شمار ظلم کیے۔ نوری کو مجھ سے جدا کر دیا۔ تُو شاید اپنے انجام سے بے خبر تھا۔ تُو نے میرے کسی پکڑنے والے ہاتھوں میں بندوق پکڑوا دی۔" اس سے پیشتر کہ میاں نیاز علی بھاگتا توکل نے اندھا دھند فائرنگ کر کے میاں کے پرخچے اُڑا دیئے۔ فائرنگ کی آواز پر میاں کے پالتو اسلحہ لے کر بھاگے آئے۔ توکل نے دوسری بار جو فائرنگ کی اس سے میاں کے تین آدمی اور ڈھیر ہو گئے۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں اپنی اسٹین گن ایک طرف رکھتے چاروں طرف دیکھا۔ حویلی کے سب لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے جن میں نوری بھی تھی۔ وہ آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں سے توکل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ توکل نے نظریں اُٹھا کر نوری کی طرف دیکھا دوبارہ اسٹین گن اُٹھائی اور وہاں جمع لوگوں کا مجمع چیرتا ہوا پولیس چوکی کی طرف چل پڑا۔

توکل کے خلاف قتل، ڈکیتی جیسے سنگین مقدمات درج ہو چکے تھے۔ اب توکل جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی زندگی کے کم ہوتے شب و روز سمیٹتا عدالت کے فیصلے کا منتظر ہے۔





''تم میری ہو''

عا۔ب۔شیریں

''جوڑے آسمان پر بنتے ہیں'' اس کہاوت کو جھٹلاتے ہوئے محبت کے نشہ میں آگے اور آگے بڑھتے ہوئے ایک نوجوان جوڑے کی کہانی' جو ایک دوسرے کو اپنانا چاہتے تھے مگر تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر سر جھکانے پر مجبور ہو گئے۔ شاید یہی ان کے نصیب میں لکھا تھا۔ ساری عمر اسی درد اور کسک میں گزارنے کا فیصلہ قدرت نے لکھ دیا تھا۔ حقیقت پر مبنی کہانی!

رات دھیرے دھیرے گزر رہی ہے۔ چاند کی روشنی چاروں طرف چھائی ہوئی ہے اور تمہارا شادی کا کارڈ میری میز پر پڑا منہ چڑا رہا ہے۔ آج تمہاری شادی ہے، اس وقت تم حجلہ عروسی میں سرخ جوڑا پہنے بیٹھی ہوگی۔ تمہاری اونچی مانگ میں کہکشاں پھیلی ہوئی ہوگی۔ اس مانگ کی سیدھ میں چلتے چلتے کوئی راہی اپنی سُدھ بُدھ بھول جائے گا۔ تمہارے چہرے پر زرتار دوپٹے کا آنچل پڑا ہوگا اور تمہارے چہرے کا حُسن اس میں سے چھن چھن کر کسی پر آفت ڈھا رہا ہوگا۔ مجھے پتہ نہیں یہ سب کیوں عجیب عجیب سا لگ

رہا ہے۔ تم تو اب کسی اور کی ہو چکی ہو۔ میرا اور تمہارا اب کیا رشتہ باقی رہ گیا ہے۔ اب تو تم زندگی کے کسی موڑ پر ملو گی بھی تو اجنبی بن کر۔

اپنی آنکھوں کے مدھ بھرے جادو سے بے خبر۔
ان لمحوں کے فسوں سے بے خبر جو کبھی میں نے اور تم نے اکٹھے گزارے تھے۔ آج مجھے ایک ایک بات یاد آ رہی ہے۔ ایک ایک گزرا لمحہ تیز و تند و نشتر ہے۔ میرے دل میں گھاؤ کر رہا ہے۔ تمہارے ساتھ گزری شامیں اپنے سحر سے آزاد ہو کر آوازیں دے رہی ہیں۔ رات کی تنہائیاں تڑپ تڑپ کر تم کو پکار رہی ہیں۔ دن کے اُجالے بھالے بن کر میرے جسم میں پیوست ہو رہے ہیں اور ایسے میں تم کہاں ہو؟ بولو نا۔

مجھے آج بھی سنگاپور کی وہ حسین شام یاد ہے جس دن میں تم سے پہلی دفعہ ملا تھا۔ مجھے نوکری کی وجہ سے سنگاپور گئے ابھی ایک ہی ماہ ہوا تھا۔ اکیلا بہت ہی پریشان ہوتا تھا۔ اس دن میں ماؤنٹ فیبر سیر کرنے گیا ہوا تھا۔ یہ پہاڑی سطح سمندر سے ساڑھے تین سو فٹ بلند ہے۔ اس کی چوٹی پر ایک ہوٹل ہے۔ وہاں میں کھڑا دُور بین سے سنگاپور کے جزیرے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر تم پر پڑی، ہلکے گلابی رنگ کے کپڑوں میں کھڑی تم کتنی پیاری لگ رہی تھیں۔ میں نے دُور بین چھوڑ دی اور تم کو دیکھنے لگا۔ تم میری نگاہوں کی تپش سے گھبرا اُٹھیں اور میرے پاس آ کر کہنے لگیں۔ ”آپ کے پاس سکہ ہوگا۔ میں بھی دُور بین میں ڈالوں گی۔“

میں نے تمہارے سامنے میز پر اپنا بٹوہ اُلٹ دیا۔ تم نے جلدی سے ایک سکہ اُٹھایا اور دُور بین میں ڈال کر جزیرے دیکھنے لگیں۔ اتنی دیر میں کھڑا تم کو دیکھتا رہا۔ تمہارے لمبے لمبے بالوں کو تکتا رہا۔ تم دُور بین کے پاس سے ہٹیں تو مجھے دیکھ کر کچھ پریشان

ہو گئیں۔ شام گہری ہو چکی تھی سیاح بھی اندر جا چکے تھے۔ صرف دو نوجوان جوڑے بیٹھے ایک دوسرے کی صورت تک رہے تھے۔ میں نے اس وقت ہمت سے کام لیا اور تمہارا ہاتھ پکڑ کر اپنی میز پر لے آیا۔ تمہارا نرم و نازک ہاتھ فرطِ جذبات سے کانپ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا تمہارے ہاتھ کو اپنے سینے سے لگا لوں۔ تاکہ میرے سینے کی تپش سے تمہارے ٹھنڈے ہاتھ بھی تپ جائیں۔ مگر میں چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکا۔ تم گھبراتی ہوئی میری میز پر بیٹھ گئیں۔ بیرا چائے لے آیا۔ تم نے چائے بنا کر دی اور میں اس چائے کو پاگلوں کی طرح ایک ہی سانس میں پی گیا۔ میری بے خودی دیکھ کر تم مسکرا اُٹھیں۔ پھر تم نے بتایا تمہارے بھائی اور بھاوج بھی سنگاپور میں ہیں۔ تم پاکستان سے کچھ ماہ کے لیے یہاں آئی ہوئی ہو۔ اکیلی بور ہوتی ہو۔ چھوٹے چھوٹے بے ربط جملوں میں تم بولتی گئیں اور میں سنتا رہا۔ فضا میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں اور میرے دل میں تمہارے جملے دھیرے دھیرے اُترتے جا رہے تھے۔

پھر ہم دونوں واپس اکٹھے آئے۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں اچھے دوست بن گئے۔ صبح تم فون پر مجھے جگاتیں۔ کانوں میں پہلے تمہاری آواز رس گھولتی۔ شام کو ہم اکٹھے گھومتے ہم کہاں کہاں نہیں گئے جہاں جاتے وہاں خوشبوؤں کا راج ہو جاتا۔ شفق پھوٹ پڑتی اور میں تو جیسے ان خوشبوؤں کے اس سمندر میں بہا چلا جا رہا تھا۔

تم کو یاد ہے وہ دن جب ہم سنگاپور کے بوٹینیکل گارڈن میں سیر کرنے گئے تھے۔ تمام دن ہم نے گھوم پھر کر گزارا۔ ایک دوسرے کی بانہوں کا سہارا لیتے جھومتے ہوئے اونچے اونچے درختوں کے سائے میں گھومتے رہے۔ تم جہاں سے گزرتیں تمہارے بالوں میں پھول اٹک جاتے اور جب تم جھک کر

اُٹھاتیں تو درخت پر بیٹھا بندر منہ چڑا رہا ہوتا۔ اس دن بندروں نے کتنا تنگ کیا تھا۔ میں نے نیچے بیگ رکھ کر اوپر کی طرف دیکھا ہی تھا کہ چشم زدن میں بندر بیگ اُچک کر لے گیا پہلے تو ہم حیران کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر جو ہنسے ہیں تو ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مجھے بچپن میں سُنی ہوئی بندر کی کہانی یاد آگئی جس میں بندر ٹوپی والے کی ساری ٹوپیاں اُٹھا کر لے گیا تھا۔ میرے پاس تو باقی کوئی چیز تھی نہیں۔ اب کیا کرتا بندر نے بیگ کھولنے کی بے انتہا کوشش کی مگر نا کام رہا۔ تنگ آکر اس نے بیگ پھینک دیا ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بندر کو ہم پر ترس آگیا۔

ایک دن تم کہنے لگی۔ بدھ کے دانت کا مندر دیکھنا ہے۔ میں تمہیں وہاں لے گیا۔ اتنی خوبصورت جگہ تھی کہ جی چاہتا تھا یہیں رہ جاؤ۔ سرسبز پہاڑی پر پھیلی ہوئی یونیورسٹی دیکھ کر سب ہی خوش ہورہے تھے میں تمہیں بدھ کے دانت والے مندر میں لے گیا۔ ایک کوٹھڑی سی تھی جس کے دروازہ پر بڑا سا قفل لٹک رہا تھا۔ لوگ کچھ چیزیں لاکر دروازے میں رکھتے اور منہ میں کچھ بدبدا کر چلے جاتے۔ مجھے دل ہی دل میں ہنسی آرہی تھی اور اپنے ہاں کے پیر فقیر یاد آرہے تھے۔ جہاں اس طرح چیزیں چڑھائی جاتی ہیں۔

اس دن تم نے سفید ساڑھی باندھی تھی۔ تمہاری مانگ میں سیندور لگا تھا اور ماتھے پر ننھی سی سرخ بندیا جھلملا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ واپس جا کر تم کو بٹھادوں گا۔ دیوی کی طرح اور تمہاری نظر اُتاروں گا۔ تمہیں پوجوں گا۔ تم تو میرے دل کی دیوی ہو۔ دل کے سنگھاسن سے میں تمہیں ہٹنے نہیں دوں گا۔

ابھی میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ تم نے بیگ کھولا۔ ایک رومال میں سے خشک میوہ اور پھل نکالے اور بڑی عقیدت کے ساتھ لے جا کر کوٹھڑی کے دروازے پر رکھ دیئے۔ چند لمحے خاموش خاموش کھڑی رہیں۔ پھر گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں چلو اب چلیں۔

میں تمہارے اس نئے روپ کو دیکھ کر مبہوت ہوگیا تھا۔ چپ چاپ تمہارے ساتھ واپس آگیا۔ بعد میں تم نے بتایا تمہاری ایک سہیلی نے آکر منت مانی تھی اور اس کی منت پوری ہوگئی۔

"رانی جی! پھر آپ نے کیا منت مانگی" میں نے تمہیں چھیڑتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے سب کچھ مانگ لیا جس کی مجھے ضرورت تھی" تم نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

"آخر آپ کو کیا ضرورت تھی" میں نے پھر پوچھا۔

تم نے اُٹھ کر اپنی جھیل سی گہری آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں اور میں اس جھیل میں غوطے کھانے لگا۔ تمہاری سرگوشی میرے کان میں گونجی۔

"میں نے تم کو مانگا تھا بدھ سے 'تم ہمیشہ میرے اپنے رہو گے نا' دیکھو مجھے زندگی میں کبھی نہ بھولنا"۔

میں نے تڑپ کر تمہارے دونوں کول ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور کہنے لگا۔

"میں نے تو اپنا آپ کب کا تمہارے حوالے کردیا ہے مجھ میں اور تم میں اب کوئی فرق نہیں۔ تم تو نہ بھولنے والی چیز ہو۔ میں اپنے آپ کو بھول سکتا ہوں مگر تمہیں نہیں تم تو میری روح کی گہرائیوں میں اپنا مقام پا چکی ہو۔ میرے انگ انگ میں تمہاری خوشبو سما چکی ہے۔ میرے دل میں تم ہو۔ تمہارا نقش میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتا" اور تم گہری گہری سانسیں لیتی میری سنتی رہیں۔ نہ جانے تمہیں یہ باتیں یاد بھی ہیں یا نہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ابھی ابھی تم میرے پاس سے اُٹھ کر گئی ہو۔ تمہاری خوشبو سائے میں پھیلی ہوتی ہے بعض دفعہ تو میں گھبرا کر سگریٹ پھینک دیتا ہوں اور دھوئیں کے مرغولے ہٹا کر تمہاری شبیہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

سنگاپور میں جب تم میرے ساتھ نائیگر بام گارڈن دیکھنے گئیں تو تم نے نارنجی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ نارنجی رنگ میں تمہارا حسن دوآتشہ کی طرح دہک رہا تھا۔ لوگ چلتے چلتے ہمیں مڑ کر دیکھتے اور تم دھیرے سے مسکرا دیتیں۔ ہم پہاڑی پر پھیلے ہوئے باغ کو دیکھتے رہے۔ اس باغ میں کوئی پودا نہیں تھا۔ کوئی درخت نہیں تھا، مختلف چینی کہانیوں کو مورتیوں کی زبانی پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ زیادہ تر مورتیاں ظلم وتشدد کی بولتی داستان تھیں۔ تم ان کو دیکھ کر چپ ہو جاتیں اور میں تمہیں چھیڑتا۔ ڈر گئی ہو نا!

"نہیں مجھے پتہ نہیں کیوں قتل و خون سے وحشت ہوتی ہے"۔

"قاتل تو تم ایمان سے پکی ہو"۔

تمہاری آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹ گئیں۔

"میں اور قاتل"۔

"ہاں..... ہاں تم ہو میری قاتل، تمہاری ان آنکھوں نے مجھے جیتے جی مار رکھا ہے"۔

تم کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ کیسے تھے وہ دن۔ اور کیسی تھیں وہ شامیں۔ کتنی جلدی وقت گزر جاتا ہے۔ چار ماہ دیکھتے ہی دیکھتے بیت گئے۔ تم اب واپس پاکستان جانے والی تھیں اور میں تمہارے جانے کے خوف سے ہی ادھ موا ہوا جاتا تھا۔ تم مجھے دلاسے دیتی دیتی رو پڑتی اور میں سب کچھ بھول کر تم کو چپ کرانے لگتا۔ میرا دل اپنے آپ ہی بھر آتا تھا۔ کیا اسی کا نام محبت ہے میں سوچتا۔ آخر وہ منحوس شام آ پہنچی جس دن تمہیں جانا تھا۔ اس دن تم صبح سے ہی میرے پاس تھیں۔ ہلکے موتیا رنگ کے جوڑے میں ملبوس موتیا کی کلی لگ رہی تھیں۔ تم نے میرا گھر سجایا تم کتنی ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں میرے لیے خرید کر لائیں۔ میری پسند کے برانڈ کے سگریٹ بھی۔ خوبصورت سے پیڈ تم نے میری میز پر رکھتے

چیونگم کا استعمال

ایک ایئر لائن اپنی فلائٹ کے مسافروں کو چیونگم تقسیم کرتی تھی جس کے پیکٹ پر لکھا تھا کہ طیارہ چلتے اور اُترتے وقت کانوں کو انجن کے شور سے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کریں ..... ایک مرتبہ ایک خاتون نے دوران پرواز ایئر ہوسٹس کو پاس بلا کر کہا۔ "اس چیونگم کو میرے کانوں سے نکالو مجھے تکلیف ہو رہی ہے....."

(مرسلہ: محمد یونس۔ گوجرانوالہ)

ننھے بچوں کیلئے ریسٹورنٹ

اب ننھے بچوں کو کھانا کھلانے کا مسئلہ ختم ہوگیا۔ برطانیہ میں کم عمر بچوں کیلئے پہلے ریسٹورنٹ کا افتتاح کردیا گیا۔ لندن کے علاقے کانونٹ گارڈنز میں کھولے گئے اس ریسٹورنٹ میں ننھے بچوں کی عمر کے لحاظ سے لذیذ فلیورز والے مختلف کسٹرڈز، جیلی اور دیگر آئٹم مینیو میں موجود ہوتے ہیں۔ بے بی فیڈنگ چیئرز لیے اس منفرد ریسٹورنٹ میں 6 ماہ سے 1 سال کی عمر تک کے بچے اپنے ماؤں کے ہمراہ کھانے کا مزا لوٹنے کے لئے تشریف لاسکتے ہیں۔

(مرسلہ: مریم یامین۔ سرگودھا)

ہوئے کہا۔ ان پر مجھے خط لکھنا۔ میرے منہ سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ میں فرطِ جذبات سے گنگ ہوگیا تھا۔ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے تمہاری دھندلی سی صورت تکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر تم نے میرے ساتھ جا کر فوٹو اتروائی۔ میرے ڈھیر سارے فوٹو نکال کر اپنے پرس میں رکھے۔ میں چپ چاپ تمہیں تکتا رہا۔

تم نے اپنے ہاتھ سے کھانا بنایا۔ اپنے کول

ہاتھوں سے مجھے بچوں کی طرح کھلایا۔ میرا دل بھرا آرہا تھا مجھے بھوک بھی نہیں تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا تمہارے سینے پر سر رکھ کر خوب روؤں، چیخیں مار کر گریباں چاک کردوں۔ سر ٹکراؤں، کیا کروں، مگر میں چپ تھا۔

شام آگئی، تم نے آہستہ سے میرے ماتھے کو چوما اور اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھیں لیے اپنے گھر کی طرف چلی گئیں۔ تم نے اپنے گھر سے سامان لینا تھا۔ پھر شام کو ایئر پورٹ پر تم سے ملنا ہوا۔ سفید ساڑھی میں تم اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔ بڑا سارا جوڑا بغیر کسی پھول کے ویران ہو رہا تھا۔ تمہارے بھائی بھابھی بھی ساتھ تھے۔ میں نے تمہارے لیے ساڑھی اور کچھ چیزیں لی تھیں۔ پیکٹ میں نے تمہارے ہاتھ میں پکڑا دیا اور وقت کتنی تیزی سے گزرا پتہ ہی نہیں چلا۔ سامنے جہاز کھڑا تھا۔ تم سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے مڑتیں اور مجھے دیکھتیں۔ آخری سیڑھی پر کھڑے ہو کر تم نے ننھا سا رومال ہلایا اور اندر چلی گئیں۔

تمہارے بھائی مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ معذرت چاہ کر میں ایئر پورٹ سے نکلا اور اپنے گھر آکر مجھے اپنی سدھ بدھ بھی نہ رہی۔ ایک ہفتہ اس بے تابی سے کاٹا کہ توبہ بھلی۔ تمہاری لائی ہوئی چیزیں دیکھتا تمہاری تصویر سامنے رکھے ڈھیر ساری باتیں پاگلوں کی طرح کرتا رہتا۔ پھر تمہارے خط آنے شروع ہوئے۔ ان میں بھی اتنی ہی چاہت کا اظہار ہوتا۔ میرے پاس ایک سوٹ کیس صرف تمہارے ہی خطوں سے بھرا پڑا ہے۔ میں کس کس بات کو بھلاؤں کس چیز کو فراموش کردوں۔ میں تو تمہارے سراپے میں ایسا اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو سلجھا نہ سکتا تھا۔ دن گزرتے گئے۔

پھر میں نے اپنی چھوٹی بہن کو پاکستان لکھا۔ اسے اپنا راز دار بنایا۔ اسے اپنی محبتوں کی شدت کا یقین دلایا اور کہا میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

میری بہن تمہارے گھر گئی۔ تم اس سے بڑی محبت سے ملیں۔ اس کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں کی۔

میری بہن نے تمہاری امی سے شادی کے متعلق بات کی تو وہ کہنے لگیں۔ ہمارے ہاں خاندان میں شادی ہوتی ہے اور اس کی منگنی تو بچپن سے ہوئی ہے۔ ہم توڑ نہیں سکتے۔ میری بہن اپنا سا منہ لے کر واپس آگئی۔ جب مجھے سارے حالات معلوم ہوئے تو میں پاگل بن گیا۔ تمہیں نجانے کیا کیا لکھا مگر تم نے چپ سادھ لی۔ پھر تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔ میں نے تمہیں کتنا کتنا کوسا۔ گالیاں دیں۔ شکوے شکایت کے دفتر کھولے مگر تمہاری خاموشی نہ ٹوٹی۔ وقت گزرتا گیا۔

اور آج صبح مجھے تمہاری شادی کا کارڈ ملا ہے۔

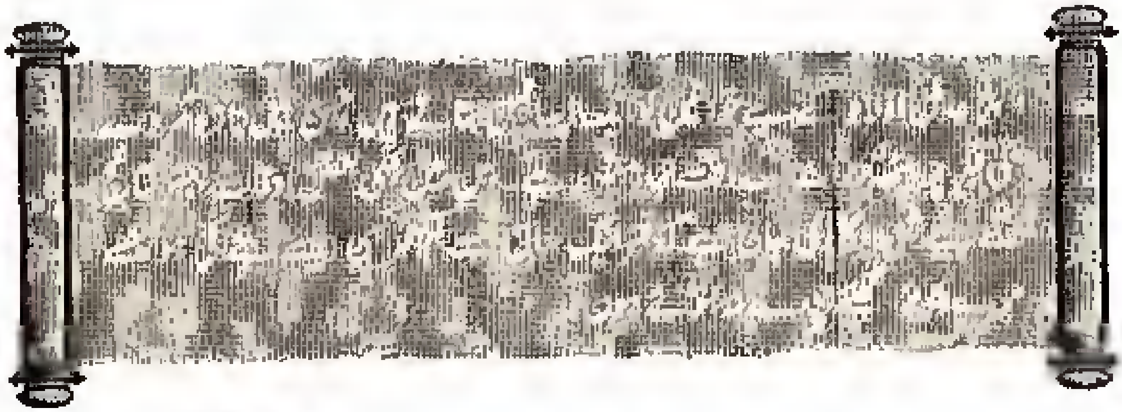
صبح سے میں اسی طرح بیٹھا نجانے کیا کیا سوچ رہا ہوں۔ تصور میں تم کو دلہن بنایا، سیج پر لا کر بٹھایا۔ ابھی بات بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اس کارڈ پر نظر پڑی میں پھر ہوش میں آگیا۔ تم سامنے ہوتیں تو تم سے ضرور کچھ پوچھتا۔ تمہیں کس طرح میں اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دوں۔ تم تو میری روح ہو۔ روح کبھی جسم سے علیحدہ ہو سکتی ہے۔ میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا۔ شدت جذبات سے میرا جسم لرز رہا ہے۔ کاش تم میری بن جاتیں۔ تم صرف میری اپنی ہوتیں۔ میرا دل پکار پکار کر کہہ رہا ہے مگر تم تک میری آواز نہیں پہنچ سکتی۔

میرے دل کی دھک دھک میں یہی گونج رہا ہے۔ رات گزرتی جا رہی ہے۔ دھیرے دھیرے رات کا فسوں پھیلتا جا رہا ہے اور میں بیٹھا اپنے دل کی آواز سن رہا ہوں۔

تم میری ہو...... تم میری ہو......!

کالا جادو

حافظ سعید





ایک صحافی کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ، وہ کالا جادو کرنے والوں کو بے نقاب کرنے چلا تھا!

ان دنوں میں ایک مقامی اخبار کے انویسٹی گیشن سیل میں تھا۔ بنیادی طور پر میرے ذمہ کرائم رپورٹنگ ہی تھی لیکن اخبار کے مالک نے مجھ سمیت دو اور رپورٹرز پر مشتمل انویسٹی گیشن ٹیم بنا دی تھی۔ اب روٹین کی خبروں کے ساتھ ساتھ ہفتہ وار ...

... بار سنسنی خیز رپورٹس دینا بھی ہماری ذمہ داری تھی۔ اخبار کی ساکھ اور بجٹ اتنا ہی تھا جتنا عموماً درمیانے درجے کے مقامی اخبارات کا ہوتا ہے۔ اس لئے اندرونی حالات بھی ویسے ہی تھے۔ ہم ہفتے میں دو تین ...

کی شکل دے دیا کرتے تھے جسے خصوصی اہتمام کے ساتھ اخبار میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ یہی ہمارا انویسٹی گیشن سیل تھا جس کی بنیاد پر اخبار کا مالک اپنے کاروباری حریفوں پر رعب جمایا کرتا تھا۔

ایک دن ہمیں حکم ملا کہ روٹین کی ساری خبریں چھوڑ کر ساری توجہ شہر میں موجود عاملوں اور ڈبہ پیروں پر مرکوز کر دو۔ اخبار کے موٹے مالک نے منہ سے جھاگ اُڑاتے ہوئے مکہ لہرایا اور کہا مجھے ہر روز ان کے خلاف دھانسو قسم کی 'سٹوری' چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تصویریں بھی ہوں۔ اسی دن اخبار کے پہلے صفحے کا ایک چوتھائی حصہ ان سٹوریز کیلئے مختص ہو گیا جو ہم تین رپورٹرز پر مشتمل "انویسٹی گیشن سیل" نے دینی تھیں۔ اس ساری صورت حال کا پس منظر ہمیں اگلے دن معلوم ہوا۔ ہمارے مالک کی بیوی کسی پیر سے متاثر تھی۔ پیر صاحب کے مطابق وہ کالے اور نوری دونوں علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ مالک کی بیوی کو ان بابا جی سے اس کی ہمسائی نے متعارف کروایا تھا۔ بابا جی اس کے گھر آئے تو ہمارے اخبار کا مالک بھی ان کا مرید بن گیا۔ اس پیر نے ایک ہفتہ اخبار کے مالک کے گھر ڈیرہ لگائے رکھا اور ہمارے اخبار کو پاکستان کا سب سے بڑا اخبار بنانے کے لئے وظائف کرتا رہا۔ ایک ہفتے بعد معلوم ہوا کہ وہ جعلی پیر تھا کیونکہ وہ اچانک اس گھر سے غائب ہو چکا تھا۔ اگر بات صرف "پیر صاحب" کے غائب ہونے تک محدود رہتی تو شاید معاملہ اتنا سنگین نہ ہوتا لیکن بابا جی جاتے جاتے گھر میں موجود رقم اور زیور بھی لے اُڑے تھے۔ جس کی وجہ سے شہر بھر کے "پیروں" کی شامت آ گئی تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ ہم روز کسی نہ کسی عامل، پیر، سادھو یا طوطا فال والے کو جا پکڑتے۔ اس کی تصاویر بناتے اور اس سے کچھ سوال و جواب کرتے۔ اس کے بعد ایک ایسی سٹوری لکھی جاتی جس کے مطابق شہر بھر میں ہونے والے جرائم کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہو۔ اگلے دن یہ خبر دھوم دھام سے شائع ہوتی۔ ہم جب بھی کسی عامل کی تصاویر لاتے ہمارا مالک سب سے پہلے بغور ان تصاویر کا جائزہ لیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کا خیال ہو کہ کسی دن اس کے قابل رپورٹر اسی عامل کا پتہ چلا لیں گے جو اسے لوٹ کر فرار ہوا تھا۔ عاملوں کے خلاف ان خبروں والے اخبارات ڈی سی او سے لے کر متعلقہ تھانے تک کو بھیجے جاتے تھے جس کی وجہ سے ہر روز کسی نہ کسی عامل یا ڈبہ پیر کے خلاف معمول کی کارروائی ہو جاتی تھی۔ ابتداء میں تو میں اس نئی مصیبت سے تنگ آ گیا۔ روٹین کی خبریں چھوڑ کر روز کسی نہ کسی عامل یا جادوگر کو تلاش کرتا اور اس کے خلاف لگ بھگ پچھلے دن جیسی کہانی لکھنا میرے نزدیک وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

پریس کلب جاتا تو وہاں بھی صحافی دوست مذاق اُڑاتے کہ تمہارے مالک کو لوٹنے والا پیر پکڑا گیا یا نہیں؟ بہرحال یہ مذاق ہی ہوتا تھا کیونکہ لگ بھگ سبھی صحافیوں کو معلوم تھا کہ ہمارے ہاں مقامی اخبارات کا معیار کیا ہے اور چھوٹے اخبارات کے اکثر مالکان کس طرح اس مقدس پیشے کو ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

میرے ساتھ دیگر دو رپورٹرز میں اشرف شاہ اور مجیب ریاض شامل تھے۔ مجیب ریاض تو اس صورت حال پر باقاعدہ رپورٹنگ روم میں بیٹھ کر اخبار مالک کو بُرا بھلا کہتا تھا جس کی وجہ سے ہم کرائم بیٹ سے کٹ آؤٹ ہو گئے تھے اور اپنی گرفت کھوتے چلے جا رہے تھے۔ البتہ مجھے اور اشرف شاہ کو اب اس اسائنمنٹ میں بھی مزا آنے لگا تھا۔ ہم نے اپنی دلچسپی کے راستے تلاش کر لئے تھے۔ صبح گیارہ بجے

رپورٹرز کی میٹنگ کے بعد ہم سیدھے کسی ایسے جعلی عامل کے اڈے پر پہنچ جاتے جس کے بارے میں ایک روز قبل ہی فیصلہ کرلیا ہوتا تھا۔ وہاں جا کر چند تصاویر بنانے کے ساتھ ساتھ اردگرد کے لوگوں سے اس کے بارے میں سوالات کرتے اور اپنی سٹوری مکمل کرنے کے بعد ایسی جگہوں کی خاک چھاننے لگتے جہاں بیچ میں عملیات ہوتے ہوں۔ اس اسائنمنٹ کے دوران ہم نے شہر بھر کے قبرستان چھان مارے۔ اس کے علاوہ دریا کے کنارے اور ہندوؤں کے شمشان گھاٹ پر بھی گئے۔ آہستہ آہستہ میری دلچسپی بڑھنے لگی اور میں نے کالے جادو اور دیگر عملیات کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنی شروع کردیں۔ چند ہفتوں میں ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ شہر میں کہاں کہاں کون کون سے عامل یا جادوگر موجود ہیں اور کس کا کیا پس منظر ہے۔ اسی طرح عملیات کے طریقہ کار، چوکی لگانا اور ہانڈی اُڑانا جیسے کاموں کے بارے میں بھی میرے پاس سیر حاصل معلومات اکٹھی ہوگئیں۔ میرے ساتھ ساتھ اشرف شاہ بھی اس سارے سلسلے میں برابر کا شریک تھا جبکہ مجیب ریاض اپنی سٹوری بنانے کے بعد یا تو دفتر بیٹھا رہتا یا پھر پریس کلب چلا جاتا۔ وہ یہ اسائنمنٹ مجبوری کے عالم میں ہی پوری کررہا تھا لہٰذا روز اس پیر کو کوستا جو ہمارے مالک کے گھر کا صفایا کرگیا تھا۔

میری کئی عاملوں اور جادوگروں سے دوستی ہوچکی تھی جن سے کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوجاتی تھی۔ انہی میں سے کالے جادو کے ایک ماہر نے بتایا کہ اکثر عامل اولاد کے لیے خواتین کو ایک ایسا عمل بتاتے ہیں جس میں تازہ مُردے کی قبر پر بیٹھ کر رات کے وقت نہانا شرط ہے۔ اس میں بھی بعض اوقات بہتر نتائج کے لیے شرط لگا دی جاتی ہے کہ قبر ایک سال سے کم عمر کسی ایسے بچے کی ہو جسے مرے 24 گھنٹے پورے نہ ہوئے ہوں۔ اس عمل کے دوران یہ شرط بھی ہوتی ہے کہ اگر عمل کرنے والی خاتون کو اس طرح قبر پر بیٹھ کر نہاتے کوئی دیکھ لے تو بھی عمل ادھورا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح متعدد شرائط کے ساتھ یہ عمل اولاد نرینہ کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ کھلم کھلا قبر کی توہین ہے۔ دراصل کالا جادو سارا ہی شیطان کی عبادت اور اسلامی تعلیمات کی توہین پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے کرنے والے کو کافر کہا جاتا ہے۔ ایسے عملیات کرنے والوں میں گورکن اور قبرستان انتظامیہ کے افراد بھی شامل ہوتے ہیں اور اپنا حصہ لے کر آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔

ایک دن دفتر آتے ہوئے میں نے ایک جنازہ دیکھا اس جنازے کے آگے آگے ایک آدمی کفن میں لپٹی کسی بچے کی میت کو ہاتھوں میں اٹھائے چلا آرہا تھا۔ میں عادت کے مطابق جنازے کے احترام میں ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ جنازہ گزرنے کے بعد میں دفتر آگیا لیکن کچھ ہی دیر بعد ذہن میں خیال آیا کہ ضرور اس بچے کی قبر پر بھی کسی کی نظر ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی قبر پر کالے جادو کے ماہرین کی خاص نظر ہوتی ہے اور وہ اس کے انتظار میں رہتے ہیں۔ بچے کی روح معصوم ہوتی ہے اس لیے ان کے ہاں یہ بات عام ہے کہ بچے کا ہمزاد قابو آجائے تو وہ طاقتور ترین موکل ثابت ہوتا ہے۔ ان باتوں میں کس قدر سچ ہے اس سے قطع نظر میری دلچسپی صرف ایک دھماکہ خیز سٹوری تک تھی۔ میں نے اشرف شاہ سے بات کی تو وہ بھی اس بات پر رضامند ہوگیا کہ ہم آج رات قبرستان میں گزاریں گے اور اگر کوئی عامل اس قبر تک آیا تو اس کو رنگے ہاتھ پکڑ کر ایک بھرپور خبر تیار کرلیں گے۔ اس شام میں اور اشرف شاہ مغرب کے فوراً بعد ہی قبرستان پہنچ گئے اور بچے کی قبر سے کچھ ہی دور ایک پختہ قبر کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔

وفا

O......وفا وہ منزل ہے جس کا پتہ محبت آج بھی ڈھونڈ رہی ہے۔
☆......وفا وہ دل ہے جو ہمیشہ دھڑکتا ہے۔
O......وفا ایک ایسا آنسو ہے جو خاموشی سے ڈھلک جاتا ہے۔
☆......وفا وہ دامن ہے جو ہمیشہ محبت کے آگے پھیلایا جاتا ہے۔
O......وفا ایک آئیڈیل ہے جو کبھی محبت کو حاصل نہیں کرسکتا۔

(مرسلہ: رابعہ بشیر/لاہور)

چاندنی رات کی وجہ سے قبرستان ہر روز کی طرح مکمل اندھیرے میں نہیں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ دور تک کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ ہم کافی دیر تک بچے کی قبر پر نظریں جمائے بیٹھے رہے لیکن وہاں کوئی نہ آیا۔ آدھی رات کے بعد اشرف شاہ نے سرگوشی میں کہا۔

شاہ! میرے خیال میں اب چلتے ہیں۔ یہاں کوئی نہیں آنے والا۔

اس کی بات سن کر میں نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ آدھا گھنٹہ اور دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد چلے جائیں گے۔

ابھی میری بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ ہمیں پائل کی جھنکار سنائی دینے لگی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ اٹھی۔ بچپن میں چڑیلوں کے بارے میں سنی سبھی کہانیاں ذہن میں تازہ ہونے لگیں۔ آدھی رات کو قبرستان میں پائل کی جھنکار مضبوط سے مضبوط اعصاب کے مالک شخص کو بھی لمحہ بھر کے لیے ڈگمگانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم حوصلہ ہار بیٹھتے ہمیں ایک خاتون اسی جانب آتی نظر آئی۔ پائل کی جھنکار اسی کے قدم اٹھانے پر سنائی دے رہی تھی۔ اس نے ہاتھ میں ایک بالٹی اٹھا رکھی تھی۔ اردگرد سے بے خبر وہ سیدھی بچے کی قبر کے پاس آئی اور اس پر بیٹھ گئی۔ ہم نے منہ پھیر لیا کیونکہ وہ برہنہ ہوکر غسل کر رہی تھی۔ پانی گرنے کی آواز اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ قبرستان کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ اس کی حالت کے پیش نظر ہم اسے قبر کی بے حرمتی سے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد پانی کے گرنے کی آواز تھمی تو ہم اس قبر کی اوٹ سے نکل کر اس خاتون کے سامنے آگئے۔ ہمیں دیکھ کر وہ نہ صرف گھبرا گئی بلکہ قدرے پریشان بھی ہوگئی۔ وہ جان گئی تھی کہ ہماری موجودگی کی وجہ سے اس کا یہ عمل تو ناکام ہوا ہی ہے لیکن اب ہم اس کی بدنامی کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔ اشرف شاہ نے اپنے کیمرے سے اس کی تصاویر بنانا شروع کیں تو وہ مزید خوفزدہ ہوگئی۔ ہم نے اسے روایتی صحافیانہ انداز میں کہا کہ اگر وہ ہمیں اصل کہانی سے آگاہ کردے تو اس کا نام کہیں نہیں آئے گا بصورت دیگر اس کی تصاویر اور اس حرکت کے بارے میں اخبار میں سٹوری چھاپ دی جائے گی۔ کچھ پس و پیش کے بعد وہ ہمیں اصل کہانی سنانے پر آمادہ ہو گئی۔ وہ اولادِ نرینہ کے لیے ہی یہ عمل کر رہی تھی۔ اس کی مجبوری اور اس عمل کی وجہ ایک الگ کہانی ہے اس لیے وہ پھر کسی وقت سناؤں گا۔ بہرحال اس سے ہمیں اس عامل کا بھی معلوم ہوگیا جس نے اسے یہ عمل کرنے کا کہا تھا۔

اگلے دن دوپہر کے وقت اشرف شاہ کہنے لگا کہ ہم اس عامل سے ملتے ہیں اور پھر کل رات والی کہانی اور اس عامل کی کہانی کو ملا کر زبردست رپورٹ بن جائے گی۔ میں نے اسے منع کرتے ہوئے بتایا کہ میری اطلاعات کے مطابق وہ عامل واقعی کالا جادو کرتا ہے اور اسے اس حوالے سے ماہر جادوگر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس کے منہ نہیں لگ کر کسی

مصیبت کو دعوت دینے سے گریز کرنا چاہیے۔ اشرف شاہ نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا اور اکیلا ہی اس عامل سے ملنے چلا گیا۔ اگلے دن اس نے اس عامل کی تصاویر اور یہ پوری کہانی شائع کروا دی البتہ اس خاتون کی تصاویر میرے کہنے پر شائع نہیں کیں۔ وہ ایک عزت دار گھرانے کی خاتون تھی جو انتہائی مجبوری کے عالم میں اس عامل کے چکر میں پھنسی تھی۔ اخلاقی طور پر اس کی عزت اچھالنا درست نہیں تھا۔

اشرف شاہ کی یہ سٹوری بہت مشہور ہوئی اور بچے کے لواحقین نے قبر کی اس طرح بے حرمتی کروانے پر عامل کے خلاف احتجاج بھی کیا۔ کچھ دن یہ معاملہ اچھلتا رہا اور پھر حسب معمول سرد خانے کی نذر ہو گیا۔ اشرف شاہ کے بقول جب وہ عامل کی تصاویر بنا رہا تھا تو اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم مجھے نہیں جانتے۔ مجھ سے پنگا لو گے تو خون تھوکتے مرو گے۔ اشرف شاہ نے اس کی یہ بات نظر انداز کر دی۔ ہم چونکہ ایسی جگہوں پر علاقائی پولیس کو ساتھ لے کر جاتے تھے اس لیے ان عاملوں کی جانب سے نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس عامل سے ملنے کے بعد جب اشرف شاہ واپس دفتر آیا تو ہنستے اور اس عامل کی نقل اُتارتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وہ پولیس کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔ وہ پولیس والوں کو تو جلا کر راکھ کر نہیں سکا البتہ مجھے موت کی خبریں سنا رہا تھا۔

کچھ دن یونہی گزر گئے پھر ایک دن اشرف شاہ دفتر نہ آیا۔ اس کے گھر فون کیا تو معلوم ہوا کہ رات اس کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی جس پر اسے ہسپتال لیجایا گیا تھا۔ ہم بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اشرف شاہ کو ہیپاٹائٹس سی سمیت متعدد بیماریاں لاحق ہیں۔ اس کے تمام ہی ٹیسٹ مختلف بیماریوں کو ظاہر کر رہے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ جس شخص کو کبھی سر درد تک نہیں ہوا وہ اچانک اس قدر بیماریوں کا شکار کیسے ہو گیا۔ اشرف شاہ کو ایمرجنسی میں رکھا گیا تھا۔ وہ مسلسل خون کی اُلٹیاں کر رہا تھا جس کی وجہ سے اس کے جسم میں خون کی کمی بھی ہو گئی تھی۔ اسے خون لگایا جا رہا تھا۔

اشرف شاہ ایک ہفتہ اسی طرح ہسپتال میں انتہائی نگہداشت میں رہا اور خون کی اُلٹیاں کرتا رہا۔ ایک ہفتہ بعد اس کے بھائی کا فون آیا وہ روتے ہوئے بتا رہا تھا کہ "اشرف شاہ مر گیا ہے"۔ ایک ہنستا مسکراتا صحت مند صحافی چند ہی دنوں میں جان لیوا بیماری کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ اسی دن مجھے اجنبی نمبر سے فون آیا۔ فون کرنے والے نے اپنا تعارف ایک عامل کے طور پر کروایا اور کہا: اس دن تم نے میری بالکی کی عزت بچائی تھی اور اس کی تصویر شائع ہونے سے روکی تھی۔ اس لیے تم بچ گئے ہو۔ جس نے میرے علم کا مذاق اڑایا اس کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا اس نے کال منقطع کر دی اور وہ نمبر بھی بند ہو گیا۔

جہاں تک میڈیکل سائنس کہتی ہے۔ اشرف شاہ ہیپاٹائٹس جیسی مہلک بیماری کی آخری سٹیج پر تھا۔ یہ بیماری اندر ہی اندر اس کے جگر کو تباہ کرتی رہی لیکن بظاہر اس کے اثرات واضح نہ ہوئے۔ اشرف شاہ کو بھی اس کا علم تب ہوا جب اس کا معدہ خون سے بھرنے لگا اور وہ خون کی اُلٹیاں کرنے لگا۔ اس بیماری نے جہاں ہزاروں پاکستانیوں کی جان لی وہیں اشرف شاہ بھی اس کا شکار ہو گیا۔ دوسری جانب ہمارے دفتر کے عملے سمیت متعدد دوستوں کا کہنا ہے کہ ہیپاٹائٹس محض ایک بہانہ تھا ورنہ اشرف شاہ کو کالے جادو کے ذریعے قتل کیا گیا ہے۔ اس عامل نے بھی یہی کہا تھا کہ تم خون تھوکتے مرو گے اور پھر واقعی چند دن کے اندر اندر اشرف شاہ خون تھوکتے مر گیا۔








TOP

محبوب، محبوبہ اور شوہر

نواز خان

''وہ ایک ضدی لڑکی تھی، اس نے ایک شخص سے تھپڑ کا بدلہ لینے کے لیے اپنی زندگی جہنم بنالی''

پچھلی دفعہ میں نے گوبند سنگھ نامی نوجوان کا ذکر کیا تھا۔ارائیں گھرانے کا یہ لڑکا ایک دوڑ کے دوران گم ہوگیا تھا اور کوشش کے باوجود مل نہیں سکا تھا۔گوبند کے ساتھ ''شاہی'' نام کے غنڈے کا ذکر بھی آیا تھا۔شاہی ایک بھگوڑا فوجی تھا اور خود کو ڈوگر بتاتا تھا۔اس کے پاس ہر وقت ایک تلوار رہتی تھی اور مشہور تھا کہ وہ تلوار کے مقابلے میں اپنے سامنے کسی کو ٹکنے نہیں دیتا تھا۔

گوبند کو گم ہوئے تقریباً آٹھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک روز علاقے کا ایک مشہور جیب کترا جیکی میرے پاس آیا۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے وہ عیسائی تھا۔ ڈلہوزی کے بدقماش افراد میں اُس کا اُٹھنا بیٹھنا تھا اور ارد گرد کا ہر بدنام اڈہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔جیکی جیسے لوگ اپنی مرضی سے تھانوں کا رُخ کم ہی کرتے ہیں اور جب کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے ضرور کوئی اہم بات ہے۔جیکی بھی ایک اہم معاملہ لے کر تھانے آیا تھا۔رسمی بات چیت کے فوراً بعد وہ اصل موضوع پر آگیا۔کہنے لگا'' جناب عالی! میں ایک بڑی خاص خبر لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے آپ کا وقت بڑا قیمتی ہے۔اگر یہ خبر خاص نہ ہوتی تو میں کبھی آپ کو تکلیف نہ دیتا''۔

ایک لمحے کے لیے رُک کر اُس نے گلا صاف کیا اور میز پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا'' جناب کل ہفتہ تھا ہر ہفتے کی شام ''صدر'' کے ایک چائے خانے میں ناچ گانے کی محفل جمتی ہے۔چائے خانے کے مالک کا نام گلزار خاں ہے میرا خیال ہے آپ اُسے جانتے ہی ہوں گے''۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہاں......ہاں' تم آگے بولو''۔

وہ کہنے لگا'' کل رات وہاں شاہی بھی موجود تھا ناچ گانے کے بعد تاش کی بازی ہونے لگی۔شاہی بھی کھیل رہا تھا۔اس نے رم کے کئی گلاس چڑھائے ہوئے تھے اور نشے میں دھت تھا۔کھیل کے دوران اس کا مہیش نامی ایک پٹھان کوٹی سے جھگڑا ہوگیا۔دراصل مہیش نے کھیل میں بے ایمانی کی کوشش کی تھی۔شاہی آگ بگولا ہوگیا اس نے

اُٹھ کر میز اُلٹا دی اور مہیش کو گالیاں دینے لگا۔ گرماگرمی میں اس کے منہ سے ایک عجیب بات نکل گئی کہنے لگا" یہ جوا ہے اور جوئے میں دھوکا کرنے والے کا منہ توڑ دیتا ہوں۔ اس حرامی گوبند کا نام سنا ہوگا تم نے اس نے بھی دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کتے کے پلے کا نشان مٹا دیا میں نے" نشے کی وجہ سے اسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ کیا کہہ گیا ہے۔ موقعے پر موجود جن لوگوں کو اس کی بات سمجھ میں آئی وہ حیرانی سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ حیران ہونے والوں میں میں بھی شامل تھا جناب عالی..... کل سے سوچ رہا تھا کہ اس بات کی اطلاع آپ کو ملنی چاہئے گوبند ہمارے محلے کا لڑکا تھا۔ زیادہ میل جول نہ سہی، علیک سلیک تو تھی۔ ہمیں اس کے نہ ملنے کا دُکھ ہے۔ اس کی بوڑھی ماں کو دیکھتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

جیبی اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گیا اور میں ذہن میں زبردست ہلچل محسوس کرنے لگا۔ یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی اور جیبی کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے درست کہہ رہا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجرم کوئی جرم کرتا ہے اور جب جرم کرنے کے کافی عرصے بعد تک بھی اسے کوئی سزا نہیں ملتی تو وہ اپنے جرم کے بارے میں لاپرواہ ہو جاتا ہے اور کسی وقت شیخی میں آ کر جرم کا اعلان بھی کر دیتا ہے۔ میں نے جیبی سے کچھ تفصیلات پوچھیں اور اس کے فوراً بعد شاہی پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسا کہ میں نے پچھلی کہانی میں بتایا تھا شاہی نے تیمور والے کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری کرائی تھی لیکن یہ ایک بالکل دوسرا معاملہ تھا۔ اور اس میں میں بلا روک ٹوک شاہی کو ہتھکڑی لگا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا شاہی ایک خطرناک غنڈہ ہے اور آسانی سے گرفتاری نہیں دے گا۔ لہٰذا میں نے خود اس کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

ایک حوالدار اور دو کانسٹیبل لے کر میں اس کی طرف روانہ ہوا۔ جیبی کی زبانی مجھے پتہ چلا تھا کہ شاہی اس وقت اپنے ڈیرے پر ہوگا۔ اس کا ڈیرہ "ست دھارا" کے راستے میں پیر توکل کے مزار کے قریب تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈیرے پر ہر وقت لوفروں کا مجمع لگا رہتا ہے اور ان لوفروں میں بعض اوقات خطرناک غنڈے بھی اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ڈیرے میں گھس کر شاہی پر ہاتھ ڈالنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے شاہی کو کسی بہانے ڈیرے سے باہر بلایا جائے اور پھر موقع دیکھ کر ہتھکڑی ڈال دی جائے۔ اس مقصد کے لیے ہیڈ کانسٹیبل قادری کو استعمال کیا جا سکتا تھا۔ قادری صرف دو روز پہلے میرے تھانے میں تبدیل ہو کر آیا تھا۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ پولیس کا آدمی ہے۔ میں اسے سادہ کپڑوں میں لایا تھا۔ وہ اندر جا کر شاہی کو بہانے سے باہر لا سکتا تھا۔ قادری کو پوری بات سمجھا کر میں نے شاہی کے ڈیرے پر بھیج دیا اور خود قریبی درختوں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ حوالدار پربت سنگھ اور ہیڈ کانسٹیبل میرے ساتھ تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل کے پاس تھری ناٹ تھری رائفل اور میرے پاس 38 بور کا ریوالور تھا۔ گاڑی ہم نے قریب ایک فرلانگ پیچھے ہی کھڑی کر دی تھی اور امید نہیں تھی کہ وہ شاہی یا کسی دوسرے شخص کی نظر میں آ سکے گی۔

ہیڈ کانسٹیبل قادری اندر چلا گیا اور ہم پوری طرح چوکس ہو کر شاہی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ قریباً پانچ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ شاہی نکلا نہ قادری کی صورت نظر آئی اور نہ ہی کوئی تیسرا شخص دکھائی دیا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو سمجھایا تھا کہ وہ اندر پہنچتے ہی شاہی سے بات کرے اور اُسے بتائے کہ پشاور سے دو آدمی اسے ملنے آئے ہیں۔ وہ ڈیرے پر آنا نہیں چاہتے اس لیے باہر کھڑے

ہیں۔ پشاور میں کچھ جرائم پیشہ لوگوں سے شاہی کے تعلقات تھے اور مجھے امید تھی کہ پشاور کے مہمانوں کا ذکر سن کروہ افراتفری میں باہر آجائے گا۔ میرا خیال تھا کہ شاہی کے باہر آنے میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے...... لیکن اب آٹھ منٹ ہونے کو آئے تھے۔ گزرنے والے ہر سیکنڈ کے ساتھ ہماری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ یقیناً اندر کوئی گڑبڑ ہوچکی تھی۔ چند ہی لمحے بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اچانک ڈیرے کا بیرونی پھاٹک ایک جھٹکے سے کھلا اور کوئی شخص لڑھکتا ہوا باہر آگرا۔ میں نے سفید لباس سے پہچانا۔ وہ قادری کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یوں لگا جیسے قادری نے بھاگ کر پھاٹک سے گزرنے کی کوشش کی اور کسی نے زوردار طریقے سے اُسے دھکا دے دیا۔ جونہی قادری دوبارہ اُٹھا تین افراد بھوکے کتوں کی طرح اس سے لپٹ گئے۔ وہ اسے مار رہے تھے اور کھینچ کر پھر اندر لے جانا چاہتے تھے۔ ان میں شاہی بھی تھا۔ اپنے لمبے قد اور چمکتی ٹنڈ کی وجہ سے وہ صاف پہچانا جارہا تھا۔

قادری کی مارپٹائی کا منظر دیکھ کر ہمارے لیے خاموش کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ نہ ہی سوچنے کا وقت تھا کہ اس مارپٹائی تک نوبت کیونکر اور کیسے پہنچی۔ میں نے ریوالور ہولسٹر سے باہر کیا اور تیزی سے لپک کر شاہی وغیرہ کے سر پر پہنچ گیا۔ رائفل بدست ہیڈ کانسٹیبل اور حوالدار میرے پیچھے تھے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی شاہی طیش سے سرخ ہوگیا۔ وہ ایک سرپھرا خطرناک غنڈہ تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان سنگین لمحات میں وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ ریوالور کی لبلبی پر میری اُنگلی پوری طرح تیار تھی۔

"خبردار شاہی! پیچھے ہٹ جاؤ" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ شاہی رُخ پھیر کر بھاگ نکلے گا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ارادہ بدل دیا۔ وہ کوئی معمولی بدمعاش نہیں تھا۔ ڈلہوزی کا "بہرام شاہ" تھا۔ وہ یوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتا تو کیا "عزت" رہ جاتی اس کی ......اُس نے بھاگنے کی بجائے مجھے بھگانے کا فیصلہ کیا اور ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنے پہلو سے بندھی ہوئی تلوار بے نیام کرلی۔ وہ کوئی تین فٹ لمبی خم دار تلوار تھی۔ میں نے شاہی کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی دیوانگی دیکھی اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گولی چلادی۔ دھماکے کے ساتھ آدھ انچ لمبا سکہ شاہی کی کلائی میں گھس گیا۔ اس نے تڑپ کر تلوار دوسرے ہاتھ میں تھامنی چاہی لیکن عین اُس لمحے میں جب تلوار پر کسی ہاتھ کی گرفت بھی مضبوط نہیں تھی ہیڈ کانسٹیبل نے ٹانگ چلائی اور اُس کی ٹھوکر سے تلوار ہوا میں اُڑگئی۔

میں نے جست لگا کر شاہی کو دبوچ لیا اور پھر فوراً ہی ایک فٹ زمین سے اوپر اٹھا کر پٹخ دیا۔ شاہی کے ایک ساتھی نے ہیڈ کانسٹیبل پر چاقو سے وار کرنا چاہا لیکن رائفل کی دھمکی کام آئی اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔ میرا گھٹنا شاہی کی گردن پر تھا اور ریوالور اُس کی کنپٹی سے لگا ہوا تھا۔ اپنے سرغنہ کو اس حالت میں دیکھ کر کسی بچے جاٹھے کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ پولیس پارٹی پر حملہ کرسکتا۔ میرے گرانڈیل حوالدار نے شاہی کا ایک بازو مروڑ کر اپنے گھٹنے کے نیچے دبایا اور اُسے ہتھکڑی لگادی۔ شاہی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ کشمیری کے علاوہ اُردو اور ہندی میں بھی گالیاں بک رہا تھا۔

شاہی جیسے غنڈوں کو سیدھا کرنے کے لیے پولیس کے پاس بہت ہتھکنڈے ہوتے ہیں۔ میں نے کوشش کی کہ مجھے شاہی پر کوئی ایسا ہتھکنڈا

استعمال نہ کرنا پڑے لیکن جب وہ کسی طور قابو میں نہیں آیا تو میں نے حوالات میں اُسے حوالدار پربت سنگھ اور اس کے تین ماتحتوں کے حوالے کردیا۔ پربت سنگھ حوالاتیوں کے لیے عزرائیل سمجھا جاتا تھا۔ میری ماتحتی میں آکر وہ ایک عرصے سے بیکار ہی تھا۔ مدت بعد جب اُسے کام ملا تو اُس نے خوب دل لگا کر کیا۔ شاہی کو ایسی فنکارانہ پھینٹی لگائی گئی کہ 48 گھنٹے کے اندر اندر اس کی ساری اکڑفوں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی اور وہ اپنی جان حوالدار کے پنجے سے چھڑانے کے لیے سب کچھ اُگلنے پر راضی ہوگیا۔ حوالدار کا کمال یہ تھا کہ اُس کی لگائی ہوئی پھینٹی کا نشان تک حوالاتی کے جسم پر نہیں ملتا تھا یعنی بقول شاعر " تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو" میں شاہی کو دیکھ کر حیران ہوگیا۔ نہ اُس کے چہرے پر کوئی نشان تھا نہ ہاتھ پاؤں پر نہ جسم کے کسی اور حصے پر لیکن وہ چوٹوں سے چور نظر آتا تھا۔ شاہی کو سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ 48 گھنٹے حوالات میں مار کھاتا رہا ہے اس کے باوجود اس کے مالکوں میں سے کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ جیسا کہ قارئین پچھلی کہانی میں پڑھ چکے ہیں کہ شاہی کے مالک سردار اشوک وغیرہ تھے۔ لیکن یہ لوگ شاہی کے غیر قانونی کاموں میں اُس کا بچاؤ کرنے پر تیار نہیں تھے۔ سردار اشوک ایک بھلا مانس آدمی تھا اور وہ صاف طور پر مجھ سے کہہ چکا تھا کہ اگر "شاہی" مجرم ہے تو اُسے کیے کی سزا ملنی چاہیے اور اب حسن اتفاق سے شاہی کے جرم کا انکشاف اُس کی اپنی زبان سے ہوگیا تھا۔ بھری محفل میں اس نے کہا تھا کہ گوبند سنگھ کے ساتھ اُس نے " کچھ کیا" ہے۔ سردار اب اس کی مدد کو کیسے آسکتے تھے؟

اپنے دفتر میں میں نے شاہی سے پوچھ کچھ کی۔ اسے بدستور ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ اسی لباس میں تھا جس میں گرفتار ہوا تھا۔ یہ ایک خاص قسم کی دھوتی ہوتی ہے جس کے ایک پلو کو ٹانگوں کے درمیان سے گزار کر پیچھے کمر میں اڑس لیا جاتا ہے۔ اس دھوتی کے اوپر شاہی نے کھلی آستین والا ایک کڑھائی دار کرتہ پہنا تھا۔ سخت سردی میں بھی وہ اکثر اسی لباس میں دکھائی دیا کرتا تھا۔ میں نے شاہی سے کہا " حوالدار پربت سنگھ بتا رہا تھا کہ تم کوئی بیان دینا چاہتے ہو"۔

اُس نے کینہ پرور نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا "انسپکٹر نواز! تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا"۔

میں نے کہا " بے شک بُرے کام کا نتیجہ بُرا ہی نکلتا ہے۔ اگر میں نے کوئی بُرا کام کیا ہے تو اس کی سزا مجھے ضرور ملے گی...... جیسے تمہیں ملی ہے"۔

وہ غصے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بولا "میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں کہ مجھے تم پر ترس آرہا ہے"۔

میں نے کہا " ترس تو مجھے بھی تم پر آرہا ہے لیکن اگر تم اسی طرح میرا وقت ضائع کرتے رہے تو مجھے پھر تمہیں حوالدار پربت سنگھ کے حوالے کرنا پڑے گا"۔

اُس نے ایک بہت گہری سانس لی اور ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولا" اس وقت کو یاد رکھنا انسپکٹر اس وقت کو بھولنا مت"۔

وہ مجھے ایک خوفناک دھمکی دے رہا تھا۔ میں ایسی بہت سی دھمکیاں سن چکا تھا اور ان سے نمٹ چکا تھا لہٰذا میں نے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ پولیس کے پیشے میں بندہ ایسی دھمکیوں سے ڈرنے لگے تو پھر اسے ٹریفک پولیس میں چلے جانا چاہیے یا چھٹی کر کے گھر بیٹھ جانا چاہیے۔ خاص طور پر ایماندار ملازموں کے لیے یہ پولیس لائن ضرورت

سے کچھ زیادہ ہی سخت ہے۔ میں نے بے مروت انداز میں کہا "شاہی! تم بیان دے رہے ہو یا میں تمہیں باہر بھیج دوں"۔

وہ بولا "بیان دینے کے لیے ہی تو آیا ہوں صاحب ......لو......لکھو بیان"۔

"ہاں بولو" میں نے کہا۔

وہ کہنے لگا "گوبند کے گم ہونے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ میرا اس سے جھگڑا ہوا تھا"۔

"کب ہوا تھا یہ جھگڑا اور کیوں؟"

"یہ جھگڑا مارچ کی کسی تاریخ کو ریس والے دن ہوا تھا اور اس لیے ہوا تھا کہ گوبند نے زبان دے کر بے ایمانی کی تھی۔ تم میرے منہ سے ایمان داری اور بے ایمانی کی بات سن کر حیران ہو رہے ہو انسپکٹر لیکن اتنا تو تم بھی جانتے ہو گے کہ بے ایمانی کے کام بھی ایمانداری سے ہی کیے جائیں تو کام چلتا ہے۔ غنڈوں بدمعاشوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں اور بے اصول غنڈہ......!"

"مجھے لیکچر مت دو" میں نے اس کی بات کاٹی "سیدھی بات بتا۔ گوبند سے جھگڑا کیوں ہوا؟"

شاہی نے جبڑے زور سے بھینچ کر اپنی تلخی پر قابو پایا اور بولا "گوبند کے اور میرے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ گوبند یہ ریس ہارے گا اور زیادہ سے زیادہ تیسرے نمبر پر آئے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈلہوزی کے دو بڑے سیٹھوں ...... میاں شاہنواز اور سیٹھ کرم چند میں ایک بڑی شرط لگی ہوئی تھی۔ شرط یہ تھی کہ اگر گوبند اس ریس میں پہلے یا دوسرے نمبر پر آتا تو سیٹھ کرم چند نے میاں شاہنواز کو دس ہزار روپے دینا تھے۔ دوسری صورت میں یہ رقم میاں شاہنواز نے ادا کرنا تھی۔ سیٹھ کرم چند کو دس ہزار روپیہ جانے کا فکر نہیں تھا وہ ہر صورت میاں شاہنواز کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ دراصل یہ شرط اچانک ہی بحثا بحثی میں لگ گئی تھی اور دونوں سیٹھوں نے اسے عزت بے عزتی کا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ سیٹھ کرم چند نے یہ ہوشیاری دکھائی کہ اس نے شرط کا دس ہزار روپیہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور میں نے اسے ضمانت دے دی کہ گوبند اس ریس میں پہلے یا دوسرے نمبر پر نہیں آئے گا۔ گوبند کو اس ریس میں ہرانے کے میرے پاس بہت سے طریقے تھے لیکن میں نے کوئی غلط طریقہ استعمال نہیں کیا اور نہ ہی میں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بغیر کسی ہیر پھیر کے گوبند سے بات کی اور اسے کہا۔ ریس میں اس کا ہارنا یقینی ہے۔ شیکھر اور تیمور جیسے لڑکوں کے ہوتے ہوئے وہ پہلے نمبر پر کیسے آسکتا ہے ......ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ قسمت اُس کا ساتھ دے اور وہ دوسرے یا تیسرے نمبر پر آ جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ ریس میں تیسرے نمبر سے آگے نہ جائے تو میں پانچ ہزار روپیہ یکمشت اُسے ادا کردوں گا۔ بات گوبند کی سمجھ میں آگئی۔ اس ریس میں ایسے کھیلے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اسے پیسوں کی ضرورت بھی تھی اور یہ بھی وہ جانتا تھا کہ ریس جیتنا اس کے لیے بہت مشکل ہے۔ اس نے یہ سودا قبول کرلیا۔ میں نے اُس کے کہنے پر ڈھائی ہزار روپیہ اسے پہلے دے دیا بقایا ڈھائی ہزار ریس کے بعد دینا قرار پایا۔ گوبند نے مجھ سے وعدہ کرلیا وہ ریس میں پہلے یا دوسرے نمبر پر نہیں آئے گا لیکن وہ تیسرے چوتھے نمبر پر آ کر اپنی ہتک کروانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ریس سے ویسے ہی آؤٹ ہو جائے گا کوئی مناسب موقع دیکھ کر وہ راستے سے ہٹ جائے گا اور بعد میں کوئی ناٹک رچا دے گا جس سے پتہ چلے گا کہ چوٹ وغیرہ لگنے سے وہ ریس میں آخر تک حصہ نہیں لے سکا......اس

نے اپنے منصوبے کے مطابق کام کیا۔ سندر گاؤں تک وہ تیمور کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا لیکن سندر گاؤں اور ٹیکرا گلی کے درمیان پشمال موڑ پر وہ ریس سے نکل گیا اور ڈھائی تین فرلانگ نیچے سیدھا میرے ڈیرے پر آ گیا۔ میں اس وقت ڈیرے پر اکیلا تھا۔ گوبند کے پہنچتے ہی میں نے وعدے کے مطابق بقایا ڈھائی ہزار روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اُس نے یہ ڈھائی ہزار روپیہ دُور پھینک دیا۔ کہنے لگا تم نے سیٹھ کرم چند سے پندرہ ہزار روپیہ وصول کیا ہے اور اس رقم میں سے کم از کم دس ہزار اسے ملنا چاہیے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ پندرہ ہزار نہیں صرف دس ہزار روپے میں بات طے ہوئی تھی۔ جس میں سے ہم دونوں آدھے کے حقدار ہیں۔ وہ میری بات سننے پر تیار نہیں تھا اسے کسی نے خوب بھڑکا رکھا تھا۔ کہنے لگا میں دس ہزار سے ایک کوڑی کم نہیں لوں گا۔ وہ مجھے جانتا نہیں تھا اگر ٹھیک طرح جانتا ہوتا تو ایسی بات نہ کرتا۔ دنیا جانتی ہے کہ شاہی بدمعاش ضرور ہے بے اصول نہیں ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ خوانخواہ اوکھلی میں سر نہ دے۔ اُسے پتہ نہیں کہ وہ کس سے ٹکرلے رہا ہے..... وہ تو کسی طور پر قابو ہی نہیں آ رہا تھا۔ معلوم نہیں کیسی ہوا اُس کے دماغ کو چڑھی ہوئی تھی ..... انسپکٹر! میں تمہیں ہر بات صاف سیدھی بتا رہا ہوں اب یقین کرنا یا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ میں بہت ڈر رہا تھا کہ کہیں میرا میٹر گھوم گیا تو یہ حرامی میرے ہاتھوں سے ضائع ہو جائے گا لیکن لگتا تھا کہ وہ آتا جتھیا کا پروگرام بنا کر آیا ہوا ہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ لال پیلا ہونے لگا پھر ایک دم اُس نے میرے ہاتھوں سے ساڑھے چھ ہزار کے نوٹ چھین لیے اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کا خیال ہوگا کہ وہ دوڑ کا چیمپئن ہے اُسے کون پکڑ سکتا ہے لیکن جنہوں نے پکڑنا ہوتا ہے وہ پکڑ لیتے ہیں۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ وہ چکر دار رستے پر بھاگا تھا میں ناک کی سیدھ میں گیا اور تھوڑا نیچے جا کر اسے چھاپ لیا۔ وہ دست بدست لڑائی پر اتر آیا۔ اس نے بنیان کے نیچے نیکر میں چاقو چھپا رکھا تھا۔ جب چاقو اس نے ہاتھ میں لیا تو میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اس کا وار بچا کر ناک پر ٹکر جو ماری تو وہ کوئی تیس فٹ نیچے ایک گڑھے میں جا گرا۔ اُس کے سر پر چوٹ آ گئی اور ناک سے خون جاری ہو گیا۔ میں نیچے پہنچا تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہائے ہائے کر رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے نوٹ نکالے اور ڈھلوان چڑھ کر واپس ڈیرے پر آ گیا۔ اس وقت میرا خون بُری طرح کھولا ہوا تھا ..... لیکن آدھ پون گھنٹے بعد جب دماغ ذرا ٹھنڈا ہوا تو مجھے اس کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ اتنی سردی میں اسے وہاں نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ میں نے ڈیرے سے ایک کارندے دولورام کو بھیجا کہ وہ نیچے جا کر گوبند کو اٹھا لائے۔ دولورام دو اور لڑکوں کو ساتھ لے گیا۔ پون گھنٹے بعد انہوں نے آ کر مجھے بتایا کہ گوبند وہاں نہیں ہے۔ میں سمجھا کہ وہ ہوش میں آ کر چلا گیا ہوگا لیکن دوپہر کو پتہ چلا کہ گوبند مل نہیں رہا۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی میرے دماغ میں آیا کہ ہو نہ ہو وہ کسی ہسپتال میں ہے۔ شاید کسی نے اسے زخمی حالت میں دیکھا ہو اور ہسپتال پہنچا دیا ہو۔ میں نے اگلے روز ڈلہوزی کے سارے ہسپتالوں اور دواخانوں میں پتہ کروایا لیکن گوبند کا کہیں سراغ نہیں ملا ..... بعد میں بھی دو تین ہفتے تک میں نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی“۔

شاہی جو کہانی سنا رہا تھا دلچسپ تھی لیکن میرے لیے اس پر فوراً یقین کر لینا ممکن نہیں تھا۔ شاہی نے اتنا اعتراف تو کر لیا تھا کہ رقم کے معاملے پر گوبند

سے اس کا جھگڑا ہوا تھا اور وہ اسے مار کر کھائی میں پھینک آیا تھا۔ اس اعتراف کے بعد شاہی کے خلاف ایک مضبوط کیس بن سکتا تھا۔ گوبند کو گم ہوئے اب آٹھ مہینے ہونے کو آئے تھے۔ اگر وہ زندہ تھا تو اب تک ملا کیوں نہیں تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ کھائی میں گرنے سے اس کی موت واقع ہوگئی ہو اور شاہی کے آدمیوں نے اسے ادھر ہی کہیں جنگل میں گاڑ دیا ہو۔

درحقیقت شاہی کو معلوم ہو چکا تھا کہ نشے کی حالت میں اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکل چکی ہے جو اس کی گردن کا پھندا بن سکتی ہے اور اس بات کے نصف درجن گواہ بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے گوبند سے ہونے والے جھگڑے کے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ شاہی کی گرفتاری کے وقت جو دھینگا مشتی ہوئی تھی وہ ہمارے ایک غلط اندازے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ میں نے قادری کو سادے لباس میں شاہی کے ڈیرے پر بھیجا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاہی وغیرہ اس کو پہچان نہیں سکیں گے لیکن اُن کی سی آئی ڈی خاصی تیز تھی۔ وہ قادری کو ہیڈ کانسٹیبل کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسے پکڑ لیا اور مار پیٹ کرنے لگے۔ خیر...... یہ تو وہ باتیں تھیں جو ہو چکی تھیں اب ہمیں ان باتوں کے بارے میں سوچنا تھا جو ہونی تھیں۔ شاہی نے اس معاملے کو ایک پراسرار رنگ دے دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گھنے درختوں کے اندر گوبند کا جسم آناً فاناً غائب ہوگیا۔ نہ وہ کسی ہسپتال میں پہنچا نہ کسی کے گھر گیا اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ جنگلی جانور اسے چیر پھاڑ گئے ہوں۔ اوّل تو کوئی ایسا بڑا جانور اس علاقے میں تھا ہی نہیں جو ایک جوان مرد کی لاش کو کھینچ کر موقع سے دور لے جاتا اور فرض محال

ایسا ہو بھی جاتا تو قرب و جوار سے انسانی جسم کے بچے کھچے حصے ملنے چاہئے تھے۔

وہ ڈلہوزی کی ایک دھواں دھواں شام تھی سردی اپنے جوبن پر تھی۔ چیڑ اخروٹ اور دیودار کے بلند و بالا درختوں میں نمناک بدلیاں چکرا رہی تھیں۔ دور کہیں نشیب میں گاہے گاہے بندر چیختے تھے اور ان کی آواز پورے جنگل میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں اور بلال شاہ اس مقام پر کھڑے تھے جہاں آٹھ مہینے پہلے گوبند زخمی ہو کر گرا تھا اور بقول شاہی آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر غائب ہو گیا تھا۔ یہ ڈھلوان پر واقع ایک تنگ سی کھائی تھی۔ گہرائی پچیس تیس فٹ کے قریب ہوگی۔ یہ ساری جگہ گھنے سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ کھائی کی تہہ میں چھوٹی بڑی جھاڑیاں تھیں اور ایک چھوٹی سی آب جو گزرتی تھی۔ کھائی کے کنارے سے تہہ میں گرنے والا یقینی طور پر زخمی ہو سکتا تھا۔ دس پندرہ منٹ موقع کا جائزہ لینے کے بعد ہم واپس روانہ ہوگئے۔ اب اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور کسی بھی وقت نشیب و فراز گہری تاریکی میں گم ہو سکتے تھے۔ میں اور بلال شاہ ابھی کھائی سے چالیس پچاس گز دور ہی آئے تھے کہ ایک آواز سن کر چونک گئے۔ کوئی آ رہا تھا ہم غیر ارادی طور پر اپنی جگہ رُک گئے۔ دیودار کے ایک تناور درخت نے ہمیں اپنی اوٹ میں لے رکھا تھا لہٰذا اوور کوٹ والا وہ چوڑا چکلا شخص ہمیں دیکھ نہیں سکا جو ایکدم بلندی سے نمودار ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی اور پہچان گیا۔ وہ شاہی کا ملازم خاص اور قریبی ساتھی وولورام تھا۔ وولورام اس وقت کہاں جا رہا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے خوانخواہ شک سا ہونے لگا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے بلال شاہ کی

طرف دیکھا۔ وہ بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا" بلال اتم تھانے جاؤ...... میں ذرا اس کی ٹوہ لگاتا ہوں" میرا اشارہ دولورام کی طرف تھا۔

بلال شاہ نے معنی خیز انداز میں سرہلا دیا۔ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا دولورام کے پیچھے چل دیا۔ جھاڑ جھنکاڑ سے بھرے ہوئے ناہموار راستے پر کسی کا تعاقب آسان کام نہیں ہوتا۔ شاخوں کے ہلنے اور پتوں کے ٹکرانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ آگے جانے والے کو ہوشیار کر دیتی ہے۔ یہاں بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ اگر دولورام سے میرا فاصلہ کم ہوتا تو وہ ہوشیار سکتا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی صورت میں اُس کے کھو جانے کا اندیشہ تھا۔ بہرطور کسی نہ کسی طرح میں نے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ آگے جا کر قدرت نے میری مدد کی۔ اندھیرا گہرا ہو جانے کی وجہ سے دولورام نے تارچ روشن کرلی۔ روشنی کا پیچھا خاصے فاصلے سے بھی کیا جا سکتا ہے لہٰذا میرے لیے آسانی پیدا ہوگئی۔ دولورام کا تعاقب میری توقع سے کہیں طویل ثابت ہوا۔ ایک گھنٹے کے اندر اس نے قریباً دو میل کا فاصلہ طے کیا اور "گورا پہاڑ" کی ڈھلوان پر پہنچ گیا۔ میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ دولورام اُن خوبصورت بنگلوں میں جا رہا ہے جو گورا پہاڑ کی ڈھلوان پر وادی کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ جہاں چمبا اور پٹھانکوٹ کی خوش حال فیملیاں تفریح کے لیے آتی ہیں۔ ان بنگلوں اور کوٹھیوں کی تعداد پندرہ کے قریب تھی۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی سب کوٹھیاں مالکوں نے ذاتی استعمال کے لیے رکھی تھیں۔ پرسکون تفریح کے خواہش مندوں کے لیے یہ بڑی مناسب جگہ تھی۔ کوٹھیوں اور بنگلوں کی اس خوبصورت کالونی میں پہنچ کر دولورام ایک بڑے سیاہ گیٹ کے سامنے رُک گیا۔ اس بنگلے کا نمبر چودہ تھا اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ بنگلہ تھیٹر کے ایک مشہور بنگالی اداکار چاکرانی کا تھا۔ چاکرانی بڑی گرج دار آواز والا ایکٹر تھا۔ مشہور تھا کہ تھیٹر کی آخری قطار میں بیٹھا ہوا بہرا تماشائی بھی چاکرانی کی بھڑک سن کر لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ چاکرانی کی مادری زبان بنگالی تھی لیکن وہ اُردو ہندی' گجراتی ہر طرح کے ڈراموں میں کام کرتا تھا۔ اس زمانے میں بولتی فلمیں تو شروع ہو چکی تھیں لیکن سینما ہال ہر جگہ نہیں ہوتے تھے لہٰذا تھیٹر میں کمائی بھی تھی اور نام بھی۔ چاکرانی نے بھی تھیٹر سے کافی پیسہ کما رکھا تھا۔ جس کا ایک ثبوت یہ خوبصورت بنگلہ بھی تھا۔

دولورام جب چاکرانی کے بنگلے میں داخل ہوگیا تو میں "گورا پہاڑ" سے واپس لوٹ آیا۔ اگلے روز میں نے بلال شاہ کو ہدایت کی کہ وہ گورا پہاڑ کے بنگلہ نمبر چودہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کر کے مجھے آگاہ کرے۔ بلال شاہ نے حسب معمول یہ کام بڑی تندہی سے کیا اور ایک مقامی مخبر کو ساتھ ملا کر دو روز میں اپنی رپورٹ مکمل کرلی۔ اس رپورٹ کے مطابق بنگلے کے مالک کا پورا نام رابندر ناتھ چاکرانی تھا۔ اس کی مستقل رہائش دہلی میں تھی۔ ان دنوں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ یہاں تفریح کے لیے آیا ہوا تھا۔ اہل خانہ سے مراد اس کی بیوی تھی۔ بیوی کا نام روپ وتی تھا اور وہ بھی تھیٹر میں کام کرتی تھی۔ بلال شاہ نے مجھے روپ وتی کی ایک تصویر بھی دکھائی اور بتایا کہ یہ چاکرانی کی دوسری شادی ہے۔

میں نے روپ وتی کی تصویر دیکھی ۔ یہ ایک اخباری تراشہ تھا اور زیادہ پرانا بھی نہیں تھا۔ روپ وتی کی عمر بیس بائیس برس کے لگ بھگ نظر آتی تھی۔ دبلی پتلی تیکھے نقوش والی یہ لڑکی تھیٹر اور فلم کی

اکثرا ایکٹریسوں کی طرح خوبصورت تھی۔ میں نے چاکرانی کو بھی دیکھا ہوا تھا وہ بھی خوبصورت تھا لیکن روپ وتی کے جوڑ کا ہرگز نہیں تھا۔ روپ وتی کے مقابلے میں اس کی عمر تھوڑی سی زیادہ تھی اور جسم بھی بھاری تھا۔ وہ کھلے ہاتھ پاؤں کا ایک دبنگ شخص نظر آتا تھا۔ جبکہ روپ وتی ایک پڑھی لکھی نازک مزاج اداکارہ دکھائی دیتی تھی۔ معلوم نہیں انہوں نے ایک دوسرے کو کیسے پسند کرلیا تھا۔ بہرحال مجھے ان کی پسند ناپسند سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے تو یہ دیکھنا تھا کہ شاہی کا ملازم خاص دولورام چاکرانی کے بنگلے میں کیا کرنے گیا تھا اور اُن دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ بلال شاہ اس بارے میں کچھ زیادہ معلومات فراہم نہیں کرسکا۔ اس نے بتایا کہ اس سے پہلے دولورام کو کسی نے چاکرانی کے بنگلے میں گورا پہاڑ کی طرف جاتے نہیں دیکھا۔ نہ ہی کبھی اسے چاکرانی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ ویسے بھی وہ پچھلے تین چار ماہ سے ڈلہوزی میں نہیں تھا۔ بلال شاہ نے اپنی رپورٹ میں ایک بڑی خاص بات بھی بتائی۔ اس نے کہا کہ پچھلے ایک مہینے میں تین چار موقع ایسے آئے ہیں کہ چاکرانی کے بنگلے سے کسی عورت کی چیخنے کی آوازیں آتی ہیں۔

یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی۔ میں چاکرانی کا بنگلہ خود دیکھ کر آیا تھا۔ یہ بنگلہ دوسری عمارتوں سے کچھ ہٹ کر تھا اور گھنے درختوں کی وجہ سے کچھ الگ تھلگ بھی نظر آتا۔ ایسی چار دیواریاں کسی بھی طرح کے غیر قانونی کاموں کے لیے بہت مناسب ہوتی ہیں۔

میں نے بلال شاہ سے پوچھا کہ یہ چیخوں والی بات اسے کس نے بتائی ہے۔ وہ حسب عادت مونچھوں کو مروڑ دے کر بولا "خان صاحب! شاید آپ نے دیکھا نہیں چودہ نمبر بنگلے کے پیچھے لکڑی کا ایک گودام ہے۔ گودام بھی کیا ہے، بس کھلے احاطے میں شہتیروں کے ڈھیر لگا کر آلے دوالے کانٹے دار تار لگادی گئی ہے۔ یہاں دو چوکیدار بھی رہتے ہیں۔ دونوں آپس میں داماد سسر ہیں۔ انہوں نے ہی بتایا ہے کہ چودہ نمبر بنگلے میں ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ صرف دو دن پہلے بھی رات کے وقت انہوں نے چیخیں سنی ہیں چیخیں بہت مدھم ہوتی ہیں اور اکثر وقفے وقفے سے آدھ گھنٹے تک سنائی دیتی رہتی ہیں"۔

میں نے بلال شاہ سے اس بارے میں کچھ اور تفصیل پوچھی اور پھر چاکرانی سے ملنے کا پختہ فیصلہ کرلیا۔

"گورا پہاڑ" تک جانے کے لیے جیپ کو طویل چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ میں ایک گھنٹے میں چاکرانی کے بنگلے تک پہنچ سکا۔ میں وردی میں تھا مجھے دیکھ کر چاکرانی کا ملازم پریشان نظر آنے لگا۔ وہ اطلاع دینے اندر گیا اور چار پانچ منٹ بعد میں چاکرانی کے سامنے اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ شکل وصورت سے قد کاٹھ کے لحاظ سے چاکرانی کسی طرح بھی بنگالی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اچھا بھلا بھرو شخص تھا کسی حد تک خاموش طبع بھی نظر آتا تھا۔ اس نے بڑے اخلاق اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا اور آنے کی وجہ پوچھی۔

میں نے کہا "وجہ تو کوئی خاص نہیں ہے چاکرانی صاحب! بس آپ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا"۔

وہ مسکرا کر اُردو میں بولا "ہم آپ کے خادم ہیں جی ہمیں حکم کردیا ہوتا، فرمائیں کیا خدمت کروں آپ کی؟"

میں نے کہا "بس تھوڑا سا وقت لینا ہے آپ کا دراصل ہم نے ایک مقامی غنڈے شاہی کو گرفتار کیا ہے۔ اس پر ایک ارائیں لڑکے کے قتل کا الزام ہے ہم شاہی کے ملنے جلنے والوں سے بھی پوچھ کچھ کررہے ہیں۔ شاہی کے دوست احباب میں ایک

دولورام نامی شخص بھی ہے......"۔

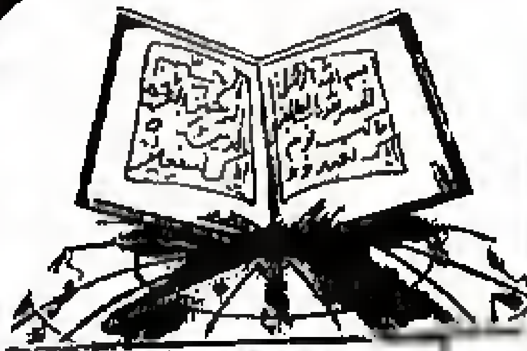
"میں سمجھ گیا ہوں" چاکرانی میری بات کاٹ کر بولا "آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ دولورام نامی یہ شخص میرے بنگلے میں آمد و رفت رکھتا ہے......اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو بالکل صحیح ہے۔ یہ دولورام تین چار دفعہ بنگلے میں آچکا ہے لیکن اس کے آنے کی وجہ شاید آپ کو معلوم نہ ہو"۔ چاکرانی نے دروازے کی طرف رُخ پھیر کر اپنے کسی ملازم "دینو" کو آواز دی۔ چند لمحے بعد چالیس پچاس برس کا ایک باریش شخص ہاتھ سینے پر باندھے اندر داخل ہوا اور ادب سے سر جھکا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ چاکرانی نے اپنی بے حد پاٹ دار آواز میں کہا "دینو! انسپکٹر صاحب کو بتاؤ دولورام یہاں کیوں آتا رہا ہے"۔

اس سے پہلے کہ دینو بولتا میں نے کہا "چاکرانی صاحب! آپ کے ملازم کی زبان سے آپ کی زبان میرے لیے زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔ جو کچھ کہنا ہے آپ خود فرمایئے، میں ہمہ تن گوش ہوں"۔

چاکرانی نے مسکرا کر ملازم کو باہر بھیج دیا۔ پھر چاندی کے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر بڑے شاہکش انداز میں ہونٹوں سے لگایا اور بولا "بالکل معمولی سی بات ہے...... کم از کم آپ کے لیے تو بالکل غیر اہم ہے۔ دولورام کی دھرم پتنی مالتی میرے بنگلے میں ملازم تھی۔ میرے آنے سے پہلے میرے منیجر نے اسے ملازم رکھا تھا۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ مالتی کا شوہر کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ دنگا فساد کرتا ہے اور اکثر اسے پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے میں نے مالتی کی چھٹی کرادی۔ دولورام نے منیجر سے درخواست کی کہ اس کی بیوی کو کام سے نہ نکالا جائے۔ منیجر نے بے وقوفی کی اور اسے میری طرف بھیج دیا۔ دو دفعہ تو میں نے اسے ملنے سے ہی انکار کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سمجھ جائے گا لیکن وہ بھی ایک ڈھیٹ آدمی نکلا۔ دو تین روز پہلے پھر آدھمکا میں نے ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی اور کورا جواب دے کر واپس بھیج دیا۔ دراصل......"۔

اچانک چاکرانی کے منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ مجھے بھی چونک کر قالین پوش زینوں کی طرف دیکھنا پڑا۔ بالائی منزل پر کوئی چیز دھم سے گری تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک دبی ہوئی نسوانی چیخ اُبھری تھی۔ میں نے دیکھا چاکرانی کا سرخ و سپید چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے چاکرانی کی طرف دیکھا۔ وہ سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر کہنے لگا "میری نوکرانی فرش دھوتے ہوئے گر گئی ہے شاید۔ وہ سیڑھیوں تک گیا اور کچھ دیر بالائی منزل کے دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد واپس گیا۔ وہ صاف طور پر پریشان تھا اور میری توجہ اس واقعے کی طرف سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھے خبریں سنانے کے بہانے ریڈیو آن کر دیا اور سیاست کی باتیں کرنے لگا۔ کچھ بھی تھا وہ ایک بااخلاق شخص نظر آتا تھا اور اس کی باتوں میں رکھ رکھاؤ تھا۔ بڑے غیر محسوس طریقے سے وہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ میں جلد از جلد وہاں سے رخصت ہو جاؤں لیکن تقدیر چاکرانی پر مہربان نظر نہیں آتی تھی۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک بار پھر بالائی منزل سے دھماچوکڑی کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک مرد دبے دبے لہجے میں غرایا اس کے ساتھ ہی کسی عورت کے رونے اور بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس دفعہ یہ سب کچھ نہایت واضح تھا۔ چاکرانی پریشان ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پریشانی کے علاوہ اس کے چہرے پر غصہ اور شرمندگی بھی تھی وہ کچھ دیر سیدھا کھڑا بالائی منزل کے دروازے کو دیکھتا رہا۔ "میں ابھی آتا ہوں انسپکٹر" اس نے کہا اور تیزی سے

"دُعا تقدیر بدل دیتی ہے" (حدیثِ رسولؐ)



سیارہ ڈائجسٹ کی ایک ایمان افروز پیشکش



دُعا نمبر

شائع ہو گیا ہے

- قرآنی دُعائیں۔
- عظیم پیغمبرانِ خدا کی وہ دُعائیں جو نسلِ انسانی کے لیے نجات اور ہدایت کا باعث بنیں۔
- خالقِ کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہؐ کی تمام مسنونہ دُعائیں جو رحمت اللعالمینؐ کی ذاتِ برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی دُعائیں۔
- آئمہ اکرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دُعائیں۔

جدید دُنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے
پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تشفی آمیز
رُوحانی اور ایمانی علاج

قیمت 175 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

آٹھ دس منٹ بعد جاکرانی واپس آیا تو سردی میں بھی پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس کے بال بھی کچھ بکھرے بکھرے نظر آتے تھے۔ میرے سامنے بیٹھ کر اس نے لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور چند گہرے کش لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنے لگا:۔

''یہ میری بیوی ہے انسپکٹر..... جو پہلی آواز آئی وہ بھی اسی کی تھی۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا''۔

''کیا وہ بیمار ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بیمار ہوتی تو اس کا علاج کرالیتا۔ بھگوان کی کرپا سے دھن دولت کی کمی نہیں ہے مجھے۔ بڑے بڑے اسپتال میں لے جاسکتا ہوں اُسے مگر وہ تو اپنی دشمن خود بنی ہوئی ہے..... اب کیا بتاؤں آپ کو۔ کرتا اُٹھانے سے اپنا ہی پیٹ ننگا ہوتا ہے..... وہ نشہ کرنے لگی ہے۔ دن رات دھت رہتی ہے۔ شراب بند کردوں تو مارنے کو دوڑتی ہے۔ گھر کی چیزیں توڑتی ہے اور سر دیواروں سے ٹکراتی ہے۔ پھر مجبوری یہ ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ نہ اسے مار پیٹ سکتا ہوں اور..... اور نہ طلاق دے سکتا ہوں..... میں اسے دلی سے یہاں اسی لیے لایا تھا کہ شاید کھلی آب و ہوا میں شور ہنگامے سے دُور رہ کر وہ کچھ بہتر محسوس کرے لیکن اُلٹا اثر ہو رہا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ واپس ہی چلا جاؤں''۔

میں نے دیکھا جاکرانی کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی اور آواز اندرونی کرب کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ میں نے کہا ''جاکرانی صاحب عام طور پر عورتیں شراب نہیں پیتیں۔ اگر آپ کی پتنی اس لت میں گرفتار ہوگئی ہے تو ضرور اس کی کوئی وجہ ہوگی''۔

وہ پیشانی مسل کر بولا ''میری سمجھ میں تو کوئی وجہ نہیں آتی، اس کی دوستوں میں سے ایک دو بہت ایڈوانس قسم کی تھیں۔ شراب کے علاوہ حشیش وغیرہ کے نشے بھی کرتی تھیں۔ بس انہی سے یہ چھوت مرض اسے لگا ہوگا''۔

ہماری گفتگو کے دوران ہی ایک بار پھر اوپر والی منزل سے دھما دھم کی آوازیں آئیں پھر ایک طویل کھڑکی کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹا اور مجھے کھڑکی کے خالی فریم میں ایک وجیہہ صورت نظر آئی۔ میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔ وہ روپ وتی کے علاوہ کوئی نہیں تھی۔ میں چند روز پہلے اس کی تصویر اخباری تراشے میں دیکھ چکا تھا۔ تصویر میں روپ وتی جتنا بھی سنوری نظر آتی تھی کھڑکی میں اتنا ہی اجڑی بجڑی کھڑی تھی۔ لمبے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر خراشیں اتنی دُور سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں اسے عقب سے ایک عورت اور ایک توانا مرد نے دبوچ رکھا تھا۔ دونوں روپ وتی کو اندر کی طرف کھینچ رہے تھے اور روپ وتی چیخ رہی تھی۔ اس نے چیختے ہوئے دو یا تین جملے کہے مگر ان جملوں میں سے مجھے صرف ''تھانیدار صاحب'' کے الفاظ سمجھ میں آئے۔ بعض اوقات الفاظ سنے بغیر بھی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ میرے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ عورت مجھے مدد کے لیے پکار رہی ہے۔ جاکرانی کی بات درست ہی تھی۔ وہ نشے میں نظر آتی تھی اور کچھ جنونی سی ہو رہی تھی۔ مرد اور عورت جو غالباً اس بنگلے میں نوکر تھے۔ روپ وتی کو بمشکل کھڑکی سے ہٹا کر اندر لے گئے۔

جاکرانی اب سخت بیزار نظر آتا تھا۔ اٹھتے ہوئے بولا'' آیئے تھانیدار صاحب باہر لان میں چل کر بیٹھتے ہیں''۔

میں نے کہا ''نہیں.....بس اب میں چلتا ہوں، بہت وقت ضائع کرلیا آپ کا''۔

کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے کھانے کی دعوت دی لیکن میں شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔

چاکرانی کے بنگلے سے میں کئی اُلجھنیں لے کر واپس لوٹا۔ سب سے بڑی اُلجھن روپ وتی ہی تھی۔ چاکرانی یوں تو بھلا مانس شخص نظر آتا تھا لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اچھے ڈاکٹر سے بیوی کا علاج کرانے کی بجائے وہ اسے یہاں کیوں لے آیا تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا روپ وتی نے بنگلے کی کسی کھڑکی سے میری جیپ دیکھ لی تھی اور یہ جیپ دیکھنے کے بعد ہی اس نے بالائی منزل پر اودھم مچانا شروع کیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح مجھ پر اپنا آپ ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی پہلی دو کوششیں ناکام رہیں لیکن تیسری کوشش میں وہ کھڑکی کا شیشہ توڑنے اور میرے سامنے آنے میں کامیاب رہی۔

گوبند کے سوالیہ نشان کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہ ایک اور سوالیہ نشان سامنے آ گیا تھا۔ روپ وتی کون تھی؟ اگر واقعی اسے شراب نے پاگل کر رکھا تھا تو وہ کیوں شراب پیتی تھی اور اپنی پھول جیسی جوانی کو کیوں زہر سے سینچ رہی تھی؟ میں نے بلال شاہ کے علاوہ اپنے دو تین مزید مخبروں کو اکٹھا کیا اور ان کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ چاکرانی اور روپ وتی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کریں اور بڑی احتیاط کے ساتھ چاکرانی کی نقل و حرکت پر بھی نگاہ رکھیں۔ مخبروں نے تین چار روز بھاگ دوڑ میں مختلف ذریعوں سے جو کچھ معلوم کیا اس کا خلاصہ یوں ہے۔ چاکرانی کی یہ دوسری اور روپ وتی کی پہلی شادی تھی۔ چاکرانی کی طرح روپ وتی کا تعلق بھی دہلی کے ایک آزاد خیال گھرانے سے تھا۔ وہ تھیٹر میں اداکاری کے علاوہ رقص بھی پیش کرتی تھی اور بعض اوقات گانا بھی گاتی تھی۔ تھیٹر دیکھنے والے شائقین کی بڑی تعداد روپ وتی کی دیوانی تھی اور نوجوان اُس کے لیے ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ چاکرانی کے ساتھ شادی سے پہلے روپ وتی کا ایک اجیت نامی نوجوان سے معاشقہ بھی چلا تھا۔ نوجوان بھی تھیٹر کا اداکار تھا اور بہت خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں روپ وتی نے اس نوجوان سے تعلق توڑ لیا اور چاکرانی کو اپنی مرضی سے جیون ساتھی چن لیا تھا۔ مخبروں نے گورا پہاڑ کے بنگلہ نمبر 14 کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی تھیں۔ چاکرانی نے یہ بنا بنایا بنگلہ کوئی تین سال پہلے خریدا تھا۔ سارا سال یہ بنگلہ بند رہتا تھا صرف جون جولائی کے مہینوں میں چاکرانی دس پندرہ روز کے لیے یہاں آتا تھا۔ چاکرانی کے ساتھ منیجر ہوتا تھا یا ایک عدد باورچی۔ باورچی عموماً چاکرانی کے ساتھ ہی ڈلہوزی پہنچتا تھا۔ اس دفعہ بھی منیجر اور باورچی اس کے ساتھ ہی یہاں آئے تھے لیکن اس دفعہ دو باتیں معمول سے ہٹ کر ہوئی تھیں۔ ایک تو چاکرانی گرمیوں کی بجائے سردیوں میں آیا تھا۔ دوسرے اس کے ساتھ روپ وتی بھی تھی جسے وہ اپنی بیوی بتا رہا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے تھے۔ وہ بہت کم بنگلے سے نکلتا تھا اور اس کی پتنی کی تو کسی نے جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ اردگرد کے لوگ اب اس بنگلے کو پراسرار خیال کرنے لگے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ بنگلے کی چار دیواری کے اندر ضرور کوئی گڑ بڑ ہے۔ یہاں کوئی غیر قانونی کام ہوتا ہے یا پھر کسی روح وغیرہ نے ڈیرہ ڈال لیا ہے۔

دیہی علاقوں میں ایسی باتوں کے پھیلنے کے لیے بس اشارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں بھی یہ اشارہ موجود تھا یعنی بنگلے کے پچھواڑے ''لکڑی گودام'' کے چوکیدار نے چیخوں کی آوازیں سنی تھیں جو اکثر رات کے وقت آتی تھیں۔ میں اب ان

چیخوں کا سبب سمجھ گیا تھا لیکن ان کی اصل بنیاد کا مجھے بھی پتہ نہیں تھا نجانے کیوں رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ ان چیخوں کے اصل بنیاد اس کہانی کے ملبے میں چھپی ہوئی ہے۔ جس میں جا کرانی کے علاوہ کسی اجیت نامی اداکار کا ذکر بھی آتا ہے اور جس کا آغاز دہلی کے کسی رومان پرور گوشے سے ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ گتھی سلجھانے کے لئے مجھے یا میرے سب انسپکٹر کو دہلی جانا پڑے گا...... دو تین روز سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے خود دہلی جانے کا فیصلہ کرلیا۔

میں چند کیسوں کے سلسلے میں اس سے پہلے بھی دہلی جا چکا تھا۔ آپ اُن میں سے ایک دو کیسوں کی روداد بھی پڑھ چکے ہیں۔ دہلی میرے لیے کوئی نیا مقام تھا نہ ہی وہاں کے رہنے والے میرے لیے اجنبی تھے۔ ڈلہوزی سے دہلی تک جانے کا مطلب ہے بذریعہ ٹرین یا بس ایک طویل سفر۔ کو بند کی آٹھ نو ماہ پرانی گمشدگی کا معمہ حل کرنے کے لیے میرے لیے ضروری تھا کہ یہ طویل سفر کروں۔ میں نے بس پر ٹرین کو ترجیح دی۔ میں اور بلال شاہ پہلے سرکاری گاڑی پر پٹھانکوٹ پہنچے۔ پٹھانکوٹ سٹیشن سے ہم ٹرین میں بیٹھے اور پھر چل سو چل۔ سفر طویل ضرور تھا لیکن جب بلال شاہ جیسا دلچسپ ہمسفر ہو تو سفر کٹنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ پچھلے دنوں بلال شاہ ایک بوتل خون عطیے میں دے بیٹھا تھا۔ اب وہ ہر وقت خون کی کمی کا رونا روتا رہتا تھا۔ کہتا تھا اُٹھتے بیٹھتے چکر آتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سن ہو جاتی ہیں۔ ہر وقت ناخنوں کو دیکھتا رہتا تھا کہ ان میں گلابی پن نہیں رہا۔ ایک بوتل خون کی کمی پوری کرنے کے لیے اُس نے میری جیب سے جتنا پھل فروٹ کھایا تھا اس سے پانچ چھ بوتل خون اس کے جسم میں مزید پیدا ہو چکا تھا مگر "کمی" تھی کہ پوری ہونے میں نہیں آتی تھی......ہم پٹھانکوٹ سے لدھیانہ پہنچے اور لدھیانہ سے براستہ پٹیالہ دہلی پہنچ گئے۔ یہ ساڑھے چار سو میل سے زائد سفر تھا۔

دہلی میں ہمارا قیام عیدگاہ کے علاقے میں انسپکٹر نذیر احمد کے مکان میں تھا۔ میں ایک دو دفعہ پہلے بھی نذیر احمد کے پاس ٹھہر چکا تھا۔ وہ بڑا ہمدرد اور تعاون کرنے والا شخص تھا۔ نذیر احمد کے ذریعے اجیت کمار کا ٹھکانہ معلوم کرنے میں قطعاً دشواری نہیں ہوئی۔ وہ کوئی گمنام شخص نہیں تھا تھیٹر کا معروف اداکار تھا۔ نئی آبادی میں اس کی دو کنال کی شاندار کوٹھی تھی لیکن وہ خود دہلی میں موجود نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی شو میں حصہ لینے کے لیے میرٹھ گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی دو روز بعد متوقع تھی ہم نے یہ وقت دہلی دیکھنے میں گزارا۔ شہر دیکھنے کا شوق بلال شاہ کو تھا مجھے نہیں مگر اس کے ساتھ تو جانا تھا (آخر اُس نے میرے کہنے پر خون دے رکھا تھا۔ گاہے گاہے چکر وغیرہ آتے تھے، نصیب دشمناں کچھ ہو جاتا تو مصیبت پڑ جاتی)۔

یہ تیسرے روز دوپہر کا واقعہ ہے ہم جنرل پوسٹ آفس سے عیدگاہ کی طرف آرہے تھے۔ یونہی میرے جی میں آئی کہ نئی آبادی کی طرف نکل چلتے ہیں۔ گزرتے گزرتے ایک نگاہ اجیت کی رہائش گاہ پر بھی ڈال جائیں گے۔ اگر وہ واپس آچکا ہے تو اس کی گاڑی پورچ وغیرہ میں کھڑی نظر آجائے گی۔ ہم چھوٹی جیپ میں سوار تھے یہ پرائیویٹ جیپ تھی اور نذیر احمد کے چھوٹے بھائی شجاع نے ہمیں ذاتی استعمال کے لیے دے رکھی تھی۔ نئی آبادی کی طرف جاتے ہوئے جونہی ہم مجسمے والے چوک سے گزرے۔ بلال شاہ کی نگاہ ایک بس سٹاپ پر کھڑے نوجوان پر پڑی اور وہ بُری طرح چونک گیا "رُکیے خان صاحب" وہ تقریباً چیخ اُٹھا۔ اس

کی انگلی بس سٹاپ کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ غیرارادی طور پر میں نے بریک پیڈل دبا دیا اور مختصر سی جیپ لہراتی ہوئی سڑک کے کنارے رُک گئی۔ "یہ گوبند ہے......" بلال شاہ نے دھماکہ خیز انکشاف کیا۔ میں نے غور سے دیکھا انیس بیس سالہ وہ لڑکا ابھی ایک بس سے اترا ہی تھا اور سٹاپ کے سامنے کھڑا اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ جیپ ایک دم رُکی تھی اس لیے کچھ دوسروں لوگوں کی طرح وہ بھی ہماری طرف دیکھنے لگا تھا۔ یکا یک میں نے اس کے چہرے پر دہل کے آثار محسوس کیے۔ یہ آثار مجھے اور بلال شاہ کو پہچاننے کے بعد نمودار ہوئے تھے۔ اس کا منہ کھلا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک دم وہ بھاگ اُٹھا" پکڑیں اسے" بلال شاہ نے چلا کر کہا۔ میں نے تیزی سے جیپ کو یوٹرن دیا اور وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح لڑکے کی طرف لپکی۔ لڑکے نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے سڑک کراس کی اور ایک بغلی راستے سے داخل ہوگیا۔ یہ ون وے کی خلاف ورزی تھی مگر اس خلاف ورزی کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے لڑکے کا تعاقب جاری رکھا۔ کئی گاڑیوں کے پہیے چرچرائے اور اُن کے ڈرائیور خشمگیں نظروں سے ہمیں گھورنے لگے۔ جونہی میں نے لڑکے کو ایک تنگ گلی میں داخل ہوتے دیکھا جیپ روک کر پیچھے چھلانگ لگادی۔ یہ اینٹوں کے فرش والی پختہ گلی تھی۔ دونوں طرف رہائشی مکانات تھے۔ لڑکا جس کا نام بلال شاہ نے گوبند بتایا تھا تیزی سے بھاگا چلا جارہا تھا۔ وہ گوبند ہی تھا کیونکہ اسی طرح بھاگ رہا تھا جس طرح ایک دوڑنے والے کھلاڑی کو بھاگنا چاہیے۔ اپنی تمام تر تیز رفتاری کے باوجود شاید میں اُسے پکڑ نہ سکتا لیکن ایک ریڑھی بان فرشتہ رحمت ثابت ہوا۔ وہ اچھے ڈیل ڈول کا ایک سبزی فروش تھا۔ میں وردی میں تھا لہٰذا میرے آگے لگ کر بھاگنے والے کو مشکوک جان کر وہ اس کے راستے میں آگیا۔ اس نے اپنی ریڑھی اس طرح گوبند کی ٹانگوں میں ماری کہ وہ ریڑھی کے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل فرش پر گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھنے کے بعد دوبارہ رفتار پکڑتا میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور وہ اُٹھتا اُٹھتا ایک بار پھر زمین بوس ہوگیا۔ میں نے اس کے جبڑے پر دو زوردار کے رسید کرکے اس کی ساری تن فن ختم کردی۔ ایک دم وہاں مجمع لگ گیا۔ ان میں عورتیں' بچے' مرد سب شامل تھے۔ بلال شاہ بھی ہانپتا کانپتا موقع پر پہنچ چکا تھا اور حیرت سے گوبند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بات تھی بھی حیرت کی۔ یہ لڑکا پچھلے آٹھ نو ماہ سے غائب تھا ہم سب کا خیال تھا کہ وہ قتل ہو چکا ہے یا کسی کی حبس بیجا میں ہے۔ ہم اس کا کھوج لگانے نکلے ہوئے تھے لیکن وہ ہمیں دیکھ کر یوں بھاگا جیسے موت کے فرشتوں کو دیکھ لیا ہو۔ موقع پر موجود لوگ ہم سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کون ہے اور اس نے کیا کیا ہے ہم کیا کہہ سکتے تھے ہمیں خود معلوم نہیں تھا۔ اس نے کیا کیا ہے؟ جان چھڑانے کے لیے ہم نے لوگوں سے گول مول بات کی اور گوبند کو لے کر جیپ میں آبیٹھے۔

منظر انسپکٹر نذیر احمد کے گھر کا تھا۔ نذیر احمد بھی گھر ہی موجود تھا۔ گوبند مجرموں کی سی صورت بنائے ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ میرے مکے سے اس کا زیریں ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون اُس کی ٹھوڑی کو رنگین کررہا تھا وہ لرزاں آواز میں بولا:۔

"میں بے گناہ ہوں انسپکٹر صاحب! مجھے اپنے دفاع میں گولی چلانا پڑی تھی۔ ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے جان سے مار دیتا"۔

گوبند کے لب و لہجے سے اُس کا اناڑی پن ظاہر ہو رہا تھا۔ کوئی پختہ کار مجرم ہوتا تو بغیر ہمارے پوچھے ایسی بات زبان پر نہ لاتا بلکہ گدھے کی طرح مار کھا کر بھی چپ رہتا۔ جو بات گوبند نے کہی تھی اس سے صاف نتیجہ نکلتا تھا کہ وہ کسی شخص کو زخمی یا ہلاک کر چکا ہے اور ہم سے ڈر کر بھاگنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا "ریوالور اب کہاں ہے؟"۔

وہ بولا "وہ میں نے وہیں بنگلے کے پچھواڑے پھینک دیا تھا"۔

ایک اور بات کا پتہ چل گیا۔ گوبند کے ہاتھوں کسی کے ہلاک یا زخمی ہونے کا واقعہ کورا پہاڑ پر ہوا تھا اور عین ممکن تھا کہ اسی بنگلے میں ہوا ہو جہاں چاکرانی رہائش پذیر تھا۔ یعنی 14 نمبر کا وہ الگ تھلگ بنگلہ جہاں مخبوط الحواس روپ وتی سے میرا سامنا ہوا تھا۔ میرا یہ قیافہ درست ثابت ہو رہا تھا کہ شاہی' رابندر ناتھ چاکرانی' بنگلہ نمبر 14 اور گوبند میں کوئی گہرا تعلق ہے۔ میں نے اپنی گفتگو سے گوبند کو یہ باور کرایا کہ اس کے جرم کی بیشتر تفصیلات مجھے معلوم ہیں اور میں اُس کی گرفتاری کے لیے ہی یہاں دلی میں آیا ہوا ہوں۔ گوبند پوری طرح اس گفتگو کے جال میں پھنس گیا اور اس نے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر وہ سب کچھ مجھے بتا دیا جو شاید ہم کئی دنوں میں نہ پوچھ سکتے۔ گوبند نے میرے اور انسپکٹر نذیر کے سامنے ایک طویل بیان دیا۔ اس بیان میں اس نے اپنی گمشدگی اور گزشتہ دو ماہ کے حالات کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یوں ہے۔

گوبند کے بیان کے پہلے حصے میں کافی حد تک شاہی کے بیان کی تصدیق تھی یعنی ان دونوں کے درمیان ایک سودا ہوا تھا جس کے مطابق روڈ میں پہلے دو نمبر چھوڑ دینے پر شاہی نے گوبند کو کچھ رقم دینا تھی۔ اب اس رقم کے بارے میں اختلاف تھا۔ شاہی نے بیان دیا تھا کہ اس سودے میں گوبند سے پانچ ہزار طے ہوا تھا جب کہ گوبند کا کہنا تھا کہ شاہی نے سیٹھ سے کم از کم پندرہ ہزار روپیہ لیا تھا اور اس میں سے دس ہزار اسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ اُن دنوں ایک بہت بڑی رقم تھی اور اس کے سلسلے میں بڑے سے بڑا تنازعہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

گوبند نے اعتراف کیا کہ وہ شاہی سے نوٹ چھین کر بھاگا تھا اور بعد ازاں اُن دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ شاہی نے اس کے سر پر پتھر مارا تھا اور جب وہ بے ہوش ہو کر کھائی میں گر گیا تو اُس کی مٹھی سے رقم نکال کر چلتا بنا۔ گوبند نے بتایا کہ وہ تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہوش میں آیا تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون لوتھڑوں کی صورت میں اس کے چہرے اور سینے پر جما ہوا تھا۔ وہ بمشکل اُٹھ کر بیٹھ سکا تھا۔ چاروں طرف سنسان درخت تھے جن سے ٹھٹھری ہوئی ہوا سیٹیاں بجاتی گزر رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں جیسے بے جان ہو چکی تھیں۔ وہ بڑی دشواری سے گھسٹتا ہوا برفاب کھائی سے باہر نکلا اور اپنی بنیان پھاڑ کر سر پر پٹی باندھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دفعتاً اُسے بُری طرح چونکنا پڑا۔ ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سنائی دی تھی اس کے ساتھ ہی کسی کے بھاگتے قدموں کی آہٹ اُبھری تھی۔ وہ ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے قریباً سو گز کے فاصلے پر ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔ وہ سرخ ریشمی لباس میں تھی اور کسی سے بچنے کے لیے تیزی سے بھاگی جا رہی تھی پھر گوبند کو وہ لوگ بھی نظر آ گئے جن سے بچنے کے لیے وہ بھاگ رہی تھی۔

وہ چار افراد تھے ان میں سے دو کے ہاتھ میں رائفلیں بھی تھیں۔ بھاگنے والوں میں سب سے

آگے ایک خوش پوش توانا شخص تھا۔ وہ بھاگنے کے ساتھ ساتھ دھمکی آمیز لہجے میں لڑکی کو رُکنے کا حکم بھی دے رہا تھا گوبند اسے دیکھ کر اور اس کی آواز سن کر حیران رہ گیا۔ وہ سٹیج کا بنگالی اداکار جاکرانی تھا۔ جاکرانی ایک معروف شخص تھا اور اسے بہت سے لوگ جانتے تھے۔ گوبند کو معلوم تھا کہ نیچے گورا پہاڑ کی طرف جاکرانی کا ذاتی بنگلہ ہے اور وہ کبھی کبھار وہاں رہنے کے لیے آتا ہے۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ جاکرانی اس لڑکی کے پیچھے کیوں ہے اور کیوں غصے میں اس قدر بھڑکا ہوا ہے۔ کھائی سے قریباً چالیس گز کی دُوری پر جاکرانی نے خوبصورت لڑکی کو جالیا اور بالوں سے پکڑ کر اس زور کا جھٹکا دیا کہ وہ چلاکر ڈھیر ہوگئی۔ جاکرانی بھوکے جانور کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے روتی چلاتی لڑکی کو بُری طرح پیٹا اور سخت سردی میں اس کے کپڑے تار تار کردیے۔ بعدازاں وہ اُسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا ڈھلوان سے نیچے لے جانے لگا۔ گوبند اب لڑکی کو بھی پہچان چکا تھا۔ وہ سٹیج کی ساحرہ اور بے شمار دلوں کی دھڑکن نوجوان اداکارہ روپ وتی تھی۔ دفعتاً جاکرانی کے کارندوں نے گوبند کو دیکھ لیا۔ اس ویرانے میں گوبند کی موجودگی اُن کے لیے جہاں تعجب خیز تھی وہاں تشویش ناک بھی تھی۔ گوبند یہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور یقینی طور پر تھیٹر کے ایک مشہور اداکار کو پہچان بھی چکا تھا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد جاکرانی کے کارندے تیزی سے آگے بڑھے اور انہوں نے گوبند کو دبوچ لیا۔ گوبند نے اُن کی منت سماجت کی اور قسمیں کھائیں کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا اور نہ وہ کسی کو بتائے گا لیکن اُسے پکڑنے والے کچی گولیاں نہیں کھیلتے تھے۔ انہوں نے اسے بے بس کیا اور گھسیٹتے ہوئے نیچے نیم پختہ راستے پر لے گئے جہاں اُن کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔

یوں گوبند ایک چشم دید گواہ ہونے کے سبب اغوا ہوا اور جاکرانی کی حبس بے جا میں چلا گیا۔ جاکرانی کے بنگلے میں اُسے ملازمین کی ایک کوٹھڑی میں ڈال کر باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ ایک مسلح چوکیدار ہر وقت اس کے اردگرد رہتا تھا اور خاص ضرورت کے تحت ہی گوبند کو کوٹھڑی سے باہر نکالا جاتا تھا۔ غالباً جاکرانی کو سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اس کا کیا کرے۔ گوبند کو قتل کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی اور وہ اسے آزاد بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس کی قید کو طول دیتا چلا گیا۔ اس قید میں رہتے ہوئے گوبند کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ روپ وتی بنگالی اداکار جاکرانی کی پتنی ہے۔ میاں بیوی میں کوئی تنازعہ چل رہا ہے اور وہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ گوبند مارچ میں قید ہوا تھا۔ مئی کے آخر میں جاکرانی اپنی بیوی کے ساتھ دلی واپس چلا گیا اور اس ویران بنگلے میں گوبند دو چوکیداروں کی نگرانی میں قید کے دن کاٹنے لگا۔ وہ ہر وقت روتا تھا اور اپنی بوڑھی ماں کو یاد کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا کہ اسے اپنے کرتوتوں کی سزا ملی ہے۔ اس نے فریب کاری سے پیسہ کمانا چاہا تھا نتیجے میں وہ شاہی کے ہاتھوں جان لیوا طور پر زخمی ہوا اور پھر اس قید خانے میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے طور پر فرار ہونے کی ایک دو کوششیں بھی کیں لیکن بُری طرح ناکام ہوا۔ نہ صرف یہ کہ اسے مارا پیٹا گیا بلکہ نگرانی بھی سخت کردی گئی۔ اسی طرح روتے پیٹتے تین ساڑھے تین مہینے اور گزر گئے۔ اب سردیاں آچکی تھیں...... ایک روز جاکرانی اپنی بیوی کے ساتھ پھر بنگلے میں آدھمکا۔ ان تین چار مہینوں کے دوران میاں بیوی کی ناچاقی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ روپ وتی کثرت سے شراب نوشی کرنے لگی تھی اور

ہفتے میں کئی بار جا کرانی سے پٹتی تھی۔ بنگلے کے اندرونی کمرے سے بلند ہونے والی یہ آوازیں گوبند کی کوٹھڑی تک بھی پہنچتی تھی۔ نشے میں دھت ہونے کے بعد روپ وتی جا کرانی پر چیخنے چلانے لگتی تھی یہاں تک کہ جا کرانی تشدد پر اتر آتا تھا۔ میاں بیوی میں خوب جمتی تھی اور کبھی کبھی اس ہنگامے کی آوازیں بنگلے سے باہر تک جاتی تھیں۔ سردیوں کی وجہ سے یہ مختصر کالونی سنسان ہو چکی تھی ورنہ ہر رات کا یہ ہنگامہ اڑوس پڑوس والوں کا جینا حرام کر دیتا۔

قریباً ہفتے پہلے کی بات تھی ایک رات گوبند اپنی تاریک کوٹھڑی میں بیٹھا تقدیر کے لکھے پر آنسو بہا رہا تھا کہ دروازے کی بالائی درز سے ایک لفافہ دھپ سے فرش پر آن گرا۔ گوبند نے جلدی سے لالٹین روشن کر کے لفافہ کھولا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس میں سو سو کے دس نوٹ ہیں۔ نوٹوں کے علاوہ ایک مختصر خط بھی تھا۔ یہ خط جا کرانی کی بیوی روپ وتی کی طرف سے تھا، اُس نے لکھا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ میری طرح تم بھی جا کرانی کے ایک بدنصیب قیدی ہو، اگر تھوڑی سی ہمت کرو تو آزادی تمہارا نصیب ہو سکتی ہے کل رات تمہیں اپنی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ملے گا۔ تمہارا چوکیدار بھی نشے میں دھت پڑا ہوگا۔ تم دیوار پھاند کر باہر نکل جانا مجھے پوری آشا ہے کہ بھگوان تمہیں کامیاب کرے گا۔ اگر کامیاب ہو جاؤ تو میرا ایک کام کر دینا۔ اس خط کے آخر میں میں اجیت نام کے ایک شخص کا پتہ لکھ رہی ہوں۔ یہ شخص دہلی کا رہنے والا ہے، تم یہ دوسرا خط اُس تک پہنچا دینا۔ اس لفافے میں جو رقم ہے وہ تمہارے اخراجات کے لیے ہے۔ میں اس کام کے لیے ساری زندگی تمہاری احسان مند رہوں گی..... فقط ایک مجبور''۔

خط کے عین مطابق اگلی شب گوبند کو اپنی منحوس کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ برآمدے میں دس بارہ قدم کے فاصلے پر مسلح چوکیدار بھی نشے میں چت پڑا تھا۔ گوبند جب اس کے پاس سے گزرنے لگا تو وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ روپ وتی کا دوسرا دعویٰ غلط ثابت ہوا تھا۔ چوکیدار نہ صرف ہوش میں تھا بلکہ جاگ رہا تھا۔ گوبند کے پاس اب بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا وہ بیرونی گیٹ کی طرف لپکا تاکہ کسی مناسب مقام سے دیوار پھاند سکے۔ چوکیدار نے چلا کر دوسرے چوکیدار کو خبردار کیا لیکن وہ اپنی کرسی پر نیم دراز رہا اور ٹس سے مس نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھڑی کے چوکیدار کی بجائے یہ گیٹ والا چوکیدار اتنا ٹلّی ہو گیا ہے یا پھر یہ ایک اتفاق تھا کہ چوکیداروں نے اپنی ڈیوٹی تبدیل کر لی تھی۔ بے ہوش چوکیدار کے قریب ہی پختہ کیبن کی دیوار سے ریوالور لٹک رہا تھا۔ گوبند نے لپک کر یہ ریوالور ہاتھ میں لے لیا۔ عقب میں آنے والا چوکیدار اب اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دونالی رائفل تھی جس کا رُخ گوبند کی طرف تھا۔ گوبند نے جب دیکھا کہ اور کوئی چارہ نہیں رہا تو لبلبی دبا دی۔ گولی سیدھی چوکیدار کی چھاتی پر لگی اور وہ رائفل سمیت پہلو کے بل گر گیا۔ کرسی پر نیم دراز چوکیدار پھر بھی بیدار نہیں ہوا۔ گوبند نے چھوٹے دروازے کی کنڈی گرائی اور بنگلے سے باہر نکل آیا۔

بنگلے سے فرار ہونے کے بعد وہ کئی روز مختلف جگہوں پر چھپتا رہا۔ اسے اُمید نہیں تھی کہ چوکیدار زندہ بچا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں اب وہ ایک خونی تھا۔ وہ آزاد ہو کر بھی اپنے اہل خانہ اور عزیز واقارب میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اس خیال سے خوفزدہ تھا کہ پولیس اور جا کرانی کے ہرکارے ہر جگہ اسے ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے۔ اخراجات کے لیے رقم اس کے پاس موجود تھی اس نے سیدھا

دہلی کا رُخ کیا ...... بنگلے سے فرار ہونے کے بعد گوبند سے ایک گڑبڑ ہو چکی تھی۔ ایک رات کئی گھنٹے تک اسے بارش میں بھیگنا پڑا تھا۔ اس کا لباس شرابور ہوگیا تھا اور جیب میں پڑے ہوئے وہ دونوں خط بھی بھیگ کر اور گل کر بیکار ہوگئے تھے۔

اس موقع پر گوبند اپنی رُوداد سناتے سناتے رُکا اور اس نے مجھے ان دونوں خطوں کے چند ٹکڑے دکھائے۔ ان ٹکڑوں سے صرف دو باتیں معلوم ہوتی تھیں ایک تو اجیت کمار کا نامکمل پتہ اور دوسرے یہ حقیقت کے روپ وتی نے اپنے پرانے شناسا اجیت کمار کو مدد کے لیے بلایا تھا کہ وہ اس تک پہنچے اور اسے اس کے ظالم شوہر سے رہائی دلائے ...... اب گوبند اجیت کمار تک پہنچنے کے لیے اس کی کوٹھی کے چکر لگا رہا تھا۔ پہلے دو تین روز تو اسے اجیت کا چوکیدار ہی ٹرخاتا رہا تھا۔ پھر اسے معلوم ہوا تھا کہ اجیت کسی شو میں حصہ لینے میرٹھ گیا ہوا ہے ......آج بھی گوبند اجیت کا پتہ کرنے ہی نئی آبادی آیا تھا۔ وہ چاندنی چوک سے سوار ہوکر پہنچا تھا۔ ابھی بس سے اُتر ہی رہا تھا کہ ہم نے دیکھ لیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بدک اُٹھا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

گوبند کے بارے میں اب سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ وہ کیسے گم ہوا، اب تک کہاں رہا اور ڈلہوزی سے یہاں دہلی میں کیونکر پہنچا؟ سب کچھ سامنے آچکا تھا۔ میری اصل جستجو گوبند کے لیے تھی اور گوبند کا کھوج لگ چکا تھا۔ لیکن گوبند کی وجہ سے جو ایک نیا کیس کھل گیا تھا اس کو انجام تک پہنچانا بھی میری ذمے داری تھی۔ اس کے علاوہ چاکرانی کو سزا بھی اسی صورت میں ہو سکتی تھی جب یہ ثابت ہو جاتا کہ وہ اپنی بیوی سے ناروا سلوک کرتا تھا اور اس سلوک کو چھپانے کے لیے اس نے گوبند کو نو ماہ تک حبس بیجا میں رکھا اور ذہنی و جسمانی اذیتیں دیں۔

اگلے روز اجیت کمار میرٹھ سے واپس آگیا اور ہم نے اس سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات اجیت کے گھر میں ہوئی۔ میرے ساتھ مقامی تھانے کا انسپکٹر اصغر علی اور انسپکٹر نذیر محمد بھی تھے۔ شروع کی گفتگو میں وہ میرے ساتھ تھے تاہم بعد میں اُٹھ کر چلے گئے۔ اجیت کمار مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ روپ وتی جیسی حسین و جمیل لڑکی کا ایسے مرد پر مرمٹنا سمجھ میں آتا تھا۔ محاورے کے مطابق چاند سورج کی جوڑی بن سکتی تھی۔ روپ وتی میں اگر نسوانی خوبیاں یکجا نظر آتی تھیں تو اجیت مردانہ صفات میں کسی سے کم نہیں تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے اجیت کمار کو اپنے ڈھب پر لانا شروع کیا۔ میں روپ وتی کے ساتھ اس کے معاشقے اور پھر دوری کی کہانی اسی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے میں مجھے دیر تو لگی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ میں نے جب اجیت کو روپ وتی کے خط کے ٹکڑے دکھائے تو وہ ایک دم ہکا بکا نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے کوئی دبیز پردہ ہٹ رہا تھا۔ وہ پوچھنے لگا کہ یہ خط مجھے کہاں سے اور کیسے ملا؟ میں نے اسے گوبند کے بارے میں بتایا اور اس سلسلے میں دیگر ضروری باتوں سے آگاہ کیا۔ اس نے کہا "روپ کی شراب نوشی کا تو مجھے پتہ تھا نواز صاحب...... مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ پتی پتنی میں ناچاقی اتنی بڑھ چکی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا۔ یہ سب کیسے ہوا ہے۔ عام لوگوں کے سامنے تو اُن دونوں کے تعلقات ایسے خراب نہیں تھے؟"

میں نے کہا "اجیت صاحب! جیسے بھی ہوا ہے بہرحال یہ سب کچھ ہو چکا ہے میں خود اس بات کا گواہ ہوں۔ روپ وتی خود کو چاکرانی کے گھر میں "قیدی" محسوس کر رہی ہے اور کسی بھی قیمت پر اس کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی ہے ......اور ہم انشاء

اللہ اسے آزاد کرائیں گے بھی لیکن اس کے لیے آپ کو بھی ہم سے تعاون کرنا ہوگا اور وہ حالات بتانے ہوں گے جن کے نتیجے میں روپ وتی جاکرانی جیسے شخص کے جال میں پھنسی ہے"۔

اجیت کمار نے ایک گہرا سانس لیا اور سگریٹ سلگا کر بولا "انسپکٹر صاحب! اس سلسلے میں بہت کچھ اخباروں رسالوں میں چھپتا رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے مجھے بے وفا ٹھہرایا ہے اور کچھ نے روپ کو دغا بازی کا تمغہ دیا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ میری نظر روپ کی دولت پر تھی اور کچھ کہتے ہیں کہ میں اس کی جوانی سے کھیل کر اسے چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں پریس میں آئی ہیں لیکن حقیقت سے ان کا دُور کا بھی تعلق نہیں"۔

میں نے کہا "لیکن یہ تو حقیقت ہے ناں کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آکر دُور گئے ہیں..... بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک موقع پر روپ وتی سے آپ کا جھگڑا ہوا تھا اور آپ نے اسے تھپڑ مارا تھا"۔

اجیت نے کش کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا "ہاں..... یہ جھگڑے والی بات کسی حد تک درست ہے۔ درحقیقت یہی جھگڑا اس کش مکش کا انجام ثابت ہوا جو پچھلے دو برسوں سے میرے اور روپ میں جاری تھی"۔

"کیسی کش مکش؟" میں نے پوچھا۔

"بس یہی بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے"۔

اجیت نے درد ناک انداز میں مسکرا کر کہا "ہماری کش مکش کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی، یوں سمجھ لیجیے کہ ایک بیکار کی اکڑ تھی جو ہمیں ایک دوسرے سے دُور رکھے ہوئے تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جنہیں ہم نے خواہ مخواہ اپنے لیے مسئلہ بنالیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو بے انتہا چاہنے کے باوجود کھچے کھچے رہتے تھے۔ معمولی باتوں پر روٹھ جاتے تھے اور مہینوں ایک دوسرے سے آنکھ نہیں ملاتے تھے۔ کبھی میں کسی بات کو اپنی ہتک سمجھ لیتا تھا کبھی وہ رائی کے دانے کو پہاڑ بنا لیتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو سمجھ آتا ہے کہ ہم دونوں میں بچپنا تھا۔ یہ بچپنا ہم سے چھوٹی چھوٹی غلطیاں کراتا رہا یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ یہ جدائی اس لیے زیادہ افسوس ناک تھی کہ ہم منزل کے قریب پہنچ کر راستہ بھٹکے تھے۔ ہماری شادی کی بات چل نکلی تھی۔ میری والدہ راضی تھیں والد بھی رضامندی ظاہر کر چکے تھے۔ دوسری طرف روپ وتی کی والدہ اور بہنیں بھی خوش تھیں مگر اچانک سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے ایک معمولی بات پر ہمارا جھگڑا ہوا۔ میرے ایک گہرے دوست نے سٹیج شو کا انتظام کیا تھا۔ اس شو میں روپ وتی بھی حصہ لے رہی تھی۔ شو کی ساری ٹکٹیں بک چکی تھیں۔ رات آٹھ بجے شو ہونا تھا اور ایک گھنٹہ پہلے روپ وتی نے شو میں شرکت سے انکار کر دیا۔ شو کے منتظمین کے چھکے چھوٹ گئے۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور چاہا کہ میں روپ وتی سے سفارش کروں۔ میں روپ وتی کو منانے کے لیے پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کی بڑی بہن کو انگلینڈ جانا ہے اور وہ اسے "سی آف" کرنے کے لیے ہوائی اڈے جانا چاہتی ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ شو میں شرکت اس کے لیے زیادہ ضروری ہے، مالک کو بہت نقصان اُٹھانا پڑے گا اور بدنامی الگ ہوگی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر وہ کسی طور نہیں مانی۔ اپنی بات پر اڑ جانے کی اس کی یہی عادت ہمیشہ جھگڑے کا سبب بنتی تھی۔ اس دن معاملہ میری برداشت سے باہر ہوگیا اور میں نے بھنا کر اسے تھپڑ دے مارا۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس

واقعے کو دو ڈھائی برس گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد کبھی ہماری بات نہیں ہوئی۔ دونوں گھرانوں نے بھی قطع تعلق کرلیا۔ جھگڑے کے چار ماہ بعد کی بات ہے۔ ایک روز میں نے بے پناہ صدمے سے یہ خبر سنی کہ روپ وتی نے ایک رنڈوے سے شادی کرلی ہے۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ میری مراد رابندر ناتھ چاکرانی سے ہے۔ میں اسے بُرا آدمی تو نہیں کہہ سکتا لیکن وہ بالکل اوباش ٹائپ کا آدمی ہے۔ تعلیم غالباً اس کی میٹرک تک ہے۔ باپ پہلوانی کرتا تھا اور اپنے حریفوں کی ہڈی پسلی توڑنے میں مشہور تھا۔ چاکرانی خود بھی جنگجو قسم کا آدمی ہے۔ میری اس سے بہت کم ملاقات ہوئی ہے اور اس کے گھریلو حالات کے بارے میں تو میری معلومات صفر ہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس کے قریبی دوست بھی اس کے گھریلو حالات کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی ذاتی زندگی کو کاروباری زندگی سے بالکل الگ رکھتے ہیں۔ شادی کے فوراً بعد اس نے روپ وتی کو ڈراموں میں حصہ لینے سے منع کردیا تھا۔ وہ عام تقریبات میں بھی کم ہی نظر آتی تھی...... میں تو خط کے یہ ٹکڑے دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں ان فقروں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ...... کسی قیدی کی زندگی گزار رہی ہے۔ روپ وتی جیسی پڑھی لکھی نازک مزاج لڑکی کی چاکرانی جیسے شوہر سے نبھ ہی نہیں سکتی تھی"۔

میں نے کہا" چاکرانی آپ کی اور ہماری توقع سے بہت آگے کی چیز ہے اجیت کمار صاحب، اگر روپ وتی کچھ روز مزید اس کے پاس رہ گئی تو وہ ضرور اُسے پاگل کردے گا۔ میں آپ کی بات سے پورا اتفاق کرتا ہوں کہ روپ وتی نے چاکرانی جیسے شخص سے شادی کرکے غلطی کی تھی لیکن عورت کو تو ہمیشہ سے کم عقل سمجھا جاتا ہے کیا آپ کی ذمے داری نہیں تھی کہ اُسے اس گڑھے میں گرنے سے بچاتے۔ آخر آپ مرد تھے۔ مرد کی ہمت اور برداشت عورت سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ اگر وہ ضد میں آگئی تھی تو آپ ہی ضد چھوڑ کر معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرتے"۔

وہ بولا" آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں نواز صاحب لیکن وہ کوئی بے آسرا لڑکی نہیں تھی اور نہ ہی نابالغ تھی۔ اپنا اچھا بُرا خوب ٹھیک طرح سمجھتی تھی اور سمجھانے بجھانے کے لیے اس کے بزرگ بھی موجود تھے اور پھر مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ آناً فاناً خبر ملی کہ روپ کی شادی چاکرانی سے ہورہی ہے۔ دو روز بعد اس شادی کی تصویر بھی اخبار میں چھپ گئی"۔

میں نے پوچھا" اب اس کے بزرگان کہاں ہیں انہیں دکھائی نہیں دیتا کہ اُن کی بیٹی کے ساتھ کیا ہورہا ہے"۔

اجیت نے کہا" اس کی بڑی بہن شادی کرکے انگلینڈ چلی گئی تھی، اس کی ماں کو بلایا پھر بھائی بھی چلے گئے۔ اب ایک خالہ کے سوا اُس کا کوئی قریبی عزیز دہلی میں نہیں ہے۔ وہ خالہ بھی اکثر شہر سے باہر رہتی ہے۔ اس کا خاوند سرکاری ملازم ہے اور یہ ملازمت گھومنے پھرنے کی ہے"۔

اجیت کے بیان سے بات پوری طرح واضح ہوگئی تھی۔ روپ وتی اگر رابندر ناتھ چاکرانی کے چنگل میں پھنسی تھی تو اس میں زیادہ قصور روپ وتی کا اپنا تھا۔ درحقیقت اس نے اجیت سے انتقام لینے کے لیے چاکرانی سے شادی کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ چاکرانی تھیٹر کی دنیا میں اجیت کا حریف ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اس نے اپنا آپ چاکرانی کی جھولی میں ڈال کر اجیت کے دل پر آرے چلائے تھے۔

شب و روز اسے تڑپایا تھا اور رقابت کی آگ میں جلایا تھا لیکن پھر اس آگ میں وہ خود بھی جلنے لگی تھی جسے اس نے شوہر بنایا تھا وہ بھی کاٹھ کا الو نہیں تھا۔ یقیناً اسے بھی اندازہ ہو گا کہ روپ وتی نے اپنا نوخیز جوبن اس کی بانہوں میں پھینکا ہے تو کیوں پھینکا ہے۔ وہ روپ وتی اور اجیت کے قصے سے پوری طرح آگاہ تھا لہٰذا شادی کے پہلے روز سے اُن دونوں میں وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکا جسے محبت کا رشتہ کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ روپ وتی نے جاکرانی کو بیوی کی محبت دینے کی کوشش کی ہو لیکن جاکرانی اسے شوہر کا اعتماد نہیں دے سکا تھا۔ اب وہ خوبصورت چڑیا ایک بے مقصد رشتے کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اور پھڑ پھڑا رہی تھی...... اب اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہوا تھا اور وہ مدد کے لیے اپنے ناراض محبوب کو پکار رہی تھی...... بڑی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ میں تو اسے بھی اجیت کی مہربانی ہی کہوں گا کہ وہ روپ وتی کی مصیبت کا سن کر یوں بے قرار نظر آنے لگا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو سوچتا ایک بے وفا عورت کے لیے اسے کیا ضرورت پڑی ہے جاکرانی جیسے بااثر شخص سے ٹکرانے کی...... خط کے ٹکڑے دیکھنے اور مجھ سے دیگر حالات جاننے کے بعد اُس کی خوبصورت آنکھوں میں کسی بے نام جذبے کی آگ سی جلنے لگی تھی اور یوں لگتا تھا وہ اڑ کر ڈلہوزی پہنچ جانا چاہتا ہے۔ سارے پرانے شکوے بھول کر ہر نفع نقصان فراموش کر کے اور دل کے سارے داغ چھپا کر وہ ایک بار پھر روپ وتی کو گلے لگا لینا چاہتا ہے۔ عشق ایسا ہی اوٹ پٹانگ ہوا کرتا ہے۔ اونٹ کی طرح اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ آنے والے لمحے کی طرح کوئی اس کے بارے میں پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ جب اجیت اور روپ وتی کے ملاپ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی انہوں نے خود اپنے درمیان فاصلے پیدا کر لیے تھے اور اب جب کہ اُن کے درمیان رشتے کی ایک بہت بڑی دیوار حائل تھی وہ ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے...... لیکن وقت گزر چکا تھا اور گزرا ہوا وقت شاذ و نادر ہی کسی کے لیے واپس لوٹا کرتا ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وقت روپ وتی اور اجیت کے لیے واپس لوٹے گا یا نہیں۔

تین چار روز بعد یہ کیس فیصلہ کن موڑ پر پہنچ گیا۔ میرے اور بلال شاہ کے علاوہ گوبند اور اجیت کمار بھی ڈلہوزی پہنچ چکے تھے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے میں دو ہیڈ کانسٹیبلوں کے ساتھ گورا پہاڑ کی طرف روانہ ہوا۔ جیپ کے ذریعے ایک طویل چکر کاٹ کر جانا پڑا تھا لہٰذا ایک گھنٹے بعد جب ہم گورا پہاڑ کے دامن میں پہنچے تو چاروں طرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ بلندی پر واقع بنگلوں میں صرف چودہ نمبر بنگلے میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ جیپ سے اُتر کر ہم بنگلے کے مین گیٹ پر پہنچے اور چوکیدار کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع اندر بھجوائی۔ تھوڑی ہی دیر بعد چوکیدار واپس آ گیا وہ ہماری آمد سے کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ اُس نے ہمیں سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ڈرائی فروٹ کی طشتری سامنے رکھ کر چلا گیا۔ رابندر ناتھ جاکرانی قریباً پندرہ منٹ بعد آیا۔ اُس نے معذرت کی اور کہا کہ وہ پوجا کے کمرے میں تھا۔ بڑی زبردست اداکاری کر رہا تھا کم بخت...... آنکھوں میں ویرانی تھی اور چہرے پر مظلومیت کے سائے۔ ایک بدنصیب شوہر کی جیتی جاگتی تصویر بنا ہوا تھا وہ۔ میں اس کی اداکاری سے لطف اندوز ہونے لگا۔

میں نے پوچھا ”اب آپ کی مسز کی طبیعت

کیسی ہے؟"

"بس جی بھگوان کی مرضی ہے" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا" وہ جس حال میں رکھے خوش رہنا چاہیے"۔

"یعنی کچھ افاقہ نہیں ہوا"۔

"انسپکٹر صاحب! افاقہ اُس وقت ہوتا ہے جب مریض خود بھی صحت یاب ہونا چاہے لیکن جو مریض خود کو تباہ کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہو اُسے کون روک سکتا ہے۔ پہلے وہ دن بھر میں ایک بوتل پیتی تھی اب اس سے بھی بڑھ گئی ہے۔ نشہ نہ ملے تو ہنگامہ کرتی ہے۔ خودکشی کی دھمکیاں دیتی ہے۔"

اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔

آدمی بے شک بہت بُرا تھا لیکن اداکار اچھا تھا۔ کوئی اسے دیکھ کر یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس نے ایک عورت کو ڈیڑھ برس سے جھوٹی انا کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ اُس کے علاوہ وہ اغوا، جس بیجا اور ایذا رسانی جیسے جرائم میں ملوث ہے۔ میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا "چچ چچ بہت ترس آرہا ہے آپ پر، اور آپ کی ہمت پر داد دینے کو بھی جی چاہ رہا ہے۔ میاں بیوی کے رشتے کا صحیح حق ادا کررہے ہیں آپ۔ بیمار بیوی کی تیمار داری کے لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں بیٹھے ہیں آپ کو...... تو دکٹوریہ کراس ملنا چاہیے بلکہ کوئی اس سے بھی بڑا ایوارڈ ہونا چاہیے"۔

"جی؟" وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"جی" میں نے اثبات میں سر ہلایا "کتنا خیال ہے آپ کو اپنی پتنی کا، اس کی بیماری کو راز رکھنے کے لیے بندے تک اغوا کر لیتے ہیں آپ اور کئی کئی ماہ تک اُن کے لیے طعام قیام کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ کون پتی ایسا مائی کا لال ہوگا جو اس حد تک جائے گا، ونڈرفل...... ریئلی ایکسٹرا آرڈنیری"۔

چاکرانی کا ماتھا اب پوری طرح ٹھنک چکا تھا۔ وہ منمنا کر بولا" میں...... کچھ سمجھ نہیں پا رہا آپ کیا کہہ رہے ہیں"۔

میں نے کہا" سمجھ تو تمہیں ساری آرہی ہے لیکن تم تسلیم نہیں کر رہے ہو"۔

میں ایک دم آپ سے "تم" پر اُتر آیا تھا۔ وہ بوکھلا کر رہ گیا" انسپکٹر! کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو کچھ پی کر تو نہیں آگئے ہو" میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اُس نے چرمی بیگ میں رکھی ہوئی ہتھکڑی نکال لی۔ ڈرائنگ روم کی خاموشی میں ہتھکڑی کی کھڑکھڑاہٹ بڑی دھماکہ خیز محسوس ہوئی۔ چاکرانی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ میں نے اس موقعے پر مناسب سمجھا کہ ریوالور نکال لیا جائے۔ ابھی میرا ہاتھ ہولسٹر کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ پہلو میں ایک دروازہ دھماکے سے کھلا اور میں نے قیم قیم شاہی کو تیر کی طرح اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی مانند مجھ سے ٹکرایا اور مجھے لیتا ہوا فرش پر دُور تک پھسل گیا۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا اور آنکھوں کے سامنے چند لمحے کے لیے دھندی پھیل گئی۔ دھند صاف ہوئی تو میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو کھڑکی سے کود کر بھاگتے دیکھا۔ یہ ہندو کانسٹیبل تھا اور اس "قوم کے لوگ" ایسے موقعوں پر اکثر بھاگا ہی کرتے ہیں۔ دوسرا کانسٹیبل سکھ تھا شاہی کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رائفل کو ایسی پوزیشن میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاہی پر گولی چلا سکے لیکن اس سے پہلے کے رائفل ایسی پوزیشن میں آتی یا میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کانسٹیبل کی مدد کر سکتا۔ ایک برق سی میری نگاہوں میں کوندگئی۔ میں نے شاہی کی تلوار کو کانسٹیبل کے پیٹ میں گھستے اور باہر نکلتے دیکھا۔

کانسٹیبل کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ تڑپ کر فرش پر جاگرا۔ یہ سارا واقعہ ایک سیکنڈ کے مختصر وقت میں رونما ہوگیا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں سیدھا کھڑا ہوا تو شاہی دونوں ہاتھوں میں خون آلود تلوار سونت کر میرے سامنے آچکا تھا۔

وہ مناظر میری زندگی کی چند ناقابل فراموش یادوں کا حصہ ہیں۔ آج بھی تصور کرتا ہوں تو سب کچھ آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ جاتی ہے۔ شاہی کا سفاچٹ چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور آنکھوں میں جنون کا رقص تھا۔ وہ بڑی خوفناک آواز میں غرایا۔ ”تھانیدار تجھے کہا تھا ناں۔ اس وقت کو بھولنا مت..... اس وقت کو یاد رکھنا۔ بول..... کہا تھا ناں تجھے؟“ وہ ہوش وحواس سے بیگانہ تھا اور میرے خون کا پیاسا نظر آرہا تھا۔ میں اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا رہا ہونا بعید از قیاس تھا۔ یقیناً وہ جیل توڑ کر آیا تھا۔ بہرحال یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔ یہ وقت تھا شاہی کی قاتل تلوار پر نگاہ رکھنے کا اور خود کو اس تلوار کی ظالم کاٹ سے بچانے کا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اُس وقت میرے قدموں میں زخمی کانسٹیبل کا جسم پھڑک رہا تھا اور میں دیوار سے پشت لگائے شاہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید چاکرانی نے شاہی کو روکنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن شاہی کہنے سننے کی حد سے گزر چکا تھا ”میرے قتل“ سے کم وہ کسی بات پر راضی نہیں تھا، غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ ہی وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے پہلے دو وار میں نے صاف بچائے لیکن تیسرا وار میرے کندھے پر پڑا اور تلوار کی دھار جرسی قمیص اور بنیان کاٹ کر کندھے میں پیوست ہوگئی..... ایک بار مجھے نشانہ بنانے کے بعد شاہی کی درندگی کچھ اور بڑھ گئی وہ اندھا دھند مجھ پر وار کرنے لگا۔ میں اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کے وار بچا رہا تھا۔ معلوم نہیں کتنی بار شاہی کی تلوار میرے جسم کو چھو کر گزری۔ کتنے چرکے لگے اور کتنے زخم آئے۔ مجھے وہ مناظر ”دھندلے دھندلے“ سے یاد ہیں۔ بنگلے کے نوکر ڈرے سہمے دیواروں سے لگے تھے۔ چاکرانی کا چہرہ متغیر ہورہا تھا اور وہ چلا چلا کر شاہی سے کچھ کہہ رہا تھا میرا لباس کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور تلوار چھیننے کی کوشش میں ایک ہاتھ بُری طرح سے زخمی تھا جونہی میں ڈرائنگ روم کی کھڑکی پر پہنچا میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ بنگلہ چونکہ ڈھلوان پر تھا لہٰذا کھڑکی سے چھلانگ لگا کر میں قریباً بیس فٹ نیچے پتھریلی زمین پر گرا۔ دونوں پاؤں پر چوٹ آئی تاہم ایسی چوٹ نہیں تھی کہ میں کھڑا نہ ہوسکتا۔ جیپ قریباً چالیس گز کی دُوری پر موجود تھی اور اس میں ایک بھری ہوئی شاٹ گن رکھی تھی۔ میں دوڑ کر جیپ تک پہنچ سکتا تھا لیکن نجانے کیوں مجھے امید تھی کہ جیپ تک جانے کی نوبت نہیں آئے گی اور پھر وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا غضب میں پھنکارتے ہوئے شاہی نے اپنے ڈیل ڈول کی پرواہ کیے بغیر کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ ترچھا ہوکر زمین پر گرا۔ جلدی سے اُٹھنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر پھر گر گیا۔ میں نے اسے دوسری کوشش کرنے کا موقع نہیں دیا اور لپک کر دبوچ لیا۔ جونہی اس کی تلوار والی کلائی میری گرفت میں آئی میں نے بے پناہ نفرت سے کلائی کو مروڑا اور تلوار اُس کے ہاتھ سے گرادی۔ اس نے اپنے استرا پھرے ہوئے سر سے ٹکر مار کر مجھے گوبند کی طرح کسی کھائی میں پھینکنا چاہا لیکن اس دفعہ اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی ٹکر میرے چہرے کی بجائے سر پر لگی یہ آخری وار تھا جو اس

نے کیا۔ اس کے بعد وہ صرف دفاع کرتا رہا اور آخر دفاع کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اردگرد کے بہت سے مقامی لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو چکے تھے۔ یہ میرے حق میں بہت بہتر ہوا کیونکہ مجمع لگنے کے بعد چاکرانی یا اُس کے نوکروں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ کسی بھی طرح شاہی کی مدد کر سکتے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر یہ سارا کھیل ختم ہو گیا۔ شاہی لہولہان فرش خاک پر پڑا تھا۔

شاہی اور چاکرانی گرفتار ہوئے (شاہی کے کارندے دولورام کو بعد میں، میں نے پٹھانکوٹ سے پکڑ لیا) تھوڑی دیر بعد ڈلہوزی سے پولیس کی مزید نفری گورا پہاڑ پہنچ گئی۔ اس نفری کے ساتھ دو ڈاکٹر اور ابتدائی طبی امداد کا سامان بھی تھا۔ سکھ ہیڈ کانسٹیبل کے پیٹ میں تلوار کا گہرا زخم آیا تھا اور آنتوں کو نقصان پہنچا تھا۔ ڈاکٹروں نے اُسے چاکرانی کے بنگلے میں ہی طبی امداد پہنچائی اور پھر مزید علاج معالجے کے لیے جیپ میں ڈال کر ڈلہوزی لے گئے۔ پولیس کی مزید نفری آنے کے بعد ہم نے چاکرانی کے وسیع بنگلے کی تلاشی لی۔ چاکرانی کے بیڈروم سے عیاشی کے دیگر سامان کے علاوہ ایک نوعمر طوائف بھی برآمد ہوئی جس وقت میں بنگلے میں پہنچا چاکرانی اسی طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ نتیجے میں مجھے پندرہ بیس منٹ اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ آکر چاکرانی نے بتایا تھا کہ وہ "پوجا پاٹ کے کمرے" میں تھا......

(اچھی پوجا پاٹ تھی) روپ وتی کو بالائی منزل کے ایک تنگ تاریک کمرے سے برآمد کیا گیا۔ شراب نوشی نے اس کی حالت بہت پتلی کر دی تھی پھر بھی وہ خوبصورت نظر آتی تھی۔ یقیناً وہ بہت خوبصورت رہی ہو گی۔ ڈلہوزی سے پولیس پارٹی کے ساتھ اجیت کمار بھی آیا تھا۔ اجیت کو دیکھ کر وہ

زور زور سے رونے لگی۔ اجیت نے اسے کندھے سے لگا لیا اور دلاسہ دینے لگا۔

ڈلہوزی کے تھانے میں پہنچ کر روپ وتی نے جو طویل بیان دیا اس میں اہم بات یہی تھی کہ چاکرانی نے اسے جس بہانہ میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ "یہ میرا شریک حیات نہیں جلاد ہے۔ اس نے ڈیڑھ برس سے مجھے قید تنہائی میں رکھا ہوا ہے۔ میں دن رات اس کی گالیاں سنتی اور

جوش میں کھوگئے ہوش

کہتے ہیں کہ جوش میں کبھی بھی ہوش نہیں کھونے چاہئیں ورنہ لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔ امریکہ کے ایک صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا جو اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ چھٹی منانے مچھلی کے شکار پر جا پہنچے اور جیسے ہی مچھلی کانٹے میں آئی یہ ایسے جوش میں آئے کہ ہوش ہی کھو بیٹھے۔ مچھلی کے کانٹے میں پھنستے ہی یہ بھی بھول گئے کہ وہ کشتی میں ہیں اور دھڑام سے پانی میں جا گرے۔ مچھلی ہاتھ میں کیا آتی تھی الٹا اسی کے پاس پانی میں پہنچ گئے۔

(مرسلہ: نورین سفیر۔ لالہ موسیٰ)

جادوئی گاڑی

گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کا محاورہ ایک کار پر بالکل صادق آتا ہے جو پل بھر میں رنگ، منظر اور شکلیں بدل کر دلفریب مناظر پیش کرتی ہے۔ جرمنی میں ایک شو کے دوران پیش کی گئی یہ کار مختلف لائٹوں کے ذریعے انتہائی تیزی سے یہ انوکھے کرتب دکھاتی ہے جو دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے لیکن مزے کی بات تو یہ ہے کہ یہ کار خود کرتب نہیں دکھا رہی بلکہ یہ صرف آنکھوں کا حسین دھوکہ اور جدید ٹیکنالوجی کا کمال ہے۔

(مرسلہ: ناجیہ خالد۔ راولپنڈی)

ٹھوکریں کھاتی رہی ہوں۔ بھگوان جانتا ہے مجھے شراب کی عادت ڈالنے والا شخص بھی یہی ہے۔ یہ پرلے درجے کا شکی مزاج اور مکار شخص ہے۔ یہ میری پاک دامنی پر شبہ کر کے مجھے بے وفائی کے طعنے دیتا تھا اور خود بازاری عورتوں کے ساتھ سوتا تھا۔ اس نے مجھے قتل نہیں کیا باقی ہر وہ ظلم کیا ہے جو یہ کرسکتا تھا.....''۔

روپ وتی کے سخت ترین بیان کے بعد چاکرانی کے خلاف کیس مزید مضبوط ہو گیا۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ شاہی کی وجہ سے پوری ہوگئی۔ شاہی کے ساتھ چاکرانی کا تعلق اب ثابت ہو چکا تھا۔ اس تعلق کی مختصر کہانی یہ ہے کہ کھائی سے گوبند کے غائب ہوجانے کے بعد شاہی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے نہیں بیٹھ گیا تھا۔ وہ مسلسل اس کی تلاش میں رہا تھا۔ آخر اُسے شک ہو گیا تھا کہ گوبند گورا پہاڑ پر اداکار چاکرانی کے بنگلے میں ہے۔ وہ چاکرانی کے بنگلے تک جا پہنچا تھا۔ چند دن کے تعلق کے بعد اُن دونوں میں ''انڈرسٹینڈنگ'' ہوگئی تھی شاہی نہ صرف چاکرانی کا راز دار بن گیا تھا بلکہ چاکرانی کی راتوں کو ''چمکانے'' کے لیے اُس کے واسطے شہر سے بازار حسن کے ''تحفے'' بھی لاتا تھا۔ جب شاہی میرے ہاتھوں پکڑا گیا تو یہ کام اس کے کارندے دولورام نے سنبھال لیا۔ ان لوگوں کی بدقسمتی اور روپ وتی کی خوش قسمتی کہ دولورام میری نگاہ میں آ گیا اور میں اس کا پیچھا کر کے چاکرانی کے بنگلے تک جا پہنچا۔

شاہی کو گرفتار کرنے کی کوشش میں مجھے کافی زخم آئے تھے لیکن خوش قسمتی سے کندھے کے علاوہ کوئی زخم سنگین نہیں تھا۔ تین چار روز کی مرہم پٹی سے یہ زخم ٹھیک ہو گئے۔ اس کہانی کا اہم ترین کردار گوبند ہے..... تو میتے کی پُراسرار گمشدگی کے بعد جب وہ ڈلہوزی پہنچا اور اپنے اہل خانہ سے ملا تو ایک دیدنی منظر دیکھنے میں آیا۔ اس موقع پر اس کے کئی پرستار بھی جمع ہو چکے تھے۔ پرستار..... پرستار ہی ہوتا ہے۔ ان پرستاروں کو بھی یہ معلوم تھا کہ ان کے ''ہیرو'' نے سالانہ ریس میں اپنی فتح کا سودا کیا تھا پھر بھی وہ اُس کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ اس موقع پر گوبند اپنے کیے پر بہت نادم نظر آ رہا تھا..... بہرحال اس ندامت میں ایک نئی زندگی مل جانے کی خوشی بھی شامل تھی۔ زندگی..... جو انسان کو میسر ہو تو غلطیوں کی تلافی کے ہزار ہا موقعے مل جاتے ہیں۔ گوبند کے لیے ایک اور خوش کن بات یہ تھی کہ وہ قتل کے الزام سے بچ گیا۔ چاکرانی کے بنگلے سے فرار ہوتے وقت اس کے ہاتھوں جس چوکیدار کو گولی لگی تھی وہ مرا نہیں تھا صرف زخمی ہوا تھا۔ یہ جسمانی ضرر کا کیس تھا اور حفاظت خود اختیاری کے ضمن میں آ کر زیادہ سنگین نہیں رہتا تھا۔

اس کیس کے بڑے مجرموں شاہی اور چاکرانی کو بالترتیب بارہ اور آٹھ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی جبکہ دولورام کو مختلف دفعات کے تحت پانچ سال قید بھگتنا پڑی..... ان واقعات کے قریباً ایک سال بعد اجیت کمار اور روپ وتی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ واقعی بہت خوب جوڑی تھی وہ۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ میاں بیوی تھیٹر کے لوگ ہیں۔ زیادہ دیر یہ ساتھ نبھا نہیں سکیں گے لیکن اس جوڑے نے ان تمام دعووں کو غلط ثابت کردیا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد بھی مجھے ان دونوں کے بارے میں اطلاعات ملتی رہیں۔ گو اُن کی نرینہ اولاد نہیں تھی مگر وہ دہلی میں بڑی خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے تھے.....!

تفاوت

فیضان مبارک

اب وہ سارا کنبہ مینار پاکستان پر رہا تھا وہاں میٹھو صاحب نے پہلے سے ہی تمام انتظامات کیے ہوئے تھے۔ سالگرہ کا نوکلو وزنی نو موم بتیوں والا کیک رکھا جا چکا تھا۔ قمقمے جلنے کو تیار تھے۔ تالیاں بجنے کو منتظر تھیں۔ بوسے لبوں پر مچل رہے تھے اور چہرے مسکراہٹوں کے لیے بے تاب تھے۔ گاڑی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

ایک خاندان کا فسانہ، چند لمحوں نے اُن کی زندگی کی کہانی بدل دی تھی

آج لوگ معمول سے زیادہ گزر رہے تھے۔ سڑکیں قدموں کے بوجھ تلے دبی جارہی تھیں۔ دھوپ بہت ترش معلوم نہ ہوتی تھی۔ گاڑیاں ہجوم سے بے پروا ہو کر فراٹے بھر رہی تھیں۔ درخت جھوم جھوم کر فطرت کا سہرا سنا رہے تھے۔ فیضان کو لگا جیسے اس کے ہاتھ میں بسکٹ انتہائی لذیذ ہوں۔

وہ تھا بھی تو نو سال کا بچہ، جس کی سات بہنیں اسی کی آرزو کے نتیجے میں دنیا پر آئیں تھیں۔ آج وہ خوب تیار ہو کر سجا ہوا تھا۔ معصوم سا پھول تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے کمال لگ رہا تھا۔ بوٹ خود چمکا کر



شیخ سعدی

شیخ سعدی سفر کر رہے تھے۔ ساتھ ان کا گدھا تھا۔ ایک گاؤں میں پہنچے تو رات پڑ گئی۔ سردی کے دن تھے۔ رات بسر کرنے کا ٹھکانا تلاش کرنے لگے۔ گاؤں والوں میں سے کوئی ٹھکانہ دینے پر رضامند نہ ہوا۔ آخر ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر والے نے کہا "میری بیوی دردِ زہ میں تڑپ رہی ہے۔ اگر دُعا کریں تو جگہ دے دُوں گا۔" شیخ سعدی مان گئے۔ انہیں کمرہ مل گیا۔ پھر انہوں نے کاغذ کے ایک پُرزے پر ایک تعویز لکھا اور گھر والے سے کہا، اسے مریضہ کے بدن پر باندھ دے۔ تعویز باندھتے ہی بچہ پیدا ہو گیا۔

اگلی صبح شیخ سعدی تو چلے گئے لیکن گاؤں والوں نے تعویز سنبھال کر رکھ لیا۔ جب بھی کسی گاؤں کی عورت کو زچگی کی تکلیف ہوتی تو وہ وہی تعویز لے جا کر باندھ دیتے۔ تکلیف رفع ہو جاتی۔

گاؤں کے مولوی کو اس بات پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر تعویز پر لکھی ہوئی آیت کا پتہ چل جائے تو اسے بڑا فائدہ ہو گا۔ مولوی نے جھوٹ موٹ کا بہانہ تراشا اور تعویز مانگ کر لے گیا۔ اسے کھولا تو لکھا تھا "یا اللہ میں اور میرا گدھا اب آرام سے ہیں۔ ٹھکانہ مل گیا ہے۔ باقی تُو جانے اور تیرا کام جانے۔"

(مرسلہ: ندیم احمد۔ ساہیوال)

سویا تھا۔ خوشبو کے جھونکے اس کے بدن سے اُٹھ رہے تھے۔ رات کو اس کی بہنوں اور ماں نے اس کی سالگرہ کا کیک کاٹا تھا اور تحفوں کے انبار میں دبا ہوا وہ کتنا پیارا لگ رہا تھا۔

آج فیضان کے ابو نے فون پر بھی اس سے بات کی اور اگلے ہی لمحے وہ فیضان کے سامنے آ گئے۔ اسے لگا وہ کوئی فلم دیکھ رہا ہے۔ وہ بار بار آنکھوں کو مل رہا تھا۔ سیٹھ نذیر اپنے بیٹے کو سرپرائز دے گئے اور جب وہ بغل گیر ہوئے تو فیضان کافی دیر تک ان کے بال کھینچتا رہا۔

اور اب وہ سارا کنبہ مینارِ پاکستان جا رہا تھا وہاں سیٹھ صاحب نے پہلے سے ہی تمام احکامات دیئے ہوئے تھے۔ سالگرہ کا ٹوکلوو زنی ہنومومِ بتیوں والا کیک رکھا جا چکا تھا۔ قمقمے جلنے کو تیار تھے۔ تالیاں بجنے کو منتظر تھیں۔ بوسے لبوں پر مچل رہے تھے اور چہرے مسکراہٹوں کے لئے بے تاب تھے۔ گاڑی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

یکا یک ..... ایک دلدوز گرج سے لاہور لرز اٹھا۔ یہ کسی خودکش کا کمال تھا جو چیتھڑے فضاؤں میں بلند ہوئے اور سرخ پانی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ کٹے پھٹے لاشے بکھر گئے۔ سات بہنوں کا اکلوتا بھائی، بہنوں سمیت کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ہر طرف ہا ہا کار مچ گئی فوارے کا زور ختم ہوتا گیا اور بالآخر دھرتی پر خون کا تالاب بن گیا اور اعضاء یوں تیرنے لگے کہ عرش بھی کانپ اُٹھا ہوگا۔

ایک قلم سی چل گئی تھی، تحفوں کا انبار ڈوب گیا تھا۔ تازہ خون اور بارود کی ملی جلی بُو سے فیضان شرابور ہو گیا تھا، بوٹ اور تھری پیس بے مصرف ہو گئے تھے۔ ساتوں بہنیں اسی کی آرزو میں واپس ہو چکی تھیں۔

لوگ معمول سے کم ہو گئے تھے، سڑکیں بوجھ سے آزاد ہو چکی تھیں۔ دھوپ اور گرمی ہڈیوں کو پگھلا چکی تھی۔ گاڑیاں بالکل رُک چکی تھیں۔ درختوں سے مرثیے پڑھنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور دیکھنے والوں نے سمجھا کہ فیضان کو بسکٹ بہت بے ذائقہ لگے ہیں کیونکہ اس کے ہونٹوں پر سرخ پانی اور بسکٹوں کا آمیزہ بکھرا ہوا تھا اور...... اور...... فیضان کی زندگی کا کیک کٹ چکا تھا۔

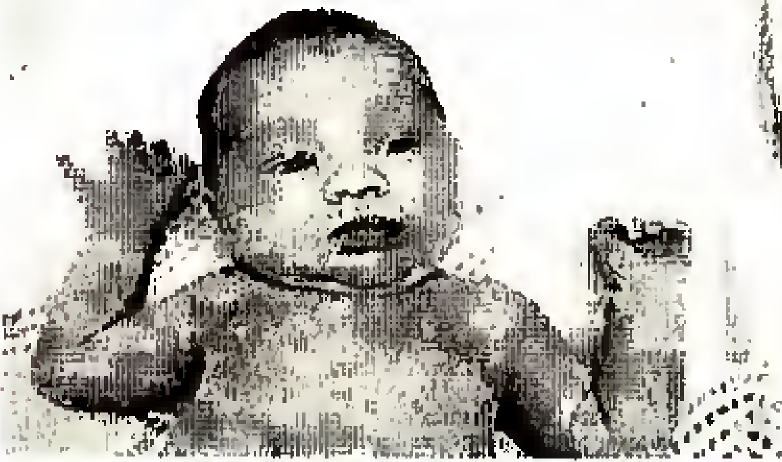
گرمی دانے

حکیم راحت نسیم سوہدروی

جب حبس کی حالت ہو تو جلد کی سب سے بیرونی جھلی کے نیچے آبی رطوبات کے چھوٹے چھوٹے قطرے موتیوں کی طرح اکٹھے ہو کر گرمی دانے بنا دیتے ہیں۔ اگر ان کو دبایا جائے تو کبھی درد، تکلیف اور جلن ہوتی ہے۔

موسم گرما میں جب تمازت آفتاب کے باعث جھلسا دینے والی گرمی ہوتی ہے تو انسان ہی نہیں حیوان اور پرند و چرند بھی اذیت محسوس کرتے ہیں۔ اس شدید موسم کا اثر جسمانی قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ انسان کے سارے وجود پر بھی ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اعمال و افعال میں سستی چھا جاتی ہے۔ جسم میں حرارت بڑھ جاتی ہے اور پیاس میں شدت ہو جاتی ہے۔ بعض حالات میں زبان خشک ہو کر تالو





ایک کروڑ سال پرانا ڈائنو سار کا ڈھانچہ دریافت کر لیا گیا

امریکہ میں دس ملین سال پرانا ڈائنو سار کا ڈھانچہ دریافت کر لیا گیا ہے جسے ماہرین نے کنگ آف گور کا نام دیا ہے۔ سات اعشاریہ تین میٹر لمبے اس ڈھانچے کو نمائش کے لئے امریکی ریاست اوٹاہ کے شہر سالٹ لیک سٹی کے عجائب گھر میں نمائش کے لئے پیش کر دیا گیا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ڈائنو سار کی یہ نسل پہلی بار منظر عام پر آئی ہے۔ جس سے قدرت کے پوشیدہ رازوں کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔

(شیخ اسامہ یعقوب / دھرم پورہ لاہور)

موبائل اور قلم ساتھ ساتھ

یوں تو موبائل فون سے کئی طرح کے مفید کام لئے جاتے ہیں لیکن اب اسے بطور بال پین بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جی ہاں ایک تخلیقی کمپنی نے "جیک پین" نامی انوکھی آئی فون اسیسری (Accessory) متعارف کرا دی ہے جسے ہیڈ فون پوڈ میں نصب کرتے ہوئے با آسانی زیر استعمال لایا جا سکتا ہے۔ اس ننھے سے پن نما قلم کو جب لکھنے کیلئے استعمال نہ کیا جا رہا ہو تو فولڈ کر کے فون کے اندر چھپایا جا سکتا ہے اور ضرورت کے تحت پوڈ سے نکال کر لکھا بھی جا سکتا ہے۔ کیوں ہے نا ایک تیر سے دو شکار، قلم کا قلم اور سیل فون کا سیل فون۔

(مرسلہ: صغیر احمد۔ لاہور)

سے جا لگتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہونٹوں کی سرخی غائب ہو کر سیاہی اور بے رونقی جنم لے لیتی ہے۔ پسینہ کثرت سے آتا ہے۔ جس سے جسم پسینہ سے شرابور ہوتا ہے۔ جب حبس کی حالت ہو تو ان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس دوران جلد کی سب سے بیرونی جھلی کے نیچے آبی رطوبات کے چھوٹے چھوٹے قطرے موتیوں کی طرح اکٹھے ہو کر گرمی دانے بنا دیتے ہیں۔ اگر ان کو دبایا جائے تو کبھی درد، تکلیف اور جلن ہوتی ہے۔ اس طرح یہ کسی نقصان کا باعث نہیں ہوتے تاہم اگر حبس یا شدید گرمی ہو تو ان دانوں میں بہت جلن یا چبھن ہوتی ہے۔ جس سے اذیت ہوتی ہے۔ جب ان کا اوپر والا حصہ الگ ہو جائے تو انفیکشن کے باعث پھوڑے، پھنسیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ دانے بہت اذیت ناک اور تکلیف دہ ہو جاتے ہیں۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ چھوٹے بچے زیادہ متاثر ہوتے ہیں کیوں کہ وہ گرمی کا اثر جلد قبول کرتے ہیں اور ان کا مدافعتی نظام کمزور ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو یہ دانے نکلتے ہیں وہ ان کے باعث شدید بے چینی اور گھبراہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ان دانوں میں بہت خارش چبھن ہوتی ہے۔ ان کی وجہ سے اکثر بچے رات بھر روتے ہیں۔ اگر ہوا چلتی رہے یا بجلی کا پنکھا، ایئر کولر یا ایئر کنڈیشنر میسر ہو تو پھر سکون رہتا ہے۔

بعض افراد اور خاندان میں یہ بہت زیادہ اور بعض میں بہت کم ہوتے ہے۔ اس کمی و بیشی کا تعلق ان کی خوراک سے ہے مثلاً جو لوگ گرم اشیاء جن میں انڈا، مچھلی، مرچ مصالحہ جات وغیرہ کا زیادہ استعمال کرتے ہیں، اس کے علاوہ تنگ و تاریک مکانات میں رہائش رکھنے والے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ جو افراد یا خاندان ٹھنڈے اور سرد مکانات میں رہتے ہیں۔ وہ اگر گرمی والے علاقوں میں یا مقامات پر جائیں تو ان کے جسم پر دانے بہت زیادہ ہو سکتے ہیں۔

علامات

جب جلد سے پسینہ کا اخراج رُک جاتا ہے اور یہ آبی قطرے جلد کے نیچے یک جا ہو کر دانوں کی صورت نمودار ہوتے ہیں تو گرمی دانے کہلاتے ہیں۔ ان میں جلن اور چبھن کا احساس ہوتا ہے کبھی

ایک طرف زیادہ ہوتے ہیں اور دوسری طرف فاصلے پر کم ہوتے ہیں۔ پہلے دانے کم ہوتے ہیں تو دوسرے نئے نکل آتے ہیں۔ یہ کبھی سرخ اور کبھی سفید ہوتے ہیں۔ عام طور پر کمر' گردن اور بغلوں کے درمیان نکلتے ہیں۔

بچاؤ کی تدابیر

☆ گرم اور محرک اشیاء سے پرہیز کیا جائے۔

☆ گرمی کی شدت سے بچا جائے' اس طرح گرمی کم ہونے سے پسینہ کم آئے گا۔

☆ روزانہ صبح وشام غسل کیا جائے تاکہ جسم میل کچیل سے محفوظ رہے اور مسامات کے بند ہونے کا امکان نہ رہے۔

☆ Polysists یا دیگر مصنوعی ریشہ دار اشیاء والے کپڑے بھی حساسیت (Allergy) کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان سے احتیاط کی جائے اور سوتی کپڑے استعمال کیے جائیں۔

☆ غذا میں گھیا' توری' کدو' مونگ کی دال اور ٹماٹر مفید ہیں۔

☆ آم کھانے کی زیادہ خواہش ہو تو آم کھانے کے بعد کچی لسی ضرور پی جائے تاکہ اس کے نتیجے میں ہونے والی گرمی کے اثرات کو ختم کیا جاسکے۔

☆ دھوپ میں چلنے پھرنے سے احتیاط کریں اور پسینہ زیادہ آنے کی صورت میں تولیہ یا سوتی کپڑے سے صاف کریں۔

☆ کمزور اشخاص کو اپنی صحت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

☆ موسم گرما میں انڈا' مچھلی' اچار' چائے اور کافی کا استعمال نہ کیا جائے کیونکہ یہ خون میں حدت پیدا کرتی ہیں۔

☆ آلو بخارا' لیموں' انار' جامن' تربوز' خربوزہ اور یم کی قلفی کا موسم گرما میں استعمال گرمی دانوں

اور گرمی سے محفوظ رہنے کے لیے مفید ہے۔

موسم گرما میں جب شدت کی گرمی کے باعث گرمی دانے نکلتے ہیں تو انتہائی اذیت ناک ہوتے ہیں لہٰذا ان سے محفوظ رہنے کے لیے مندرجہ بالا تدابیر اختیار کرلی جائیں تو ان کا دشوں سے ایک حد تک بچا جاسکتا ہے۔

علاج

☆ برف ملنے سے گرمی دانوں کی اذیت سے وقتی سکون ملتا ہے۔

☆ صندل سفید' عرق گلاب میں گھس کر ٹھنڈا کرکے لگانا مفید ہے۔

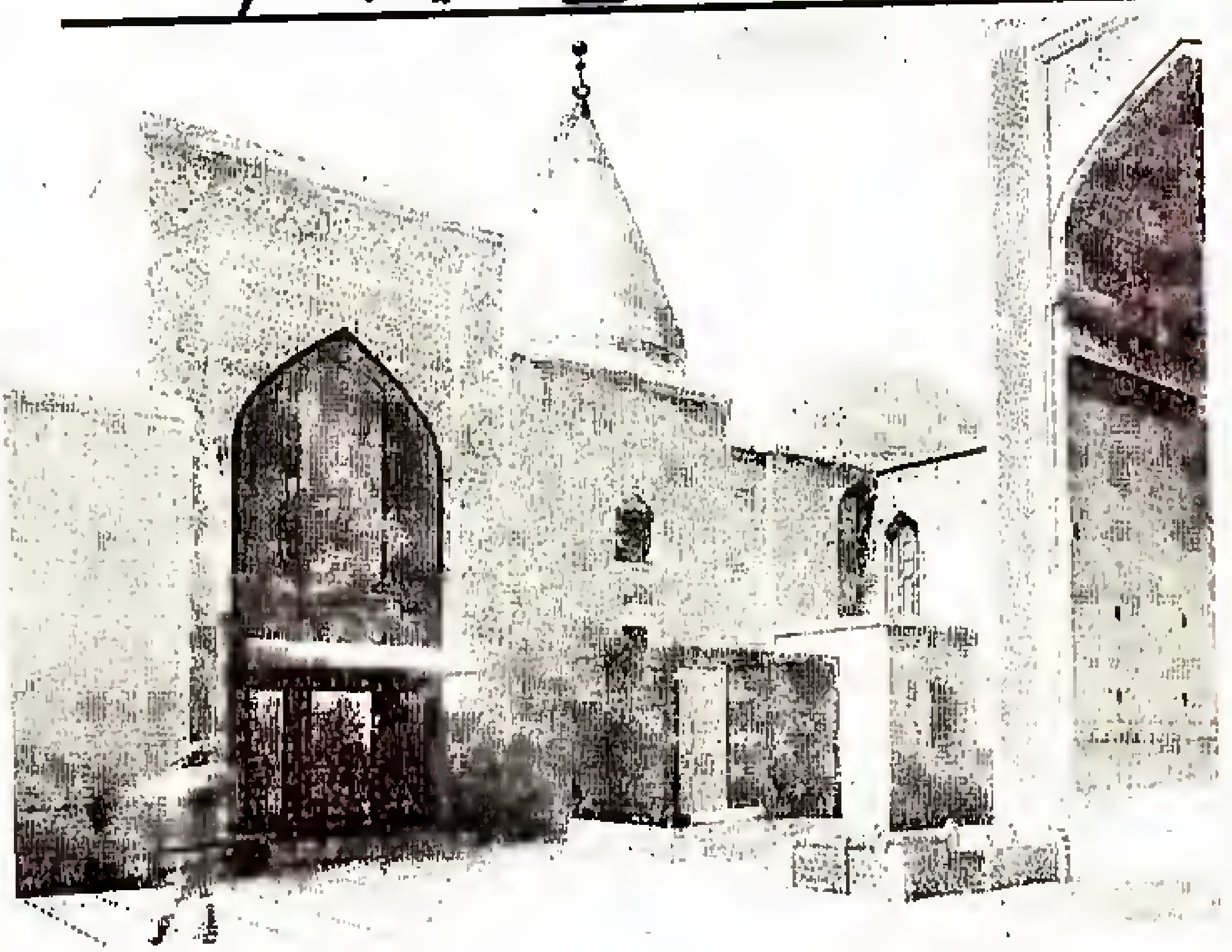
☆ لعاب بہی دانہ تین گرام' عناب پانچ دانے' مغز کدو تین گرام کا شیرہ نکال کر شربت نیلوفر دو چمچے بڑے ملا کر صبح وشام پینا مفید ہے۔

☆ خالق کائنات نے موسم گرما کی گرمی سے نکلنے والے دانوں کے انسداد کے لیے اس سے پہلے ہی موسم بہار میں گندم کے کھیتوں میں شاہترہ کی بوٹی پیدا کی ہے۔ جس میں فشار خون اور حدت خون کی اصلاح کے لیے عجیب النوع استعداد رکھی ہے۔ مطب کے تجربات شاہد ہیں کہ شاہترہ چھ گرام آدھے گلاس پانی میں جوش دے کر چھان کر شربت عناب دو چمچے ملا کر صبح وشام قبل از غذا پینا مفید ہے اور بہت مریضوں کو شفاء ہوئی ہے۔

☆ گرمی دانوں کی جلن اور خارش کے لیے بیرونی استعمال کے لیے شب یمانی (پھٹکری) اور کافور کو اہمیت حاصل ہے۔

☆ پھٹکری چھ گرام کو پانی میں حل کرکے غسل کیا جائے۔ چند روز تک یہ غسل دانوں کے لیے مفید ہے۔

☆ جوانہ ایک موثر دوا ہے اس کا استعمال گرمی دانوں کے لیے مفید ہے۔



حضرت بایزید بسطامیؒ

پروفیسر غلام رسول

سلطان العارفین کے حالات زندگی، آپؒ کو بزرگان دین میں وہ مقام حاصل ہے جو فرشتوں میں جبرئیلؑ کو حاصل ہے!

ایرانی صوبے قومس کے شہر بسطام میں ایک حجرہ موبدان تھا۔ اس میں ایک بہت ہی عابد و زاہد اور نیک نفس بزرگ رہتے تھے۔ جن کا نام شیخ عیسیٰ تھا۔ اُن کی زوجہ محترمہ اُمید سے تھیں۔ اُن کو یہ بات شدت سے محسوس ہوئی کہ جب بھی وہ کوئی مشتبہ غذا لاعلمی میں کھا لیتیں تو اُن کو عجیب قسم کی بےکلی اور بے چینی سے دوچار ہونا پڑتا اور جب تک وہ غذا اُن کے پیٹ سے باہر نہ آ جاتی ان کی طبیعت بےقرار ہی رہتی بعض اوقات تو اُن کو حلق میں اُنگلی ڈال کر وہ غذا باہر نکالنی پڑتی۔ اس کیفیت کو وہ بہت شدت سے محسوس کرتی تھیں۔ بچے کی ولادت میں ابھی چند ماہ باقی تھے کہ شیخ عیسیٰ اس دارِفانی سے رحلت فرما گئے۔

باپ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والا یہ یتیم بچہ آئندہ زندگی میں روحانیت کی کن بلندیوں کو چھوئے گا اور سلطان العارفین کہلائے گا اس بات سے کوئی بھی واقف نہیں تھا کہ یہ بچہ کون تھا۔ ان کو کیا مقام ملا، یہ بعد کی آنے والی دنیا نے دیکھا اور رہتی دنیا تک اُس کا نام روشن رہے گا۔ یہ یتیم بچہ حضرت بایزید بسطامیؒ تھے۔ آپؒ کو بزرگانِ دین میں وہ مقام حاصل ہے جو فرشتوں میں جبرئیلؑ کو حاصل ہے۔ توحید کے معاملات اور مسائل میں تمام بزرگوں کی انتہا آپؒ کی ابتدا ہے۔ آپؒ فرماتے تھے کہ حضرت کے گلستان میں جو پھول لوگوں نے دو سو سال کی محنت شاقہ سے حاصل کیے وہ میں نے اپنی اوائل عمری میں ہی حاصل کر لیے۔ بزرگان کی متفقہ رائے ہے کہ بایزیدؒ کے مراتب تک کوئی اور نہیں پہنچا۔

آپؒ نے مکتب میں داخل ہوتے ہی قرآن مجید کی آیات سے استدلال حاصل کرنا شروع کر دیا۔ آپؒ خدا کے اس فرمان کو کہ "میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو" پڑھ کر بہت زیادہ بے چین ہوئے اور والدہ سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا۔ والدہ نے کہا کہ میں تم کو خدا کے سپرد کرتی ہوں تم خدا کا شکر ادا کرو اور علم کی تلاش کرو۔ علم کی تلاش میں آپؒ نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں خاک چھانی۔ بہت سے علماء او مشائخ حضرات سے ظاہری اور باطنی علوم سیکھے۔

وہ مسلسل تیس سال شام کے صحراؤں اور میدانوں میں پھرتے رہے۔ اس مدت میں آپؒ نے 170 علماء اور مشائخ سے فیوض حاصل کیے۔ آپؒ کے اساتذہ میں امام جعفرؒ بھی شامل ہیں۔ آپؒ نے اپنے اساتذہ کی طرف کبھی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپؒ بہت جلد مکمل ہو گئے۔ امام صاحب کے حکم سے آپؒ واپس بسطام لوٹے۔ آپؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بلاشبہ میں نے اساتذہ اور علماء سے علوم دینوی اور دنیاوی سیکھے ہیں۔

لیکن درحقیقت یہ رہنمائی اور فیض مجھے اللہ تعالیٰ سے حاصل ہوا ہے کیونکہ دیگر مشائخ اور بزرگوں نے علم اپنے جیسے لوگوں اور بزرگوں سے سیکھا تبھی ان کا علم باقی نہیں رہا جبکہ میں نے علم خدا سے حاصل کیا اس لیے میرا علم زندہ ہے۔ آپؒ آنحضرت ﷺ کے اس قول مبارکہ "جو شخص اس چیز پر عمل کرتا ہے جسے وہ جانتا ہے تو اُسے خدا ایسے علم کا وارث بنا دیتا ہے جو اُسے معلوم نہیں ہے" کی تفسیر تھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرے علم کا ماخذ خدا کی بخشش ہے۔

آپؒ کرامات ظاہر کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص آپؒ کے ساتھ کافی مدت رہا۔ پھر آپؒ سے بددل ہو کر جانے لگا۔ آپؒ نے اس طرح جانے کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اتنی مدت ساتھ رہنے کے باوجود اس شخص نے آپؒ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ آپؒ نے فرمایا تم نے مجھے خلاف سنت اور خلاف شریعت کبھی کوئی کام کرتے دیکھا۔ جواب ملا بالکل نہیں۔ آپؒ اس پر سختی سے پابند ہیں۔ آپؒ نے فرمایا۔ اس سے بڑی اور کیا کرامت ہوگی۔

آپؒ ہمیشہ مسجد کی خدمت کرتے۔ آپؒ نے چالیس سال تک مسجد کی صفائی ستھرائی کا ذمہ اپنے سر لے رکھا تھا۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت لرز جاتے کہ مبادہ کہیں میں ناپاک تو نہیں ہوں کہ اس طرح میرے جانے سے مسجد آلودہ نہ ہو جائے۔ آپؒ کے مجاہدات بہت سخت تھے۔ آپؒ نے ایک مرتبہ آدھی رات کو ارادہ کیا کہ میں بقیہ رات عبادت کروں گا جبکہ نفس نے مخالفت کی اس پر آپؒ نے قسم کھائی کہ میں اپنے نفس کو ایک سال تک پانی سے محروم رکھوں گا۔ چنانچہ ایک سال آپؒ نے پانی کے بغیر گزارا۔ بقول مولانا رومؒ "پانی کا بکثرت استعمال سستی اور کاہلی کا باعث بنتا ہے"۔

حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ جناب بایزید بسطامیؒ کے مجاہدات اور نفس کشی کے متعلق اپنے مریدین کو بتلایا کرتے تھے کہ اسلام نام کے طور پر تو بہت آسان ہے لیکن اس کے کام اور پابندیاں بہت مشکل ہوتی ہیں۔ بایزیدؒ فرماتے کہ جب میں مسلمان ہوں۔ لوگ مجھے مسلمان سمجھتے ہیں تو میں مسلمان ہونے کا حق کیوں نہ ادا کروں۔

جب حضرت بایزیدؒ خراسان کی سیاحت میں مصروف تھے تو آپؒ کو حج کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ آپؒ ہر قدم پر نفل ادا کرتے کرتے کعبہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حج کے بعد آپؒ نے خیال کیا کہ میں خدا کے گھر گیا ہوں لیکن گھر والا مجھے کہیں نظر نہیں آیا لہٰذا میرا حج قبول نہیں ہوا۔ دوسرے سال بھی اسی طرح ہوا لیکن تیسرے سال آپؒ بہت خوش ہوئے کہ اب کی مرتبہ مجھے گھر والا ہی چار سو نظر آیا اور گھر نظر نہیں آیا۔

حضرت بایزیدؒ آنحضرت ﷺ کے سچے عاشق تھے مکہ جاتے تو مدینہ نہ جاتے کہ یہ خلاف ادب ہے کہ مدینہ کی زیارت مکہ کے ماتحت رکھی جائے۔ بلکہ وہ مدینہ باقاعدہ اہتمام کے ساتھ جاتے۔

آپؒ کے ایثار کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حج پر روانہ ہو رہے تھے کہ ضرورت مند آ گیا۔ آپؒ سے کہا کہ آپؒ کے پاس کتنی رقم ہے؟ آپؒ نے فرمایا میرے پاس 200 دینار ہیں اور میں حج پر روانہ ہو رہا ہوں۔ اُس نے سوال کیا کہ میں ضرورت مند ہوں آپؒ یہ رقم مجھے دے دیں اور میرے گرد طواف کرلیں آپؒ کا حج ہو جائے گا اور میری ضرورت پوری ہو جائے گی۔ آپؒ نے ایسا ہی کیا۔

نفس کشی کا یہ عالم تھا کہ آپؒ کو عمر بھر سیب کھانے کی آرزو رہی لیکن صرف اس وجہ سے نہیں کھایا کہ اس سے نفس کو تسکین حاصل ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ ایک عقیدت مند سیب لایا آپؒ نے حاضرین میں تقسیم کر دیئے اور فرمایا کہ اگر میں نفس کی آرزو پوری کردوں تو یہ مجھ پر غالب آجائے گا اور میں کچھ بھی نہ رہوں گا۔ جو شخص نفس کی آرزو پوری کرے وہ ہیچ ہے اس کے عمل میں سستی واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک عقیدت مند کہیں سے بہت ہی خوبصورت سیب لایا غالباً اُس کو معلوم تھا کہ حضرت کو سیب بہت پسند ہیں۔ آپؒ نے سیب دیکھا اس کی رنگت اور خوبصورتی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ کس قدر لطیف سیب ہیں۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ اللہ کا نام لطیف ہے اور یہ نام سیب کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔ بہت پشیمان ہوئے۔ اس کے بعد عمر بھر سیب کو چھوا تک بھی نہیں۔

حضرت بایزیدؒ ایک مرتبہ حضرت رسول اکرم ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضر تھے۔ درود و سلام کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی عالم میں غنودگی طاری ہوگئی۔ آنحضرتؐ کا دیدار ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بایزید اُٹھو جا کر اپنی ماں کی خدمت کرو۔ آپؒ اُسی وقت بسطام کے لیے روانہ ہوگئے۔ رمضان کا مہینہ تھا آپؒ کی آمد کی خبر سن کر لوگ آپؒ کے استقبال کے لیے جمع ہوگئے۔ آپؒ کا نفس اس طرح والہانہ استقبال پر بہت خوش ہوا۔ آپؒ نے فوراً روٹی کھانا شروع کر دی۔ لوگ آپؒ سے بدظن ہو کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بعد میں آپؒ نے اپنے خاص مریدین کو بتلایا کہ یہ لوگ کس قدر ظاہر بین ہوتے ہیں۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ مسافر پر روزہ فرض نہیں ہے۔ آپؒ جس وقت اپنے گھر پہنچے اس وقت آدھی رات ڈھل چکی تھی، آپؒ کی والدہ محترمہ مناجات اور درود وظائف میں مشغول تھیں اور دعا کر رہی تھیں یا اللہ میرے لختِ جگر کو واپس بھیج دے۔ آپؒ نے فوراً دروازے پر دستک دی اور کہا کہ والدہ میں آپ کا بیٹا بایزید ہوں اور واپس آ گیا ہوں۔ آپؒ کی والدہ آپؒ

کی جدائی میں بینائی سے محروم ہو چکی تھیں اور ان کی کمر دوہری ہو چکی تھی۔ انہوں نے فوراً آپؒ کو کلیجے سے لگایا۔ اس کے بعد بایزید کہیں نہیں گئے۔ ماں کی خدمت کرتے رہے۔ آپؒ فرماتے تھے کہ ماں کی خدمت اور رضا جوئی ہر کام پر فوقیت رکھتی ہے جو کچھ باہر جا کر مجاہدوں اور ریاضتوں میں تلاش کرتا رہا وہ ماں کی خدمت میں مل گیا۔ آپؒ نے والدہ کی بہت خدمت کی ایک رات کو آپؒ کی والدہ نے پانی مانگا گھر میں پانی موجود نہیں تھا۔ آپؒ دریا سے پانی لینے چلے گئے واپس آئے تو والدہ سو چکی تھیں۔ آپؒ اس خیال سے والدہ کے سرہانے رات بھر پانی پکڑے کھڑے رہے کہ مبادا والدہ جاگ جائیں اور پانی نہ پی سکیں۔ آپؒ کے ہاتھ سخت سردی کی وجہ سے ٹھٹھر گئے لیکن آپؒ اس وقت تک کھڑے رہے جب تک آپؒ کی والدہ کی آنکھ نہ کھلی اور انہوں نے پانی نہ پی لیا۔ آپؒ کی والدہ نے ایک مرتبہ رات کو بایزید کو کہا کہ کمرے کا آدھا دروازہ کھول دو۔ آپؒ ساری رات دروازے کے پاس کھڑے رہے کہ کہیں آدھا دروازہ بند نہ ہو جائے اور والدہ کی حکم عدولی نہ ہو۔ آپؒ نے ماں کی خدمت کر کے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس کے ایک مدت سے متلاشی تھے۔

آپؒ نے خدا سے ایک دعا کی جب تک تو کسی ایسے کامل بندے کو نہیں بھیجے گا جو مجھے میری حقیقت سے آگاہ کرے میں اس وقت تک جنگل میں پڑا رہوں گا۔ آپؒ تین دن اور تین راتیں اسی طرح لیٹے رہے، چوتھے روز ایک شخص اونٹ پر سوار ہو کر آیا۔ آپؒ نے اونٹ کو دیکھا تو اس کے پاؤں زمین میں دھنسنے لگے۔ اس پر سوار نے نہایت غصے کے عالم میں کہا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی کھلی آنکھ کو بند کر لوں اور بند آنکھ کو کھول لوں تا کہ بایزید سمیت پورا بسطام غرق ہو جائے۔ آپؒ حیران ہوئے اور اس شخص سے پوچھا کہ تم کون ہو اُس نے بتلایا کہ جب تم نے کسی کامل شخص کو خدا سے طلب کیا، میں تقریباً یہاں سے تین ہزار میل دُور تھا اور یہاں تیرے پاس آیا ہوں اور تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ اپنے دل کی نگرانی کرو۔

ایک رات حضرت بایزید بسطامیؒ عبادت میں مصروف تھے کہ آپؒ کا حجرہ ایک دم منور ہو گیا۔ آپؒ حیران ہوئے اور فرمایا کہ اگر تو یہ شیطان کی کارستانی ہے تو میں اس کے فریب میں آنے والا نہیں اور اگر یہ نور مقربین کی جانب سے ہے تو میں اس کو اپنی خوش نصیبی خیال کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ آپؒ کو عبادت میں سکون نہیں آ رہا تھا آپؒ گھبرا گئے گھر والوں سے دریافت کیا کہ گھر میں کوئی چیز تو نہیں ہے۔ پتہ چلا ایک انگور کا گچھا موجود ہے۔ آپؒ نے اس کو فوراً خیرات کر دینے کا حکم دیا۔ اس پر اُن کے اوپر انوار کی بارش ہونے لگی اور عبادت کا مزا دوبالا ہو گیا۔ آپؒ ہی کے متعلق ایک غیر مسلم نے کہا تھا کہ اگر اسلام اس کا نام ہے جو بایزید کو حاصل ہے تو اس کی مجھ میں طاقت نہیں اور اگر اسلام وہ ہے جس کے تم سب لوگ نمائندے ہو تو مجھ کو اس پر اعتقاد نہیں ہے۔

کسی شخص نے حضرت بایزیدؒ سے سوال کیا کہ آپ کا مرشد کون ہے؟ آپؒ نے فرمایا ایک بوڑھی عورت کیونکہ میں ایک مرتبہ جنگل میں تھا۔ ایک بڑھیا سر پر آٹا اُٹھائے آ رہی تھی۔ تھکاوٹ اور پیراں سالی کی وجہ سے وہ بوجھ اٹھانے سے قاصر تھی چنانچہ مجھے کہا کہ میں یہ آٹا اس کے گھر پہنچا دوں۔ اسی اثناء میں ایک شیر آ گیا اور بایزید فرماتے ہیں کہ میں نے آٹا شیر کی کمر پر رکھ کر بڑھیا سے کہا کہ آٹا تو یہ شیر تمہارے گھر پہنچا دے گا مگر اس سلسلہ میں لوگوں سے کیا کہیں گی۔ اس پر بڑھیا نے جواب دیا کہ میں کہوں گی کہ آج جنگل میں میری ملاقات ایک خودنما ظالم سے ہوئی۔ بایزید شپٹائے اور کہا کہ نیک

خاتون تُو نے مجھے خودنما ظالم کیوں کہا۔ اس پر بڑھیا نے کہا کہ جب شریعت نے شیر کو مکلف نہیں بنایا تو تم اپنا بوجھ ایک غیر مکلف کی پشت پر کیوں لاد رہے ہو۔ یہ سراسر ظلم ہے تم ایسا کر کے لوگوں پر اپنی کرامت ظاہر کر رہے ہو اور اس کا نام خودنمائی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بڑھیا سے ایسی نصیحتیں اور عبرت حاصل کی اور ایسی باتیں ظاہر کرنے سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔

آپؒ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ آپؒ کے پاس عورتوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ آپؒ نے فرمایا کہ وہ عورتیں نہیں ملائکہ ہوتے ہیں جو میرے ساتھ عبادت کے خواہش مند ہیں۔ میں نے کہا مجھ میں اتنی طاقت کیا کہ میں آپ کے ساتھ ذکر سکوں میرے اعتذار کے باوجود وہ وقتاً فوقتاً میرے پاس جمع ہو جاتے ہیں اور اپنی خواہش دُہراتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آپؒ کے ذکر میں کب طاقت آئے گی۔ آپؒ نے جواب دیا روز جزا اور سزا کے دن جب یہ مرحلہ سر ہو جائے گا اور میں عرش کا طواف کرتا ہوا اللہ اللہ کے نعرے لگا رہا ہوں گا۔

حضرت بوتراب نخشبیؒ نے اپنے ایک مرید کو جو ریاضت کے اعتبار سے بہت زیادہ بلند مرتبہ پر تھا، بایزیدؒ کی صحبت اختیار کرنے کے لیے کہا اور فرمایا کہ جب تک تو بایزیدؒ سے فیض حاصل نہیں کرے گا تیری تکمیل ممکن نہیں۔ اس نے جواباً عرض کیا کہ میں جن مراحل کو سر کر کے خدا شناسی جانتا ہوں بایزیدؒ مجھے کیا بتلا سکیں گے۔ حضرت بوترابؒ نے فرمایا جس پیمانے پر تُو نے خدا کو پہچانا ہے وہ نامکمل ہے۔ حقیقی دیدار بایزیدؒ کی توجہ سے ممکن ہے۔ کیونکہ روز قیامت خداوند کریم ایک تجلی ساری مخلوق پر ڈالے گا اور ایک تجلی صرف حضرت صدیق اکبرؓ پر ڈالے گا۔ یہ سُن کر وہ مرید بوترابؒ کے ساتھ ہو لیے جب بایزیدؒ کے حجرے تک پہنچے تو بایزیدؒ پانی لینے کی غرض سے جنگل کی طرف گئے ہوئے تھے۔ مرید نے بایزیدؒ کو آتے دیکھا نظریں چار ہوئیں اور وہ ہیبت سے اس قدر لرزہ براندام ہوا کہ وہیں گر پڑا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ بوتراب نخشبیؒ نے بایزیدؒ سے کہا حضرت آپؒ نے تو ایک نظر میں اس کا کام تمام کر دیا۔ آپؒ نے فرمایا اس میں کشف کا ایک مقام خالی رہ گیا تھا جو اُس کو اس وقت حاصل ہوا لیکن یہ برداشت نہیں کر سکا۔

حضرت بایزیدؒ چالیس سال مسجد میں مقیم رہے۔ اس مدت میں انہوں نے مسجد کی دیوار کے سوا کسی چیز سے ٹیک نہیں لگائی۔ چالیس سال عام انسانوں جیسی غذا چکھ کر بھی نہیں دیکھی۔ فرماتے تھے کہ میرا رزق اوپر سے آتا تھا اور میں صرف اپنے دل کی نگرانی کرتا رہا۔ اس کے بعد غور کیا تو معلوم ہوا کہ سمت بندگی اور خدائی نظر آئی۔ پھر میں نے مکمل تیس سال خدا کی جستجو میں گزار دیئے۔ پھر خدا کو طالب اور خود کو مطلب پایا، تیس سال سے میری یہ کیفیت رہی کہ جب بھی خدا کا نام لینا چاہتا تو زبان کو دھو لیتا۔

بایزیدؒ پر وجد کی کیفیات طاری ہوتیں اور آپؒ لوگوں میں کھڑے ہو کر ایسی باتیں کرنا شروع کر دیتے جو عام فہم سے بالاتر ہوتی تھیں اور لوگ اُن کو شرک سے تعبیر کرتے اور کفر کے فتویٰ صادر کر دیتے۔

ایک مرتبہ آپؒ نے بسطام شہر میں ایک بہت بڑے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ کو تمام اسرار و رموز اور اپنے نور سے سرفراز فرما کر تمام موجودات سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے خدا کے نور اور اپنے نور کا مشاہدہ کیا لیکن میرا نور تاریک تھا۔ میں کم تر ہوں، وہ مصفا اور مشفا ہے جبکہ میرے اندر کثافت ہے۔ میری عبادات اس کے حکم سے ہیں۔ حقیقی فاعل خدا کی ذات ہے۔ وہ جب کسی کام کرنے کا حکم دے تب

ہی وہ کام ہوسکتا ہے۔ مجھے میری ہستی کے فنا نے بقا عطا فرمائی۔ اس طرح مجھے ازلی علوم سکھائے گئے۔ میری آنکھوں کو نور عطا ہوا۔ مجھے سب کے ساتھ رکھ کر بھی سب سے جدا کردیا گیا۔ مجھے وسائل کے بغیر تمام وسائل حاصل ہوگئے لیکن میں نے ان چیزوں سے قطع نظر ہوکر اپنے وجود کو اس کے وجود کے بغیر ناپسند جانا پھر مجھ کو شریعت اور اعتدال کی حدود سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا میری تمنا برآئی اور میری ذات نقص وعیب سے پاک ہوگئی۔ اس پر لوگوں نے کفر کے فتوے لگا دیئے۔ قاضی حسین عیسٰی نے کفر کا فتویٰ صادر کردیا۔ آپؒ نے اُس کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اے بزرگ تو قاضی نہیں ایک مدرسہ کا ناظم اعلیٰ بھی ہے لیکن تُو نے جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں الفاظ تھے علم نہیں تھا۔ اللہ نے مجھے علم دیا۔ میرے قلب کی تاریکی اور میرے نفس کی کثافت دُور کردی۔ اللہ نے میری حیات اور مجھے اپنے فضل وکرم میں ملبوس کردیا۔ میں نے اللہ سے صرف اللہ کو طلب کیا۔ اس نے مجھ پر اپنی رحمت کی بارش نازل فرمائی اور صاحب کرامت بنادیا۔ اس طرح میں نے حق دیکھ لیا اور پالیا۔ آپؒ کی طرف دیکھ کر قاضی عیسٰی بے ہوش ہوگئے۔ جب ہوش میں آئے تو بایزیدؒ سے فرمایا کہ حسین بن عیسٰی سن میں نے تیس سال وحدانیت کے علوم حاصل کیے۔ تیس سال الوہیت کی فضا میں پرواز کی۔ اس طرح میں چار ہزار مراتب طے کرنے کے بعد اولیاء کے مقام تک پہنچا اور میں نے محسوس کیا کہ ولایت کی انتہاء نبوت کی ابتدا ہے اور نبوت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس کے بعد مجھ کو بہشت وجہنم اور ملائکہ سے مشاہدہ کروایا گیا۔ مجھے انبیاء سے نیاز حاصل ہوا۔ میری روح نبی کریم ﷺ کے اوپر پہنچی۔ چہار سو نور کے حجابات تھے سو میری روح آنحضورؐ کے دیدار سے محروم رہی۔ مجھ پر ہیبت اور غشی طاری ہوگئی۔ ہوش آنے پر میں نے در حضور کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ اس طرح مجھے خدا تک رسائی ہوئی۔ قاضی شہر آپؒ پر کوئی فتویٰ صادر نہ کرسکا۔ اس کی عقل وخرد بیکار ہوگئی۔ آپؒ کی باتیں قاضی کی سمجھ سے بالا تھیں وہ آپؒ سے نظر ملانے کی ہمت خود میں نہیں پارہا تھا لیکن حاکم بالا نے آپؒ پر حد لگانے کا جو حکم دیا تھا۔ وہ ماننا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے عرض کی کہ بایزید آپؒ بسطام چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ آپؒ کی باتیں میرا دل سمجھ رہا ہے لیکن یہ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اس طرح یہ لوگ آپؒ کو بُرا کہنے سے بچ جائیں گے۔ آپؒ نے قاضی کی بات تسلیم کرلی اور فوراً شہر چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا اور فرمانے لگے، اے شہر تُو کتنا اچھا ہے اور میں کتنا بُرا ہوں۔

اسی طرح بایزید وجد کے عالم میں بعض اوقات ایسے کلمات زبان سے ادا کردیتے کہ سُننے والا اُن کے ایمان پر شک کرنے لگ جاتا اور اُن کے مرتد اور کافر ہونے کا خیال کرنے لگ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ کو سات مرتبہ بسطام سے نکالا گیا پھر اُن کی خدارسیدگی کی وجہ سے لوگ اُن کو واپس بسطام لے آتے۔ آپؒ کو اس بات کا شدت سے احساس رہتا کہ میری عبادت میں کہیں خلل نہ پڑے۔ آپؒ اس وجہ سے اپنے گھر کے در و دیوار کے تمام سوراخ بند کردیتے۔ عموماً اپنا سر زانو میں کیے رکھتے۔ ایک مرتبہ آپؒ نے تیس سال تک کسی سے بات نہیں کی۔

ایک دفعہ آپؒ کے منہ سے نکل گیا کہ میں پاک ہوں اور آپؒ اپنی شان کی بڑائی بیان کرنے لگے۔ جب وجد تمام ہوا تو آپؒ نے عقیدت مندوں سے کہا کہ اگر آئندہ میں اس قسم کے کلمات کہوں تو مجھ کو قتل کردینا چنانچہ دوسری مرتبہ جب آپؒ نے اسی قسم کی باتیں کیں تو مجمع آپؒ پر تلواریں لے کر ٹوٹ پڑا

مگر جب لوگ تلواریں چلاتے تو یوں محسوس ہوتا کہ تلواریں پانی پر چل رہی ہیں اور چاروں طرف لاتعداد بایزیدؒ نظر آنے لگے۔ جب لوگ بے بس ہو گئے تو یہ صورت حال خود بخود ختم ہوگئی۔ لوگوں نے آپؒ سے اس بابت دریافت کیا تو آپؒ نے فرمایا کہ یہ سب کرشمہ خدائی ہے۔ اس میں میرا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ آپؒ نے عمر بھر سخت سے سخت مجاہدے کیے۔ ضبطِ نفس کی وہ مثالیں پیش کیں جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آپؒ نے زندگی بھر عبادت و ریاضت میں گزارے۔ لاتعداد مرید ہوئے۔ لیکن کسی سے کچھ طلب نہ کیا۔ جب لوگ آپؒ کی کرامات و عبادات سے متاثر ہونے لگتے تو آپؒ کوئی نہ کوئی ایسا کلمہ کہہ جاتے یا کوئی ایسا عمل سرزد کر دیتے جس سے لوگوں کا اعتقاد متزلزل ہو جاتا۔ آپؒ مطمئن ہو جاتے کہ لوگوں سے آپؒ کی جان کی خلاصی ہوئی۔

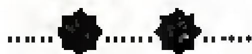
آپؒ نے کرامات دکھانے سے حتی الامکان گریز کیا لیکن بعض اوقات خود بخود کرامات ظاہر ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ بارش نہیں ہوتی تھی۔ چرند و پرند بھوک و پیاس کا شکار تھے۔ لوگ آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپؒ سے دعا کی درخواست کی۔ آپؒ نے خدا سے عرض کیا کہ اے مولا! لوگ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں کہ میں کامل بندہ ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میں گنہگار ہوں۔ اسی لمحہ آسمان پر چھار سو پانی برسنے لگا۔

ایک دفعہ ایک شخص بایزیدؒ کے خلاف تھا، آپؒ کے پاس آیا اور کہا مجھے خدا کے رموز سے آگاہ کیجیے۔ آپؒ نے فرمایا فلاں پہاڑ پر چلے جاؤ وہاں میرا ایک دوست ہے اس کو ملو۔ وہ فوراً اس پہاڑ پر پہنچا۔ وہاں ایک کالا اژدہا بیٹھا تھا وہ اس کی ہیبت سے بیہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو فوراً آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔ آپ نے فرمایا عجیب آدمی ہو۔ خلق کی رموز سے ناواقف ہو اور خالق کی رموز جاننے کی کوشش کرتے ہو۔ وہ شخص بہت نادم ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ شخص مجذوب ہو گیا۔

ایک بار ایک بزرگ ابو سعید شیخ آپؒ کا امتحان لینے کی غرض سے آئے۔ آپؒ نے فرمایا تم اپنے ایک ہم نام ابو سعید راعی کے پاس چلے جاؤ وہ میرا مرید ہے۔ تمہارے سوالوں کا جواب دے دے گا۔ شیخ ابو سعید اپنے ہم نام ابو سعید راعی کے پاس پہنچے۔ ابو سعید راعی نے پوچھا کیا کام ہے۔ آپ نے فرمایا انگور درکار ہیں حالانکہ اس وقت انگور موجود بھی نہ تھے اور نہ ہی انگوروں کا موسم تھا۔ چنانچہ ابو سعید راعی نے چھڑی کے دو ٹکڑے کیے اور ایک ٹکڑا اپنے پاس رکھا اور دوسرا ابو سعید شیخ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دونوں نے اپنے اپنے ہاتھ سے چھڑی کے ٹکڑوں کو زمین میں نصب کر دیا چند لمحوں کے بعد دونوں ٹکڑوں پر انگور کی سبز بیلیں نمودار ہوئیں اور پھر دونوں پر انگور لگ گئے۔ ایک پر سرخ انگور تھے اور دوسرے پر کالے انگور لگ گئے۔ شیخ ابو سعید نے اس کی وجہ پوچھی، آپ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے صدق و یقین کا درجہ حاصل ہے جب کہ تم کو امتحان منظور تھا۔ اس لیے خدا نے ان انگوروں کی رنگت میں قلبی صورتحال نمایاں کردی۔ وہ بڑے نادم ہوئے اور آئندہ اس قسم کی آزمائشوں سے تائب ہو گئے۔

بایزیدؒ اپنی دعاؤں میں ہمیشہ خدا سے دوری اور جدائی کے خاتمہ کا ذکر کرتے تھے۔ آپؒ ہمیشہ بخشش اور استغفار کرتے رہتے تھے۔ آپؒ کو خدا پر کامل بھروسہ تھا۔

۲۶۱ھ شعبان المعظم کی 15 تاریخ کو آپؒ کا وصال ہوا۔ آپؒ نے عمر بھر روزے رکھے۔ قرآن مجید کا لاتعداد مرتبہ مکمل مطالعہ کیا۔ راتوں میں نمازیں اور نوافل پڑھے۔ آپؒ کو سلطان العارفین کا درجہ حاصل ہوا۔



آیئے تقریر کرنا سیکھیں

ڈاکٹر سید نعیم احمد ادیب جعفری

......بھئی ذرا ٹھہریں پہلے تقریر کرنا سیکھیں پھر ہوا میں مکے گھمایئے گا!



فن خطابت کے بنیادی رموز و نکات سے آگاہ کرتی ایک تحریر

فنِ خطابت یا تقریر گوئی دراصل قوت ارادی کے جادو کا واضح اور مدلل ثبوت ہے یہ فن اس قدر مشکل نہیں جتنا اسے سمجھا جاتا رہا ہے، ایک کامیاب مقرر کی کامیابی کا راز نہ صرف اچھی لکھی تقریر کا ترتیب دینا ہے بلکہ اس کا خوبصورت انداز زبان و بیان بھی ہے ......ایک اچھا مقرر بننے کے لیے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے؟ ایک اچھی تقریر کس طرح تیار کی جاتی ہے؟ اور فن تقریر کے بنیادی رموز کون کون سے ہیں؟ ان تمام سوالوں کا جواب آپ کو ذیل کے مختصر سے مضمون میں فراہم کرنے کی کوشش

خوف کا کمال

ایک صاحب موت سے بہت ڈرتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے گھر میں اس لفظ کا استعمال بالکل بند کرا دیا تھا۔ اگر محلے میں کوئی مر جاتا تو کہا جاتا کہ وہ پیدا ہو گیا ہے...... ایک روز ان کے گھر مہمانوں کے ساتھ باتیں ہو رہی تھیں کہ گھریلو ملازم روتا ہوا آیا...... مالک نے رونے کی وجہ پوچھی تو ملازم کہنے لگا۔ "میرے ابا پیدا ہو گئے ہیں۔" مہمان نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اور تمہاری ماں؟" نوکر نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ تو تین سال پہلے ہی پیدا ہو گئی تھیں۔" مہمان نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پھر سوال کیا۔ "پھر تم کب پیدا ہوئے تھے؟" نوکر نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ "صاحب! اگر یہی حالت رہی تو میں بھی کسی روز پیدا ہو جاؤں گا۔"

(فاروق رشید۔ لاہور)

کی گئی ہے۔

فن خطابت یا تقریر گوئی کی تعریف:۔

کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات، احساسات کو مناسب و احسن انداز میں عوام الناس کو پیش کرنا ہی "فنِ خطابت" ہے۔ قوت قرطاس و قلم کا کوئی بھی منکر نہیں مگر ایک اور طاقت بہت عظیم قوت ہے اور وہ ہے "زبان کے بولنے کی صلاحیت" بلاشبہ یہ ایک ناقابل شکست شے ہے۔ خطابت دراصل سامعین کو اپنا ہم نوا بنا لینے کا فن ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے "دنیا پر جس فن کی حکمرانی ہے وہ فنِ خطابت ہے"۔

فن تقریر کا مقصد واھمیت:۔

تقریر سننے کا سب سے بڑا مقصد اپنی معلومات میں اضافہ کرنا اور علم کو بڑھانا ہے۔ لوگوں کی اکثریت تفریحاً تقریر سننے کے لیے نہیں جاتی اور وقت گزاری بھی تقریر سننے کا سبب نہیں اگر آپ چاہیں تو گھر بیٹھے یا کتب خانوں میں جا کر ہزاروں کتابوں کے مطالعے سے اپنے علم' لیاقت' قابلیت کو بڑھا سکتے ہیں۔ مگر وہ علم جو آپ کو طویل المدتی مطالعے کے بعد حاصل ہوگا یقیناً اس مقرر کی تقریر سے بہتر نہیں جو کم وقت میں آپ کو مطلوبہ معلومات فراہم کر دے۔

فنِ خطابت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا میں وہ مذاہب زیادہ تیزی سے پھیلے جن کے پاس اچھے مقررین کی تعداد کافی تھی۔ اسلام میں تقریر کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ مختلف مواقع پر حضورﷺ نے خطبے دیئے اور اسلام کی دعوت کو پھیلایا اسی طرح آپﷺ نے اسلام کی تبلیغ کے لیے بھی مختلف وفود مختلف علاقوں میں بھیجے جو وہاں جا کر اسلام کے احکامات کے متعلق تقاریر کرتے تھے، خطبہ حجتہ الوداع اس کی شاندار مثال ہے گویا اسلام بھی اپنے پیروکاروں کو "فنِ تقریر" سے قریب دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

ملکوں کی سیاسی اٹھا پٹخ' تعلیم، فوجی فتوحات الغرض تمام زندگی کے شعبوں میں تقریر کی اہمیت' مقصد و مقام واضح نظر آتا ہے۔

فن خطابت اور منصوبہ بندی:۔

فنِ تقریر گوئی میں منصوبہ بندی بے حد ضروری ہے چند بنیادی امور ہیں کہ جن کا اگر خیال نہ رکھا جائے تو آپ کی تقریر ہرگز کامیابی حاصل نہ کر سکے گی۔ تقریر کرتے وقت بالخصوص ان باتوں کا دھیان رکھنا چاہیے۔

☆ چیخ چیخ کر بولنے سے احتراز کریں۔

☆ الفاظ اور جملے آہستگی کے ساتھ ادا

شائع ہو گیا ہے

سیارہ ڈائجسٹ کے لازوال اسلامی نمبروں میں ایک اور اضافہ



قیمت 175 روپے

- ان تمام واقعات کا جدید علم وتحقیق کی روشنی میں تفصیلی ذکر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور اس کی امت کو بتانا ضروری سمجھے
- انبیائے کرام کی مقدس اور پاکیزہ زندگیوں سے وابستہ واقعات
- قصے ان قوموں کے جن پر انبیائے کرام کی نافرمانی، اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی اور سرکشی کے باعث عذاب الٰہی نازل ہوا

عمدہ ترتیب، دلچسپ انداز بیاں اور پرکشش رنگین ٹائٹل

500 صفحات پر مشتمل یہ عظیم الشان نمبر جلد پیش کیا جائے گا

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

کریں، تیز تیز نہ بولیں ☆ کوشش کیجیے کہ ہر لفظ ہر جملہ علیحدہ ادا ہو۔

☆ ذومعنی اور بے معنی باتوں سے اجتناب برتیں۔

☆ دوران تقریر لمبے لمبے واقعات اور قصے کہانیوں سے گریز کریں ☆ تقریر میں وقفہ کی اہمیت بہت ہے۔ ماہر و باشعور مقررین عموماً کوئی خاص بات کہنے سے پہلے یا بعد میں تھوڑا سا وقفہ دے دیتے ہیں۔ اس طرح سے نہ صرف وہ سامعین کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب رہتے ہیں بلکہ ان کی تقاریر بھی باأثر ہو جاتی ہیں۔

☆ تقریر کرنے کے لیے اپنا ایک الگ انداز اختیار کیجیے اپنی تقریر میں جدت و نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کیجیے یہ نیا پن آپ کو ممتاز مقررین کی صف میں لاکھڑا کردیگا۔

فن تقریر اور مزاح:۔

بعض مقررین اپنی تقاریر میں شگفتگی اور مزاح کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، ایسے لوگ لاکھ اپنی تقریر میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کریں مگر انہیں بغیر مزاح کے بذات خود اپنی تقریر غیر جانبداری محسوس ہوگی۔

انگلستان کے ایک سابق وزیر اعظم اور عالمی شہرت یافتہ مقرر" ڈزرائیلی" نے ایک بار کہا تھا "اگر تقریر میں مزاح اور ظرافت نہ ہو تو ایسی تقریر مقرر کے مستقبل اور مقاصد کو دھندلا کر کے رکھ دیتی ہے"۔ کوئی پر مزاح جملہ، شگفتہ چٹکلہ یا کوئی مسکراتا سا واقعہ اپنی تقریر میں ضرور شامل کیجیے۔

تقریر کیسے تیار کی جائے؟

اب آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک اچھی اور موثر تقریر کیسے تیار کی جائے؟ سب سے پہلے تو جس موضوع پر تقریر کرنا ہو اس موضوع سے متعلقہ کتب اور رسائل و جرائد جمع کیجیے اچھی کتابیں، کتب

وسیع و جدید ذرائع ابلاغ آپ کے لیے ایک اچھی تقریر کی تیاری میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

"عصر حاضر کی مشہور کتاب" دل کی دھڑکن پاکستان" کے خالق ممتاز شاعر اور قائداعظمؒ کے تحریکی ساتھیوں میں سے ایک سید یاور حسین کیف بنارسی اپنے ابتدائی دور طالبعلمی میں تقریر کی تیاری کس طرح سے کرتے تھے اس کا ذکر وہ اپنی کتاب مذکورہ بالا میں کچھ یوں کرتے نظر آتے ہیں" صبح ہوتے ہی میں اپنے شہر بنارس کے نزدیک واقع ایک شفاف تالاب پر چلا جایا کرتا اور تالاب کی لہروں کو سامعین تصور کر کے وہاں دھواں دھار انداز میں تقریر کرنے لگتا۔ روز کے اس عمل اور مشق کا نتیجہ یہ نکلا مجھے فن زبان وبیاں (فن تقریر) پر قدرت حاصل ہوگئی اور ایک دن وہ بھی آیا کہ میں نے کل بنارس تقریری مقابلے میں اوّل انعام حاصل کیا۔ یہ سب خدا کی دین اور میری متواتر مشق کا نتیجہ تھا"۔

چند مشہور مقررین و خطیب:۔

بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح تو ایک عمدہ مقرر تھے ہی آپ کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، خان لیاقت علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، بی اماں، فاطمہ جناح، حضرت شاہ ولی اللہ، جسٹس سید امیر علی، سر سید احمد خان، مسز سروجنی نائیڈو، اندرا گاندھی، کیف بنارسی، مولانا احمد رضا خان بریلوی، مفتی شفیع اوکاڑوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ڈزرائیلی، جارج واشنگٹن، ابراہام لنکن، علامہ عرفان حیدر عابدی، رشید ترابی، راجہ صاحب محمود آبادی وغیرہ کا شمار اعلیٰ پائے کے مقرروں میں کیا جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس مختصر سے مضمون کے مطالعے کے بعد آپ اپنی تقریر میں جدت کے ساتھ ساتھ مزید نکھار و اثر پیدا کر سکیں گے۔

ساگون دیوتا کا مندر

ابرار مجیب

اس کے ایک ہاتھ میں زنگ آلود تلوار جیسی کوئی شے تھی اور دوسرے ہاتھ میں...... دوسرے ہاتھ میں۔ اُف یہ تو اشوک مجمدار کا کٹا ہوا سر تھا۔ مجمدار کا دھڑ وہیں اس کے قدموں تلے پڑا ہوا تھا اور کٹی ہوئی گردن سے خون نکل کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ کیرتی کے حلق سے مسلسل قہقہے اور چیخنے کی غیر انسانی آوازیں نکل رہی تھیں۔

آثار قدیمہ کی تحقیقاتی ٹیم کے ساتھ پیش آئے حیرت انگیز اور پُراسرار واقعات

جب ہم اُس علاقے میں پہنچے تو اندازہ ہوا کہ یہ علاقہ شہری علاقے سے کم از کم سو، سوا سو کیلو میٹر دور ہے اور آس پاس کوئی انسانی آبادی بھی نہیں ہے۔ چند ایک قبائلی گاؤں یہاں سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں ایمرجنسی کی صورت میں کسی فوری مدد کے امکان کو خارج کر دینا چاہیے تھا۔ آرکیالوجی سروے آف انڈیا کے زیرِ اہتمام ہمیں اس علاقے کا تفصیلی جائزہ لینا تھا، کھدائی



کرنی تھی اور ایک رپورٹ تیار کرنی تھی۔ ابتدائی جائزے کی رپورٹ ایک کمیٹی پیش کر چکی تھی اور اس کے مطابق اس علاقے میں پانچ ہزار سال پرانی کسی تہذیب کے آثار موجود تھے۔ یہ نتیجہ یہاں سے ملنے والی بعض چیزوں کی کاربن ڈیٹنگ رپورٹ سے نکالا گیا تھا، ان چیزوں میں ایک دیوتا نما شخص کی مورتی بھی تھی جس کے سر پر سینگ تھے اور اس کے اطراف جنگلی جانور کھڑے تھے۔ ایک سیاہ رنگ سے رنگا ہوا برہنہ عورت کا مجسمہ تھا جو شاید اس عہد کی کوئی دیوی رہی ہو۔ کچھ انسانی کھوپڑیاں، دانت اور شکستہ ڈھانچے بھی پائے گئے تھے۔ یہ چیزیں اس وقت برآمد ہوئی تھیں جب یہاں کرم ناسا ندی پر ایک پل بنانے کے لئے کھدائی کا کام چل رہا تھا۔ ایک جگہ تو انسانی ڈھانچوں کا ڈھیر برآمد ہوا تھا، جیسے بہت سارے لوگوں کو ایک ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کردیا گیا ہو۔ چوں کہ ان ڈھانچوں کا ابھی تجزیہ نہیں کیا گیا تھا اس لئے یہ کہنا مشکل تھا کہ اتنے سارے لوگوں کو کسی گروہ نے قتل کرکے ایک ساتھ گڑھے میں دبا دیا تھا یا یہ لوگ کسی وبائی مرض کا شکار ہوئے تھے اور لوگوں نے انہیں ایک ساتھ مٹی کے اندر دفن کر دیا تھا۔ بہرحال اس علاقے کا تفصیل سے جائزہ لینے کے لئے یہاں کھدائی کا پروگرام بنایا گیا تھا اور ہم لوگوں کی ایک ٹیم تشکیل دی گئی تھی۔

بیس پچیس مزدوروں کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں جو پاس کے قبائلی گاؤں کے باشندے تھے۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی ٹیم میں میرے علاوہ ماہر آثار قدیمہ ڈی ڈی پاٹھک، مس کرتی سبرا نیم اور اشوک مجمدار تھے۔ کھدائی کے ماہرین میں رحمت کریم پاشا، انوبھو سنہا تھے۔ علم کیمیا کے ماہر نند کشور سہائے اور ان کی اسسٹنٹ جیوتی راجپوت تھیں۔ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف عمر رسیدہ بدھو منجھی کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں جو منجھی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ منجھی قبیلہ اس علاقے کا قدیم ترین قبیلہ مانا جاتا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ بدھو منجھی بعض قدیم تصویری تحریروں کو پڑھ لیتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ انجینئر، ٹیکنیشین، تیراک اور سیکورٹی کے لوگ بھی تھے۔ ہم لوگ یہاں ابتدائی جائزے کے لئے آئے تھے جس میں تجسس کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ فی الحال تمام لوگ شہر کے ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ یہاں مستقل قیام کے لئے دوسرے دن سے انتظام کیا جانا تھا اور اس کے لئے ایک کنٹریکٹر سے معاہدہ کرلیا گیا تھا۔

ابھی سورج غروب ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ سرسری طور پر دیکھیں تو یہ علاقہ چھدرے جنگل اور بھوری پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا، جو نہ جانے کہاں ختم ہوتا تھا۔ ایک طرف کرم ناسا ندی بہہ رہی تھی جس پر ہمارے قریب ہی ایک پل اپنی ادھوری حالت میں موجود تھا۔ یہ پل اس لئے بنایا جارہا تھا کہ شہر کے کارخانوں میں تیار شدہ مال کو بندرگاہ تک بھیجا جاسکے، اس سے پہلے مال بھیجنے کے لئے تقریباً" چار سو کلومیٹر دور ایک دوسرے شہر کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ کافی دنوں سے پل بنانے کا کام روک دیا گیا تھا، اس کی وجہ پوری طرح معلوم نہیں ہوسکی، جتنے منہ اتنی باتیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ ٹھیکیدار اور مزدوروں کے درمیان "معتنالے" کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔ بدھو منجھی جو ہمارا گائیڈ تھا اس کا کہنا کچھ اور ہی تھا۔ اس کے مطابق پل کے دوسرے کنارے پر دیوتا ساگون کا مندر ملا تھا جس کی وجہ سے قبائلی مزدوروں نے کھدائی کرکے وہاں ستون گاڑنے سے انکار کردیا، تب سے معاملہ رکا ہوا ہے۔ ہم نے دوسرے کنارے کی طرف دیکھا لیکن مندر کے آثار نظر نہیں آئے۔

مندر شاید اس بڑے گڑھے کے اندر ہو جو دور ہی سے نظر آرہا تھا۔ بہرحال اس پل کے علاوہ یہاں

ایسی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی جسے انسانی کاوشوں کا نتیجہ کہا جاسکے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑا عجب لگا کہ ہمارے قدموں کے نیچے جو مٹی تھی وہ سرخی مائل تھی۔ نند کشور سہائے جو علم کیمیا کے ماہر تھے ان کا خیال تھا کہ اس مٹی میں آئرن آکسائیڈ کی آمیزش ہوسکتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں زمین کے اندر کچا لوہا موجود ہوسکتا ہے۔

ہم لوگ اس بات پر متفکر تھے کہ شہر سے اتنی دُور اس ویرانے میں ناگہانی افتاد کی صورت فوری مدد کا امکان بالکل نہیں ہے۔ ویسے کھانے پینے کا سامان، فریج اور دوسرے لوازمات کا انتظام کیا جاچکا تھا۔ ہیوی جنریٹر بھی لایا جارہا تھا تاکہ اس سے بجلی پیدا کی جاسکے اور اس کے لئے ڈیزل کا بھی مناسب ذخیرہ مہیا کیا جارہا تھا۔

''یہ پورا علاقہ عجیب وغریب خاموشی سے گھرا محسوس ہوتا ہے۔'' جیوتی راجپوت دھیرے سے بولی جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔

''ہاں بڑی عجیب بات ہے، جنگل ہونے کے باوجود جانور اور پرندوں کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ارے ایسی بات نہیں ہے، ہم لوگ جنگل سے دُوری پر ہیں، ہلکی پھلکی آوازیں تو آہی رہی ہیں۔'' ڈی ڈی پاٹھک ہنستے ہوئے بولے۔

''کل شام تک چھولداریاں تیار ہوجائیں گی اور سارا سامان بھی آجائے گا، مزدوروں کا ٹھیکیدار بھی کل شام ہی کو مزدور لے کر آنے والا ہے۔'' ایک انجینئر جو پروگرام کوآرڈینیٹر تھا ہمیں اطلاع دیتے ہوئے بولا۔

''میں سمجھتا ہوں ہمیں اس حصے سے کھدائی کا کام شروع کرنا چاہیے جہاں سینگ والے دیوتا کی مورتی برآمد ہوئی تھی اور اس کے قریب ہی ایک بڑے گڑھے میں بہت سارے لوگوں کے ڈھانچے ملے تھے۔ وہ دیکھئے وہاں زمین مسطح بھی ہے اور کام کرنے میں آسانی بھی ہوگی۔'' میں نے مشورہ دیا۔

انو بھو سنہا کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ رجت پاشا بول پڑے۔ ''مشورہ تو آپ کا درست ہے لیکن ڈھلوان علاقے میں اگر کھدائی شروع کی جائے تو ہمیں نچلی تہوں میں موجود قدیم آثار تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔''

''اس بات پر ہوٹل میں بحث کرلیں گے۔'' انو بھو سنہا نے کہا۔

افق پر شام کی لالی نمودار ہورہی تھی اور سورج چھدرے جنگل کی پشت پر غروب ہوچکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پیڑوں میں آگ لگ گئی ہے اور بھوری پہاڑیاں شعلے اگل رہی ہیں۔ کرم ناسا ندی کا پانی بھی سرخ ہوچکا تھا۔ ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی طرف چل دیے۔ راستے میں قبیلائی گاؤں کے بعض گھروں سے دھواں اٹھتا نظر آیا، شاید چولہے جلائے جارہے تھے۔ گاؤں کے یہ گھر کچی مٹی سے بنائے گئے تھے اور دیواروں کو سرخ اور سفید رنگوں سے لیپا گیا تھا۔ ان دیواروں پر طرح طرح کی تصویریں بنائی گئی تھیں، جانور اور انسانی جسم کو ایک ساتھ ملا دیا گیا تھا، اسی طرح پرندے اور چوپائے ایک وجود کی صورت موجود تھے۔ بعض حشرات الارض کی بھی تصویریں تھیں۔ ایک دلچسپ تصویر شیر کا سر اور ایک پرندے کے جسم کو ملا کر بنائی گئی تھی۔ گو کہ قبیلائی گاؤں کے سارے گھر کچی مٹی کے بنے نظر آرہے تھے لیکن گاؤں کے درمیان مندر پکی اینٹوں سے تیار کیے گئے تھے۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی۔ ہم سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ کمرے میں پہنچ کر میں ابھی کپڑے تبدیل کر ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف کوئی آواز نہیں آئی، ڈیڈ ٹون بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر تک میں ہاتھ میں ریسیور لئے ہیلو ہیلو کرتا رہا، پھر جھنجلا کر اسے کریڈل پر ڈال

دیا۔ میں نہا کر فریش ہونا چاہتا تھا۔ ابھی میں باتھ روم کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ دوبارہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اس بار غصے میں لپک کر فون اٹھایا اور زور سے بولا۔ ''ہیلو۔''

''میں ہوں کیرتی سبرانیم، کیا ہوا اتنی زور سے کیوں چلا رہے ہیں؟''

''نہیں، کوئی بات نہیں۔ اچھا بولو کوئی خاص بات؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے رنگ کیا تھا مجھے؟'' کرتی نے پوچھا۔

''نہیں تو، بلکہ ابھی ابھی کسی نے مجھے رنگ کیا تھا، جب ریسیور اٹھایا تو کسی نے جواب نہیں دیا، یہی وجہ تھی کہ میں جھنجھلایا ہوا تھا۔''

''ارے یہی بات میرے ساتھ بھی ہوئی ہے، اور جب میں نے استقبالیہ سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کال آپ کے کمرے سے آئی تھی۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ میں نے فون کیا ہی نہیں ہے تمہیں۔'' میں حیرت سے بولا۔

''پتہ نہیں کیا چکر ہے۔'' کیرتی سبرانیم حیرت سے بولی اور ریسیور رکھ دیا۔

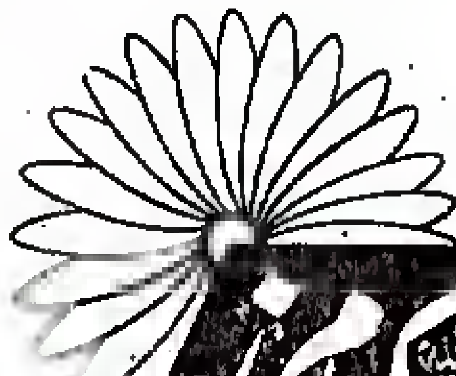
میں نے جیسے ہی ریسیور رکھا پھر فون کی گھنٹی بجی، اس بار رحمت پاشا تھا اور وہ بھی یہی پوچھ رہا تھا کہ میں نے اسے فون کیوں کیا تھا۔ اب تو ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں فون رکھتا اور کسی اور ساتھی کی کال آجاتی، سب یہی پوچھ رہے تھے کہ میں نے انہیں کال کیا تھا۔ میرا تو دماغ ہی ماؤف ہوگیا۔ نہانے کی بجائے میں سیدھا استقبالیہ پر گیا اور سارا ماجرا بیان کرکے پوچھا کہ ایسا کیوں ہورہا ہے۔ استقبالیہ پر موجود خاتون بھی حیران تھی۔ اس نے کہا کہ ذرا ٹھہریں شاید فون لائنز میں کوئی مسئلہ ہو، ویسے یہ سچ ہے کہ تمام لوگوں کے کمرے میں آپ ہی کے نمبر سے فون کیا گیا ہے اور یہ کمپیوٹر میں درج بھی ہے۔ میں

کمرے میں واپس آکر غسل خانہ میں چلا گیا، نہا کر واپس آیا اور کافی کا آرڈر دے کر بستر پر لیٹ گیا۔ رات سکون سے گزری ایک بار بھی فون کی گھنٹی نہیں بجی، میں نے سوچا شاید لائنز میں کوئی خرابی واقع ہوئی ہوگی جسے ہوٹل والوں نے ٹھیک کرلیا ہوگا۔

صبح ہم لوگ لابی میں یکجا ہوئے اور اس علاقے کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ شام چار بجے تک ہمیں پہنچنا تھا۔ اس وقت تک تمام تیاریاں مکمل ہوجانے کا امکان تھا۔ اس سے پہلے راستے میں بڑو مانجھی کو اس کے گاؤں سے لینے کی ذمہ داری میری تھی۔ رات کے فون والے واقعے پر سب حیران تھے بلکہ انو بھو نے استقبالیہ خاتون سے جا کر پوچھا بھی، اس نے بتایا کہ لائنیں چیک کی گئی تھیں، کہیں کچھ نہیں ملا بس ایک جگہ ایک وائر کا انسولیشن کٹا ہوا تھا جسے بدل دیا گیا ہے، شاید اسی کی وجہ سے ایسا ہوا ہو، بہرحال کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملا۔

جب ہم لوگ بڑو مانجھی کے گاؤں پہنچے تو ایک عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑو مانجھی کے گھر کے سامنے گاؤں والوں کی ایک بھیڑ جمع تھی۔ قریب پہنچ کر جو منظر نظر آیا اسے دیکھ کر متلی سی ہونے لگی۔ بڑو مانجھی ایک چارپائی پر بیٹھا، دونوں ہاتھ سے سر پکڑے رو رہا تھا اور سامنے ہی زمین پر ایک بکری پڑی ہوئی تھی جس کی آنتیں باہر تھیں اور جس کا نرخرہ ادھڑا ہوا تھا۔ کسی قبائلی کے لئے اس کی بکری کی کتنی اہمیت ہے یہ میں سمجھ سکتا تھا۔ بڑو مانجھی کو ہم لوگوں نے دلاسہ دیا اور پوچھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ اس نے بتایا کہ کچھ دیر پہلے جب وہ فطری ضرورت کے تحت میدان جا رہا تھا تو بنسواڑی (بانس کے پیڑوں کا جھرمٹ) میں اسے اپنی بکری اس حالت میں ملی۔ ہم لوگوں نے کہا کہ شاید کسی جنگلی جانور نے بکری کا یہ حشر کیا ہو لیکن بڑو مانجھی بڑے یقین سے بولا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہی

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور ایمان افروز فخریہ پیشکش



قیمت ۱۲۵ روپے

۴۰ درخشندہ ستاروں کے روح پرور اور بصیرت افروز تذکروں پر مشتمل ——

- جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جلوۂ یار کا بے نقاب مشاہدہ کرکے شرف صحابیت پایا
- جنہوں نے منبع رشد و ہدایت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست کسب فیض کیا۔
- جنہوں نے صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے رموز و اسرار سمجھے۔
- جنہوں نے اپنے خون جگر سے چمنستان اسلام کی آبیاری کی۔
- جنہوں نے اپنے ارفع سیرت و کردار سے چہرۂ انسانیت کی سیاہیاں دھو ڈالیں۔
- جنہوں نے انتھک مخلصانہ جدوجہد سے جنت نظیر معاشرہ کی صورت گری کی۔
- جنہوں نے فیصلہ کن اور غیر مصالحانہ ٹکر لے کر باطل کو تہہ و بالا کر دیا۔

۵۰۰ صفحات پر مشتمل سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب سرورق

شائع ہو گیا ہے

گاؤں کے اطراف کبھی جنگلی درندے دیکھے گئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جنگل یہاں سے تین کلومیٹر دور ہے اور اس جنگل میں بھی کسی درندے کی موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں سنا گیا ہے۔ بڈو ماجھی کی باتیں سن کر ہمیں حیرت بھی ہوئی اور ایک قسم کا خوف بھی محسوس ہوا۔ اسی درمیان ایک غلغلہ بلند ہوا اور ایک وحشت زدہ قبائلی بھیڑ کو چیرتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر میں لگ بھگ ڈر گیا۔ اس کی آنکھیں ٹھہری ہوئی تھیں اور وہ بالکل پلکیں نہیں جھپکا رہا تھا۔ آنکھوں کی سفیدی اتنی زیادہ سفید تھی کہ اس کی پتلیاں بھی سفیدی مائل نظر آرہی تھیں۔ وہ میرے سامنے کھڑا ہو کر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا اور عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہوئے شہر کی طرف جانے والی سڑک کی طرف مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”بن جا، بن جا، مارو دیبو، بن جا، بن جا۔۔۔۔“

وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا۔

خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی، حالانکہ میں پوری طرح سے سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ دوسرے ساتھی بھی سراسیمہ نظر آرہے تھے۔ دفعتاً بڈو ماجھی تیزی سے اٹھا، اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنی جھونپڑی کے اندر لے گیا، وہاں کسی کونے سے اس نے ایک چوکور چڑے کی تعویذ نما شئے نکالی اور اسے میرے گلے میں ڈال دیا، ایسے ہی بہت ساری تعویذ لے کر وہ باہر آیا اور ایک ایک کرکے تمام ساتھیوں کو پہنانے لگا۔ سفید آنکھوں والا وحشت زدہ شخص یہ دیکھ کر کانپنے لگا اور ایک چیخ مار کر ناک کی سیدھ میں دوڑتا چلا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے بڈو ماجھی؟“ میں نے پوچھا۔

”اس پر ماتا دیوی آیا ہوا ہے صاحب اور ماتا دیوی ابھی بہت غصے میں ہے۔ ہمارا بکری بھی ماتا دیوی کا بھینٹ چڑھ گیا۔“

میں اپنی ہنسی کو روک نہیں سکا۔ ”اچھا دیکھو، تم جلدی سے تیار ہو جاؤ، ہمیں ابھی چلنا ہے وہاں پر۔ آج ہی سے کام شروع ہوگا۔“ میں نے بڈو ماجھی سے کہا۔ اسے یہ بھی دلاسہ دیا کہ اسے تین چار بکریاں خرید کر دے دی جائیں گی وہ فکر نہ کرے۔

بڈو ماجھی نے پاس کھڑے ایک نوجوان قبائلی سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلایا۔ شاید اس نے اسے تاکید کی تھی کہ بکری کو گڑھے میں گاڑ دے۔ بڈو ماجھی کچھ دیر تک انگلیوں پر کچھ گنتا رہا پھر بڑبڑایا۔ ”اماوسیہ۔ کالا رات۔“ ایک بار پھر وہ جھونپڑی کے اندر گیا اور جب باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں چوکور چڑے والے بہت سے تعویز تھے۔ خود اس کے گلے میں ایک تعویذ پہلے سے موجود تھا۔ وہ ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور ہم تیزی کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنے لگے۔

شام کے لگ بھگ پانچ بج چکے تھے جب ہم اس علاقے میں پہنچے جہاں قدیم تہذیب کی بازیافت کے لئے کھدائی کا کام کرنا تھا۔ بہت سارے ٹینٹ لگائے جا چکے تھے۔ جنریٹر بھی آچکا تھا۔ ٹھیکیدار نے بتایا پروگرام کے مطابق مزدور کل صبح حاضر ہو جائیں گے۔ رات میں ہمیں یہ طے کرنا تھا کہ کھدائی کا کام کہاں سے شروع کیا جائے، وہاں سے جہاں ایک اجتماعی قبر ملی تھی یا اس ڈھلوان جگہ سے، جہاں پرانی تہوں سے تہذیب کے قدیم آثار برآمد ہونے کا امکان تھا۔ یہ فیصلہ ان نقشوں کو پڑھ کر ہی کیا جا سکتا تھا جو ہم ساتھ لائے تھے اور جسے پچھلی ٹیم نے تیار کیا تھا۔ سبھی لوگوں کو ٹینٹ دے دیا گیا تھا جس میں بنیادی ضرورت کا سامان بھی موجود تھا۔ ایک ٹینٹ میں کیمیکل لیب بھی تیار کیا گیا تھا تاکہ چیزوں کا تجزیہ کرکے ان کی قدامت اور فطرت کے متعلق

معلوم کیا جاسکے۔ ایک اسٹور یج بھی بنایا گیا تھا جہاں چیزوں کو محفوظ کیا جاسکے۔ بڈو مانجھی کو بھی ایک ٹیکنیشین کے ساتھ چھولداری دی گئی تھی۔ تمام لوگ اپنی چھولداریوں کا معائنہ کر کے مطمئن تھے۔ ایک طرف رات کے کھانے کا انتظام ہو رہا تھا اور دوسری طرف ایک میز کے گرد ہم تمام لوگ بیٹھے نقشے دیکھ رہے تھے اور کل کے لائحہ عمل پر گفتگو کر رہے تھے۔

"اجتماعی قبر کی بیشتر کھدائی ہو چکی ہے اور وہاں سے کچھ اور برآمد ہونے کا امکان نہیں ہے، میں رحمت پاشا کی اس بات سے متفق ہوں کہ اس جگہ ذرا ڈھلوان حصے سے کھدائی کا کام شروع کیا جائے، یہی وہ جگہ ہے جہاں سے سینگوں والے دیوتا کی مورتی برآمد ہوئی تھی۔" انو بھوسنہا نے نقشے پر ایک جگہ ہاتھ رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"جی لیکن اس کے لیے اسکائی فولڈنگ کی ضرورت ہوگی، خیر یہ کوئی مسئلہ نہیں لیکن اس میں وقت لگ جائے گا۔" انجینئرنگ کو آرڈی نیٹر نے کہا۔

"یار میں نہ جانے کتنے علاقوں میں گیا ہوں، گھومتا رہا ہوں لیکن یہ علاقہ پتہ نہیں کیوں کچھ عجیب اور پراسرار لگ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے ہمارے بنگال کے کالے جادو کا اثر ہے یہاں پر۔" اشوک مجمدار بظاہر ہنستے ہوئے بولا لیکن اس کا چہرہ اس کی ہنسی کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

"تم بنگالی لوگ یہ جادو وادو کے چکر میں بہت ہوتا ہے۔" ڈی ڈی پاٹھک نے قہقہہ لگایا۔" ارے یار کام کی بات کرو۔"

تھوڑی دوری پر میں نے دیکھا بڈو مانجھی آسمان کی طرف منہ اٹھائے کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ مجھے لگا وہ کوئی قبائلی منتر کا جاپ کر رہا ہوگا۔ میں نے اشارے سے دوسرے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ جیوتی راجپوت سنجیدہ ہوگئی اور اس نے بڈو مانجھی کو آواز دے کر بلایا۔

"کیا پڑھ رہے ہو۔" جیوتی نے پوچھا۔

"ماتا دیوی کا منتر ہے میم صاب۔"

"اچھا، اس سے کیا ہوگا؟" نند کشور نے ہنس کر پوچھا۔

"ماتا دیوی سب کی رکشا کرے گا۔"

"کس سے رکشا کرے گا؟" مس کیرتی سبرا نیم نے پوچھا۔

"جناور سے، سینگ والا دیوتا سے۔ یہ سینگ والا دیوتا ہر سے ایک بلی مانگتا ہے۔" بڈو مانجھی خوف زدہ جھرجھری لے کر بولا۔

تمام لوگ ہنسنے لگے لیکن نجانے کیوں میری نظر کے سامنے اچانک اس وحشت زدہ آدمی کی تصویر ابھر آئی جو بڈو مانجھی کے گاؤں میں اپنی سفید آنکھوں سے ہم سبھوں کو گھور رہا تھا۔ بڈو مانجھی کے جانے کے بعد ہم لوگ ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ڈھلوان حصے سے کھدائی کا کام شروع کیا جائے، رحمت پاشا اور انو بھوسنہا اس سلسلے میں اپنے تجربات کام میں لائیں گے تاکہ چیزیں بحفاظت کسی ٹوٹ پھوٹ کے بغیر نکالی جاسکیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔

پتہ نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ابھی میں اس بات پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک عجیب و غریب آواز سنائی دی، یہ کوئی انسانی آواز ہرگز نہیں تھی اور نہ ہی کسی جانور کی آواز۔ تو پھر یہ کس کی آواز تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی کھردری سطح پر کچھ گھسا جا رہا ہو۔ اچانک آواز ختم ہوگئی۔ میں نے خیمے کے اندر چاروں طرف نظر دوڑائی، نیم تاریکی تھی لیکن چیزیں نظر آ رہی تھیں۔

سامنے میز پر نقشے پڑے تھے، دوسری چیزیں بھی

اپنی جگہ تھیں۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے کسی چیز کے گھسنے کا اندازہ قائم کیا جاسکتا۔ میں بستر پر ساکت لیٹا رہا۔ ہر طرف سناٹا طاری ہوچکا تھا۔ گھسنے کی آواز جو ایک بار بند ہوئی وہ اب تک بند تھی۔ مجھے صرف اپنی سانسیں یا جھینگروں کی پراسرار آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔ دفعتاً ایسا محسوس ہوا جیسے دُور ایک ساتھ بہت سارے گھوڑوں کی ٹاپیں اُبھر رہی ہوں۔

ہاتھ میں ٹارچ لے کر میں باہر نکل آیا۔ سامنے دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا، پھر میری نظر اس طرف اُٹھ گئی جہاں اجتماعی قبر بنی تھی، اس سے کافی فاصلے پر تیز رفتار گھوڑوں پر سوار پرچھائیاں تیزی سے بڑھتی نظر آرہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کیونکہ وہ سارے سوار گھوڑوں سمیت اجتماعی قبر پر پہنچ کر غائب ہوگئے۔ میں جیسے ہی پلٹا چیخ پڑا سامنے کوئی کھڑا تھا۔

"بابو، بڑو مانجھی۔"

جب میں نے غور سے دیکھا تو وہ کوئی اور نہیں بڑو مانجھی تھا۔ میری جان میں جان آئی۔ "تم اتنی رات کو یہاں کیا کررہے ہو۔" میرے لہجے میں سختی تھی۔

"صاب، سینگ والا دیوتا آئے گا۔"

"کب؟"

"بہت جلدی۔" بڑو مانجھی اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے بولا۔ میں نے غور کیا تو دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ کھردرا پتھر ہے اور ایک چمڑے کا بڑا سا ٹکڑا جو شاید وہ اپنے سامان کے ساتھ لایا تھا۔ شاید وہ گھسنے کی آواز جو میں نے سنی تھی وہ بڑو مانجھی کی حرکت کا نتیجہ تھی۔

"تم یہ پتھر کیوں گھس رہے ہو؟"

"صاب، اس سینگ والے دیوتا سے بچنے کے لئے۔"

میں اس کی باتوں کو نظر انداز کرکے خیمے میں چلا آیا اور سوچنے لگا جو کچھ ابھی ابھی میں نے دیکھا ہے وہ حقیقت ہے کہ میری نظروں کا دھوکا۔ شاید نظروں کا دھوکا ہی ہو کیونکہ ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور ہوسکتا ہے پیڑوں کے ہلتے ہوئے سایوں نے گھوڑ سواروں کی ہیئت اختیار کرلی ہو۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو دن چڑھ چکا تھا، یہاں دھوپ میں تمازت نہیں تھی۔ مزدور کام میں لگے ہوئے تھے۔ ڈھلوان حصے پر اسکائی فولڈنگ باندھا جاچکا تھا اور رحمت پاشا ایک پلیٹ فارم پر کھڑا مزدوروں کو ہدایت دے رہا تھا۔ ایک بڑے حصے کی کھدائی جاری تھی۔ ٹہلتا ہوا میں لیب والے خیمے میں داخل ہوگیا، یہاں نند کشور مستعدی سے کام میں لگا ہوا تھا اور جیوتی راجپوت کو ہدایت بھی دے رہا تھا۔ میز پر یہاں کی سرخ مٹی رکھی ہوئی تھی اور ایک بیکر میں نند کشور سہائے کچھ کیمیکل ڈال کر اسے چیک کررہا تھا۔

"کیا مٹی کا کیمیائی تجزیہ کررہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں دیکھ رہا ہوں کہ اس میں آئرن آکسائیڈ ہے یا کوئی اور چیز۔"

"اور کیا چیز ہوسکتی ہے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"جیوتی، ذرا وہ بوتل دینا۔" سہائے نے ایک بوتل کی طرف اشارہ کیا، پھر بولا۔ "پتہ نہیں، یہ تو تجزیے کے بعد ہی معلوم ہوسکے گا۔" جیوتی نے بوتل لے کر اس نے بیکر میں چند بوندیں ڈالیں اور پھر اسے اچھی طرح ہلانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیکر میں موجود مٹی کا رنگ، سرخ سے گہرا سیاہ ہوگیا۔ سہائے کو میں نے چونکتے ہوئے دیکھا۔

"کیا بات ہے؟ تم اچانک چونکے کیوں؟"

سہائے کے چہرے پر پریشانی تھی۔ "یار بڑی عجیب

بات ہے۔ مٹی میں آئرن آکسائیڈ نہیں خون ملا ہوا ہے۔"
"کیا؟" میں لگ بھگ چیخ پڑا۔
"مجھے بھی حیرت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس زمین میں ہزاروں انسانوں کا خون گھل مل گیا ہے۔"
"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔"
"تمہیں وہ اجتماعی قبر یاد ہے نا، ایسا لگتا ہے بڑے پیمانے پر یہاں قتل عام ہوا ہوگا، شاید ایسی اور بھی قبریں برآمد ہوں۔ ہزاروں سال پہلے بہت ممکن ہے مغرب سے آنے والی بربری قوم نے اس علاقے پر حملہ کرکے یہاں کی آبادی کا صفایا کردیا ہو اور ان کی لاشیں اجتماعی قبروں میں دفن کردی ہوں تاکہ بدبو نہ پھیلے۔" سہائے نے اپنا نظریہ پیش کیا۔
ایسا ممکن تھا لیکن ابھی تک اس نہج پر تحقیق نہیں کی گئی تھی۔ سہائے کی اس بات سے مجھے رات والا گھڑسواروں کا واقعہ یاد آگیا جسے میں وہم سمجھ کر نظر انداز کرچکا تھا۔ سہائے سے جب میں نے اس واقعہ کا ذکر کیا تو وہ ہنسنے لگا، اس نے بھی اسے وہم ہی سمجھا۔
میں نے سہائے سے کہا کہ اس بات کے کافی شواہد موجود ہیں کہ بربری قوم نے جب اس ملک پر حملہ کیا تھا تو وہ گھوڑوں پر سوار ہوکر ہی آئے تھے، لیکن وہ اس علاقے میں آئے تھے یا نہیں یہ بات ابھی نامعلوم ہے تاہم دوسرے علاقوں میں بھی ایسے آثار ملے ہیں کہ وہ لوہے کے ہتھیار استعمال کرتے تھے جبکہ اس ملک کے باشندے ابھی تک لوہے سے واقف نہیں تھے، وہ یا تو تانبے کا استعمال کرتے تھے یا برونز کا۔
شام چار بجے تک ایک بڑے حصے کی کھدائی مکمل ہوچکی تھی۔ اس حصے کا باریک بینی سے معائنہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر اور گہرا کھودا جائے تو یہاں سے مکانوں کے آثار ملنے کے امکانات ہیں کیونکہ کچھ پکی اینٹوں سے بنی دیواریں نمایاں ہوچکی تھیں۔ ایک جگہ ذرا زیادہ گہرائی تک کھودا گیا تھا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ نچلی تہوں سے کچی اینٹوں کی دیوار برآمد ہوئی تھی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے پکی اینٹوں کا استعمال کیا تھا وہ بعد کے لوگ تھے اور کچی اینٹوں کا استعمال کرنے والے مقامی لوگ یا پہلے سے آباد لوگ۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا تھا کہ پرانے باشندے بعد میں پکی اینٹوں سے گھر بنانے والے باشندوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ کھدائی کے دوران سینگ والے دیوتا کی ایک اور مورتی برآمد ہوئی تھی۔ یہ مورتی بھی پہلے ملنے والی مورتی جیسی ہی تھی لیکن اس کی جسامت دوگنی تھی۔ ایک اور بات یہ تھی کہ اس دیوتا کا سارا جسم ایک سیاہ پرت سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ پرت پپڑی کی طرح کہیں کہیں سے اکھڑ رہی تھی۔ یہ پرت کس چیز کی بنی ہوئی تھی یہ جاننے کے لئے مورتی کو سہائے کی لیب میں بھیج دیا گیا۔
رات کا کھانا کھا کر ہم ایک میز کے گرد اکٹھے ہوئے۔ سہائے نے آتے ہی انکشاف کیا کہ سینگ والے دیوتا کے جسم پر جو پرت جمی تھی وہ دراصل انسانی خون کی پرت تھی، ایسا لگتا ہے کہ اس دیوتا کو لگاتار انسانی خون سے نہلایا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس علاقے میں نر بلی کی رسم ہوا کرتی تھی۔
آج کی کھدائی سے بہت ساری کام کی چیزیں برآمد ہوئی تھیں اور ہمارے نقطہ نظر سے یہ ایک کامیاب دن تھا۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔
وہ ایک بھیانک چیخ تھی جسے سن کر میری آنکھ کھل گئی، کسی عورت کی چیخ، پھر وہ چیخ قہقہہ میں تبدیل ہوگئی، پھر چیخ اور قہقہہ ایک دوسرے میں مدغم ہوکر ایک عجیب و غریب غیر انسانی آواز میں ڈھل گئے۔
میں بستر پر پڑا دل کی اچانک تیز ہوجانے والی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن مسلسل قہقہہ اور چیخ کی ملی جلی آوازیں آتی رہیں، ساتھ

ساتھ خیمے کے باہر لوگوں کی ہلچل بھی محسوس ہوئی۔ سلیپر پاؤں میں ڈال کر میں جلدی سے باہر نکلا۔ لوگ تیزی سے کیرتی سبرامنیم کے خیمے کی طرف بھاگ رہے تھے اور وہ خوفناک آوازیں بھی ادھر ہی سے آرہی تھیں۔ ایک کونے میں مجھے بڈو مانجھی نظر آیا جو چاند کی طرف منہ اُٹھائے جلدی جلدی کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں اسے نظر انداز کرتا ہوا کیرتی سبرامنیم کے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے ہی میں کیرتی کے خیمے میں داخل ہوا میری چیخ نکل گئی، یہی حال دوسروں کا بھی ہوا۔ اندر کیرتی سبرامنیم...... نہیں وہ کیرتی سبرامنیم نہیں ہوسکتی، وہ تو کسی اور ہی روپ میں نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آرہی تھیں اور منہ پر خون لگا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک زنگ آلود تلوار جیسی کوئی شئے تھی اور دوسرے ہاتھ میں..... دوسرے ہاتھ میں، اُف یہ تو اشوک مجمدار کا کٹا ہوا سر تھا۔ مجمدار کا دھڑ وہیں اس کے قدموں تلے پڑا ہوا تھا اور کٹی ہوئی گردن سے خون نکل کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ کیرتی کے حلق سے مسلسل قہقہے اور چیخنے کی غیر انسانی آوازیں نکل رہی تھیں۔

اسی وقت بھیڑ کو چیرتا ہوا بڈو مانجھی اندر داخل ہوا۔ ''ہن، ہن، کالی بولیو، ہے ماتا، کالی بولیو، پالاگی، ماتھا ٹیکی، ہے ماتا، ہے ماتا۔'' بڈو مانجھی زمین پر سجدہ ریز ہوگیا۔ کیرتی سبرامنیم یا وہ جو کوئی بھی تھی بڈو مانجھی کی طرف مڑی اور اس کے سفید دانت نمایاں ہوگئے، جیسے وہ مسکرا رہی ہو۔ اچانک اس نے زنگ آلود تلوار نما شئے اور مجمدار کے سر کو نیچے گرا دیا اور زمین پر کسی چوپائے کی طرح گر پڑی۔ اس نے اپنی گردن اِدھر اُدھر گھمائی اور تیر کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں سے چلتی ہوئی لوگوں کی بھیڑ کو چیرتی اندھیرے میں باہر نکل گئی۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ کسی جانور کا گمان ہوتا تھا۔ سارے لوگ اس کے پیچھے پیچھے بھاگے لیکن کیرتی سبرامنیم کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ ندی کے کنارے کی ڈھلوان پر اُتری اور چھلانگ لگا کر ندی میں کود پڑی۔

ساری رات ہم کیرتی سبرامنیم کو ٹارچ لے کر ندی میں تلاش کرتے رہے لیکن وہ نہیں ملی۔ اسی وقت کسی نے ہیڈ کوارٹر فون کیا اور صبح ہوتے ہوتے پولیس آگئی۔ ایک بار پھر کیرتی کی تلاش شروع ہوئی۔ اس علاقے سے کافی دوری پر ندی کے کنارے کیرتی سبرامنیم کی لاش ملی۔ اس واقعہ نے مزدوروں کو بے حد خوفزدہ کردیا تھا، سارے کے سارے صبح ہوتے ہی رفو چکر ہوگئے۔ پولیس نے اشوک مجمدار اور کیرتی کی لاش کو اپنے قبضے میں لے لیا اور علاقے کو سیل کردیا۔

....

اتنے برس بیت گئے، آج بھی یہ واقعات میرے ذہن سے محو نہیں ہوئے۔ حکومت نے ان واقعات کے بعد اس علاقے کی کھدائی کا کام ملتوی کردیا تھا۔ جب بھی یہ واقعات یاد آتے ہیں تو ان سب کے درمیان اچانک مجھے ایک گہری دھند سے اُبھرتا ہوا پہلے بڈو مانجھی کا چہرہ نظر آتا ہے اور پھر اس کا پورا وجود۔ میں دیکھتا ہوں اس کے ہاتھوں میں سینگ والے دیوتا کی مورتی ہے جس سے تازہ لہو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں اور وہ تیزی سے ساگون دیوتا کے مندر کی طرف بھاگا جارہا ہے جہاں ایک طرف اپنی سرخ زبان نکالے ماتا دیوی اس کا انتظار کررہی ہے۔ اپنے گلے میں پڑے ہوئے اُس چمڑے کے چوکور تعویذ کو، جو بڈو مانجھی نے مجھے اپنے ہاتھوں سے پہنایا تھا، واپسی پر میں نے بڈو مانجھی کے گاؤں کے پاس ہی پھینک دیا تھا۔ تعویذ پھینکنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے سینے سے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا ہو۔



”کردار“

مدیحہ اصغر

اسفر حنا کے قریب بیٹھے بڑے گہرے لہجے میں نجانے اسے کیا کہہ رہے تھے اور حنا کے چہرے پر بکھرے رنگ مجھے الجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔ اس وقت وہ مجھے ایک بچی کی بجائے ایسی عورت لگ رہی تھی جو نقب زنی کر رہی ہو۔ ”مجھے جواب چاہیے“ اسفر کا لہجہ اور انداز جذبوں سے لبریز تھا۔

ایک مصنفہ کی کہانی، جو خود ایک بے رنگ کردار بن گئی تھی

کہانی لکھتے لکھتے انسان کو کبھی یہ احساس تک نہیں ہو پاتا کہ جن کرداروں کو وہ اپنی کہانی کی لڑی میں موتیوں کی طرح پرو رہا ہے اگر حقیقت میں وہ کردار اس سے ٹکرا جائیں تو کیا واقعی ایسے ہی ہوں گے جیسا کہ مصنف انہیں لکھتا ہے۔ اپنی اڑتیس سالہ زندگی میں ایک لڑکی میری زندگی میں مجھ سے ایسے ٹکرائی کہ میں ٹھٹک گئی۔ گندمی رنگت والی، بے انتہا سیاہ آنکھیں اور ان آنکھوں سے جھلکتی ذہانت کی

چمک، وہ محض چودہ پندرہ سال کی ایک کم عمر لڑکی تھی مگر اس کی بہادری' محنت' مشقت اور جرأت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ سر پر دوپٹہ لپیٹے وہ دھوپ میں چنے بیچ رہی تھی۔ تب گرمی بھی اپنے عروج پر تھی، مگر اس کے چہرے پر عزم و حوصلہ نمایاں تھا۔

اس سے پہلے میں بہاولپور میں ٹھنڈا پانی بیچنے والے ننھے سعد سے بھی مل چکی تھی۔ جو بس اسٹاپ پر ٹھنڈے شربت کا گلاس پانچ روپے میں بیچ رہا تھا۔ اچانک لوگوں کی بھیڑ میں وہ کسی سے ٹکرایا تو اس کے ہاتھ سے ایک گلاس چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور چکنا چور ہو گیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، میں اس وقت اس سے شربت لے کر پی رہی تھی۔ مجھے بے انتہا رحم آیا پانچ روپے کا شربت بیچتے ہوئے بیس روپے کا گلاس ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے ٹوٹے ہوئے گلاس کی قیمت ادا کرنا چاہی تو اس نے سختی سے منع کر دیا۔ میں دم بخود رہ گئی۔ ایک ننھا سا نرم و نازک سا بچہ جس کا بچپن حالات کی تپتی دھوپ میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا تھا۔ وہ اتنا خوددار تھا۔ مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی اور رونا بھی آ رہا تھا۔ "غریدہ تم صرف عورت ہی نہیں بلکہ ماں بھی ہو۔ ساری دنیا کے مظلوم یتیم و مفلس بے یار و مددگار لوگوں پر تمہیں اتنا رحم اور پیار آتا ہے کہ تمہاری اپنی شخصیت اور پہچان کھو گئی ہے تمہیں شادی نہیں کرنی چاہیے تھی تم تو مدر ٹریسا ہو"۔ فون پر میں نے اسفر کو سعد کے بارے میں بتایا تھا تو اس نے نیند سے بوجھل آواز میں چڑ کر کہا تھا خود سے عشق کرنے والا شخص زندگی کے آئینے میں فقط اپنا چہرہ اور وجود کھوجتا ہے۔ میں تلخی سے سوچ کر رہ گئی تھی۔

بہاولپور میں اپنے قیام کے آخری دن میں نے ایک دوست کی حیثیت سے اسے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی تو اس نے قبول کر لی۔ اس کا باپ برف بیچتا تھا اور ماں معذور تھی گھر کا بیشتر کام وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے کرتا تھا۔ وہ چائے بنا لیتا تھا، روٹی پکا لیتا تھا میٹھے گڑ والے چاول اور حلیم بھی بہت مزے کی بناتا تھا۔ اس کی باتیں سن کر میں مزید حیران ہوئی تھی اور متاثر بھی۔ وہ جب بھی مجھے یاد آتا ہے تو میری آنکھوں میں چمکتی نمی اس کے لیے دعا گو ہو جاتی ہے۔

حنا بھی اس کا پرتو لگ رہی تھی، اُبلے ہوئے چنوں اور کٹی ہوئی پیاز' ٹماٹر اور ہری مرچ سے بھرا ہوا چھوٹا سا ڈول اٹھائے وہ بے حد معصوم اور پیاری لگی تھی مجھے "تمہیں بھی میرے ساتھ کھانے ہوں گے" میں اسے پیسے ادا کرتے ہوئے بولی۔ "میں؟" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے یوں گھور رہی تھی جیسے میں نے کوئی انوکھی اور انہونی بات کر دی "ہاں تم اور کون؟" میں نے ٹشو پیپر سے اپنے ہاتھوں سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اچھا ٹھیک ہے" وہ مسکرائی تھی۔ میں اسے لے کر قریبی پارک میں آ گئی۔ اس کے ساتھ چنے کھاتے ہوئے میں نے اس سے بہت کچھ پوچھ لیا تھا۔ اس کی فیملی کے بارے میں، اُن کے حالات کے بارے میں۔ وہ ایک پینٹر کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ رنگوں سے کھیلنے کا ہنر جانتا تھا مگر افسوس کہ اس کی زندگی نے وفا نہیں کی تھی۔ وہ کینسر کے جان لیوا مرض سے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ حنا سے چھوٹی بہن سدرہ تھی۔ وہ سلائی کڑھائی سیکھ رہی تھی۔ اس کی ماں بیکری کے لیے کیک اور بسکٹ بھی بناتی تھی اور کپڑے بھی سیتی تھی یعنی کہ پورا خاندان محنت مشقت کر رہا تھا مجھے ایک عجیب طرح کا فخر محسوس ہوا تھا اور اس ننھی سی بچی پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ "حنا تم جانتی ہو کہ اگر میری صحیح وقت پر شادی ہو جاتی تو آج تمہاری عمر کی میری بھی اولاد ہوتی" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"اچھا...... مگر آپ تو اب بھی لڑکی لگ رہی ہیں"

اس نے کچھ حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''لڑکی لگنے اور ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے، پندرہ سال پہلے میں جو تھی اب وہ نہیں ہوں میں' نے چودہ برس انتظار میں گزار دیئے اور پھر جب وہ آیا تو میری شادی اس سے ہوگئی، جسے میں نے خود سے بڑھ کر چاہا تھا۔ اب میری زندگی مکمل ہوگئی ہے، اس نے ہر آسائش دی ہے لیکن ہم عجیب ہوتے ہیں ناں کبھی بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ میں بھی اکثر اپنے اندر کی بے چینی سے گھبرا جاتی ہوں تو پھر سفر کرتی ہوں میں'' میں اسے بتا رہی تھی یا خود کو مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھی۔ میں اپنی ذات میں شامل تنہائی کی دیواروں سے گھبرا کر اس سے بے تکلف انداز میں ایسے بات کر رہی تھی جیسے وہ اڑتیس برس کی میچور اور سمجھدار پختہ عورت ہو اور میں پندرہ چودہ سال کی ناسمجھ لڑکی! کبھی کبھی انسان کو ایسا کندھا درکار ہوتا ہے جو اجنبی تو ہو مگر اس کی تکلیف کو محسوس کر سکے۔ میں بھی اسی کیفیت سے دوچار تھی۔

''اوہ.....آپ نے اب تک کتنے شہر دیکھ رکھے ہیں'' اس نے خوش ہو کر پوچھا تھا ''میں نے بہت سے شہر دیکھ رکھے ہیں تقریباً سارا پنجاب دیکھ لیا ہے ابھی پچھلے دنوں میں بہاولپور، احمد پور شرقیہ، خانیوال، احمد پور اور سمہ سٹہ سے ہو کر آئی ہوں مجھے گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔''

''اور آپ کے شوہر، وہ کیا کرتے ہیں کیا وہ بھی آپ کے ساتھ جاتے ہیں۔'' اس نے انجانے میں میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ کتنی ہی دیر لگی تھی مجھے سنبھلنے میں ''نہیں وہ پروفیسر ہیں انہیں گھومنے پھرنے کا کوئی خاص شوق نہیں ہے، وہ تو مجھ سے بھی کم ہی بات کرتے ہیں کہتے ہیں کہ تم سے تو بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں مجھ پر کوئی کہانی نہ لکھ ڈالو۔ میں کہتی ہوں آپ تو میرے شوہر ہیں آپ سے بات کرتے وقت میں صرف ایک بیوی ہوتی ہوں اور بس'' وہ میرا چہرہ بغور دیکھ رہی تھی جیسے کچھ پڑھ رہی ہو۔ حالات کی دھوپ میں پلنے والے بچے اپنی عمر سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ اتنا آگے کہ کبھی کبھی بڑی عمر کے لوگ بھی ان کے سامنے بچے بن کر رہ جاتے ہیں۔'' وہ آپ کو روکتے نہیں سفر کرنے سے؟'' وہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ مجھے اچھا لگ رہا تھا، شاید وہ پہلی انسان تھی جو مجھ میں دلچسپی لے رہی تھی۔ ورنہ میں تو خود اپنے لیے کسی پرانے اور بوسیدہ فرنیچر کی طرح بن کر رہ گئی تھی۔ جس پر پڑی گرد کی تہہ ہر روز بڑھتی ہی جا رہی تھی!

''نہیں! حالانکہ کبھی کبھی تو میرا بھی دل چاہتا ہے کہ وہ مجھے روکیں کہیں غریدہ تم کہیں نہ جاؤ، کوئی ضرورت نہیں ہے گھر سے نکلنے کی۔ مگر وہ کچھ کہتے ہی نہیں، وہ بہت آزاد خیال ہیں چودہ سال وہ لندن میں رہے ہیں''۔

''اچھا انہوں نے آپ کو کہاں دیکھا تھا'' میں نے گزرے وقت کو مڑ کر دیکھا تھا۔

''ہم دونوں نے ایک دوسرے کو یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔ میں اور وہ کلاس فیلو تھے...... وہ بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے اور میں بھی۔ ہماری منگنی بغیر کسی رکاوٹ کے ہوگئی۔ وہ اسکالر شپ پر لندن چلے گئے مگر لندن جانے کے بعد اچانک انہوں نے منگنی توڑ دی اور پھر چودہ سال کے بعد ایک دن وہ میرے گھر آئے اور معافی مانگنے لگے۔ میرے بابا ان دنوں شدید بیمار تھے اور میری وجہ سے بہت پریشان بھی تھے کیونکہ میری شادی کی عمر تقریباً گزر چکی تھی۔ میں اسی کی خاطر بیشتر اچھے رشتوں کو ٹھکرا چکی تھی۔ پھر وہ جب شرمسار سے آگئے تو میں نے سب کچھ بھلا کر انہیں معاف کر دیا اور ہماری شادی ہوگئی۔ وہ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ میرے بابا بھی پروفیسر تھے۔ مجھے ٹریولنگ کا بچپن

سے ہی شوق تھا میں پہلے بابا کے ساتھ گھومنے جاتی تھی لیکن ان کی وفات کے بعد میں اکیلی ہی ہر جگہ جاتی ہوں۔ ان کی جو تھوڑی بہت جائیداد تھی وہ میں نے بیچ دی ہے اور اب اس رقم سے سفر کے اخراجات پورے کرتی ہوں۔ میرے شوہر کہتے ہیں کہ ان فضولیات کے لیے میرے پاس تمہارے لیے ایک روپیہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے میں ان سے مانگتی بھی نہیں اب تو اتنی عادت ہوگئی ہے کہ سفر کرنا سانس لینے کی طرح ضروری ہوگیا ہے۔ اب اتنی شدید گرمی پڑ رہی ہے تو سوچ رہی ہوں کہ مری چلی جاؤں مجھے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں تھی کہ وہ میری بات دلچسپی سے سن بھی رہی ہے یا مروت نبھا رہی ہے۔ تنہائی کی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر بعض اوقات ہم اتنے لہولہان ہو جاتے ہیں کہ جو بھی انسان نظر آئے اسے مسیحا سمجھ کر اپنا درد حال بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ہماری دوستی کا نکتہ آغاز تھا۔ یہ بات میرے لیے تقویت کا باعث تھی کہ وہ میرے شہر کی باسی تھی۔

پھر ایسا بھی ہوا کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر گئی اس کے دو کمرے کے گھر کو میں نے بے حد سجا ہوا پایا تھا۔ گھر کیا تھا چھوٹا سا باغ تھا۔ گلاب کے پھول کیاری میں کھلے مسکرا رہے تھے۔ ان پھولوں نے جھوم کر مجھے سلام کیا تھا۔ میں دیر تک مسحور ہو کر پھولوں اور پودوں سے بچے اس ننھے سے باغیچے کو تکتی رہ گئی تھی۔ اس کی ماں نے بے حد سلیقے سے میرے سامنے رکھی لکڑی کی پرانی سی تپائی پر مونگ پھلی والے بسکٹ، کریم رول اور کیک رکھ دیئے تھے اس کی ماں کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ تھا۔ چائے بھی بہت مزے کی تھی۔ پھر ایک مرتبہ میں حنا کو اپنے گھر لے آئی تھی۔ وہ اتنی پیاری اور معصوم تھی کہ میرے شوہر اسفرا سے دیر تک گھورتے رہ گئے تھے۔ آج کل انہیں بھی اولاد کی شدید خواہش ہونے لگی تھی۔ یہ بات میں اچھی طرح سے جانتی تھی لیکن قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے!

”ہیلو!“ انہوں نے اپنا ہاتھ حنا کی جانب بڑھایا تھا۔

ننھی حنا حیرت اور بے یقینی سے ان کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ شرما رہی تھی گھبرا رہی تھی مگر اس نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔ میں دیر تک ہنستی رہ گئی تھی۔ میرے شوہر شرمندہ سے ہو کر مسکرا رہے تھے۔ ”بھئی میرے شوہر نامدار ولایت کے اثر سے نکل ہی نہیں رہے اکثر بھول جاتے ہیں کہ پاکستان واپس آ گئے ہیں“ میری بات پر انہوں نے گھورا تھا غصے سے۔ پھر اکثر و بیشتر میں حنا کو اپنے گھر لے آتی تھی اس کے آتے ہی ہمارے ویران بڑے گھر میں یوں رونق ہو جاتی جیسے ننھے منے پرندے چہچہا رہے ہوں حیرت کی بات یہ تھی کہ اپنی دنیا میں گم رہنے والے اسفر بھی ہماری محفل کا حصہ بنتے جا رہے تھے!

”کاش تم جلدی لوٹ آتے، ہماری شادی مناسب وقت پر ہو جاتی تو آج حنا کی عمر کی ہماری اپنی اولاد ہوتی“ رات کو ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کتاب پڑھتے ہوئے سگار سے لطف اٹھاتے اسفر کو بغور دیکھتے میں نے نہایت شکستہ انداز سے کہا تھا۔

”اچھا..... یہ شکوہ اور طنز کرنے کا نیا انداز ڈھونڈ لیا ہے تم نے ارے حنا تو ویسے بھی آ جاتی ہے، کہو تو ہمیشہ کے لیے اسے اپنے پاس رکھ لیتے ہیں“ وہ مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولے۔ میں ناسمجھی کے عالم میں انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔ دوسروں کے احساسات اور جذبات کو سمجھ کر قلمبند کرنا اور خود کو سمجھنے اور بیان کرنے میں بے حد فرق ہوتا ہے۔ کب ہمارے جذبات ریت کی مانند ہمارے اختیار کی مٹھی

سے نکل کر بے لگام ہو جائیں کسے خبر ہے؟ چند دن یونہی مکان کو گھر بنانے میں گزر گئے تھے ورنہ اس سے پہلے تو یہ مکان نما گھر مجھے بڑا اجنبی اور خالی خالی سا لگتا تھا۔ مہینے میں پندرہ دن تو میں لازمی سفر کرتی تھی اور جب لوٹتی تھی تو لگتا تھا کہ اپنا دل، اپنی روح اور اپنے جذبات کسی ویران سے سٹیشن پر بھول آئی ہوں۔ عصر کا ڈھلتا ہوا وقت تھا۔ میں لان میں واک کر رہی تھی کہ اچانک حنا کو میں نے لان میں آتے ہوئے دیکھا۔ میرے لبوں کو بے ساختہ مسکراہٹ نے چھوا تھا۔ حنا سے باتیں کرتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا تھا کہ میں اسفر کے لیے کھانا بنانا تو بھول ہی گئی ہوں۔ اسفر کی خوراک بھی بے حد کم تھی لیکن وہ شام کو کھانا ضرور کھاتے تھے۔ اسفر کے سامنے والے صوفے پر حنا بیٹھی تھی اور میں چپکے سے کچن میں گھس گئی تھی۔ اگر اسفر کو پتہ چل جاتا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں بنایا تو وہ آسمان سر پر اُٹھا لیتے۔ وہ اپنی پروفیسری یونیورسٹی میں رکھ کر آتے تھے۔ گھر میں وہ ایک روایتی شوہر کا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرتے تھے۔ اب تو میں یہ بھی بھول چکی تھی کہ کبھی اس شخص نے مجھے محبت بھری نگاہ سے دیکھا بھی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم دریا کے دو کنارے ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے تو ہیں مگر درمیان میں فاصلہ رکھ کر۔ وہ مجھ پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ میری تعریف نہیں کرتے تھے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے جو ان کے رویے کے باعث مجھے پہنچنے والے رنج اور اُداسی کو دُور کردے۔ وہ کہتے تھے کہ مشرقی عورت اتنی مظلوم نہیں ہے جتنی کہ ناشکری ہے۔ باہر عورتیں کام بھی کرتی ہیں اور بچے بھی سنبھالتی ہیں مگر یہاں عورتیں گھر میں بیٹھے بیٹھے رونا مچاتی ہیں کہ ہم دنیا کی سب سے معصوم اور مظلوم قوم ہیں۔ ان کا طنزیہ جملہ میرے دل کو تیر کی انی کی طرح چبھا تھا۔ ''آپ کا اشارہ میری طرف ہے ناں اسفر..... حالانکہ آپ کے حرام کو بھی میں نے حلال سمجھا ہے، کتنا پیتے ہیں کہ آپ کو اچھے اور برے کی تمیز نہیں رہتی آپ کی وجہ سے کوئی نوکرانی چار دن سے زیادہ نہیں ٹکتی شاید اسی لیے ہمارے ملک میں حیوانیت اور انتہا پسندی اپنے عروج پر ہے کہ اساتذہ ہی .....'' میرے جملے کو مکمل اسفر کے زوردار تھپڑ نے کیا تھا اور اس تھپڑ نے میرے لبوں پر خاموشی کی مہر لگادی تھی۔ اس دن کے بعد سے میں نے کبھی بحث نہیں کی تھی کیونکہ مرد کا ہاتھ جب ایک مرتبہ اٹھ جائے تو پھر بنا بات کے بھی مارنے پر اپنا حق روا سمجھتا ہے۔ اسفر کا شمار ان رنگین مزاج مردوں میں ہوتا تھا جو ہر روز نئی عورت اور پرانی شراب مانگتے ہیں۔ اب تو میرا دل ہر اچاٹ رہنے لگا تھا کبھی میرے لیے یہ وہ شخص تھا جو میرے کردار کو خوبصورتی اور اعتدال فراہم کرتا تھا میں بھیگی اور ساکت آنکھوں سے اس شخص کے پل پل بدلتے رنگ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ نجانے مغرب نے اس کا روپ بدلا تھا یا اس کے اندر چھپے ہوئے سفاک اور عیاش مرد کو بے نقاب کیا تھا۔ اس کی بے وفائی کے دُکھ کو بھی میری کہانیوں کے کرداروں نے ہلکا کیا تھا اور جب وہ لوٹ کر میری زندگی میں آیا تھا تو اس نے مجھ سے شادی کرکے کتنے ہی طوفان میرے دامن میں چھوڑ دیے تھے۔ تب ہی ادب میری بیساکھی بن گیا تھا میرے کرداروں نے مجھے زندگی کی طرف کھینچا تھا۔ میں کھانا تیار کرکے دبے قدموں سے ڈرائنگ روم میں آرہی تھی کہ دروازے کے قریب اچانک میرے قدم رُک سے گئے تھے۔
اسفر حنا کے قریب بیٹھے بڑے گہرے لہجے میں نجانے اسے کیا کہہ رہے تھے اور حنا کے چہرے پر بکھرے رنگ مجھے اُلجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔ اس وقت وہ مجھے ایک بچی کی بجائے ایسی عورت لگ رہی

تھی جو نکتہ زنی کررہی ہو۔" "مجھے جواب چاہیے"
اسفر کا لہجہ اور انداز جذبوں سے لبریز تھا۔" اوہ"
میں نے کھنکارا بھرا تو دونوں اپنی اپنی جگہ چونک کر
سیدھے ہو بیٹھے۔" کھانا کھائیں" میں شرمندہ ہو کر بولی
تھی۔ میں جس شخص کے ساتھ رہتی تھی حقیقت تو یہ تھی
کہ اس کی پرچھائی بھی میرے لیے اجنبی تھی۔ وہ کون تھا
میں اسے سمجھ نہیں سکی تھی۔ کبھی وہ مجھے گرگٹ لگتا تھا۔ ایسا
گرگٹ جو پل پل رنگ بدلنے کے ساتھ ڈستا بھی تھا۔

صورتحال بہت تکلیف دہ تھی مگر میں نے خود کو
سمجھایا کہ جلد بازی ٹھیک نہیں۔ ہم رائٹر بھی بڑے
عجیب لوگ ہوتے ہیں سادہ سے جملے سے پوری
کہانی تخلیق کرلیتے ہیں اور جہاں داستان لکھنی
چاہیے وہاں مفروضے گھڑ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔
حنا نے کھانا بس چکھا ہی تھا وہ مجھے بے حد پریشان
سی لگی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اسفر بڑے
خوشگوار موڈ میں میرے پاس آئے۔ میں لان میں
چہل قدمی کررہی تھی اور اپنے اردگرد کھلے پھولوں
کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں" وہ مدھم لہجے
میں بولے۔ آج تو انہوں نے "بی" بھی نہیں کہی تھی۔

"ہاں کہیں میں نے کب روکا ہے" میں ان
کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ "فریدہ میں شادی
کررہا ہوں" سنجیدہ لہجے میں بولا گیا یہ سفاک جملہ
میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرگیا۔ میں اپنے شوہر کو دیکھتی
رہ گئی۔ شدت رنج اور احساس بے بسی سے۔ کیا یہ
وہی شخص تھا۔ وہی شخص جس کی خاطر میں ویران صحرا
کی طرح محبت کی چند بوندوں کو ترستی رہ گئی تھی اور
جب بھر پیار کا بادل برسا تھا تو میرا پیاسا وجود
طوفان کی نذر ہو گیا تھا، میں نے کیسی زمین میں
محبت کے بیج بوئے تھے۔ وہ زمین کتنی بنجر تھی جس
نے میرے دامن کو کانٹوں سے بھر دیا تھا۔

"کون ہے وہ ...... مجھ میں کیا کمی ہے ......"
میری آواز میں ساون تھا۔

میرے ٹوٹے دل کی کرچیاں چیخ رہی تھیں
مگر اسے میری پرواہ ہی کب تھی وہ تو ...... وہ تو میری
طرف بھی تب لوٹا تھا جب اس کے لیے سارے راستے
سارے دروازے بند ہو گئے تھے اور میں تنہائی میں
تنہائی کے غلاف میں اداس کھڑی سولی پر چڑھے قیدی
کی طرح تھی جس کی صبح بھی اندھیروں سے پُر تھی۔

"کمی؟ کمی کی بات کرتی ہو...... ڈھلتی عمر کی بے
رنگ عورت" وہ آہستہ آہستہ ہنسا تھا۔ "اور جس سے میں
شادی کررہا ہوں تم جانتی ہو اسے بلکہ تمہاری پسند ہے
وہ" وہ شوخ ہو کر بولے تھے۔ "کون...... کون......"
"میرا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔ "حنا...... اور کون"
میں حنا کا نام سن کر گرنے کو تھی۔ "حنا...... حنا...... جسے
میں اپنی اولاد کی طرح سمجھتی ہوں" میں رونے لگی تھی مگر
یہ بوندیں میرے وجود کے اندر گر رہی تھیں۔ مگر مجھے یہ
احساس ہی کب تھا۔ ریت کے محل کی ساری دیواریں
ڈھے گئی تھیں اور میں واپس اسی بے آب چٹیل میدان
میں ننگے پاؤں کھڑی تھی جہاں سے میرا خمیر اٹھا تھا۔

"حنا سے پوچھا ہے وہ کبھی نہیں مانے گی" میرا دل
حنا پر یقین کے احساس کے ساتھ ہی پرزور نفی کرنے لگا
تھا۔ وہ ہنسا تھا "حنا آج جواب دینے ہی تو آئی تھی،
پرسوں ہوٹل میں کینڈل لائٹ ڈنر کو انجوائے کرتے
ہوئے میں نے اسے پرپوز کیا تھا" وہ تفاخر سے چور لہجے
میں بولا تھا۔ میری ذات کے پرخچے اڑا کر وہ لوٹ گیا
تھا۔ میری کہانیوں کے بلند وبالا کردار ریت کے
گھروندوں کی مانند حقیقت کی بارش میں ڈوب کر میرا
منہ چڑانے لگے اور خود میں ...... میں بھی تو اپنی کہانیوں کا
کوئی بے رنگ سا کردار بن کر رہ گئی تھی۔ ایسا کردار جو کٹھ
پتلی کی طرح تقدیر کی ڈور پر ناچتا جاتا ہے۔

تربیت کا اثر

جاوید احمد صدیقی

نصیر اب کام میں خاصا مصروف تھا۔ لیکن کبھی کبھی کھانے پر یا صبح ناشتے پر حکومت کے غلط نمائندوں کی فرمائشیں پوری کرنے کے حوالے سے خاصا پریشان نظر آتا تھا۔ مظہر صاحب اس کا غصہ ٹھنڈا کرتے رہتے تھے۔ اسے تو صاف ستھرا کام کرنے کی عادت تھی مگر ملک کے حالات' ماحول عجیب تھا۔



Optimized with a trial version of VIVA...

ایک باپ کی کہانی جس نے ہمیشہ حلال کمائی سے بچوں کی پرورش کی تھی

انہوں نے اب یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ قویٰ کمزور ہوتے جا رہے ہیں، کاروبار کو اکیلا سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے اور آگے بھی مشکل تر ہوتا جائے گا۔ انھوں نے تمام عمر سخت محنت کر کے کاروبار کو بنایا اور سنوارا تھا، اور اسی کی مدد سے اپنے اہلخانہ کی بہترین پرورش کی تھی۔ ایک بیٹی اور دو بیٹوں کو انھوں نے نیک بخت بیوی کے تعاون سے پروان چڑھایا تھا۔ ہمیشہ حق حلال کی [illegible] تھے اور ان کی تربیت کا اثر بچوں میں صاف نظر آتا تھا۔ بڑے بیٹے کو تو اللہ کے کرم سے میڈیکل کروا کر باہر سپیشلسٹ کا کورس کروانے بھیج دیا تھا۔ اس نے تین سال میں سرجن کی ڈگری لے کر اپنے شہر میں کلینک بنایا تھا جو پچھلے ایک سال میں بھرپور نرسنگ ہوم میں تبدیل ہو چکا تھا۔

مظہر صاحب نے چھوٹے بیٹے کو چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنانے کا ارادہ کیا اور اب وہ تربیت کے آخری چھ ماہ گزار رہا تھا۔ وہ جہاندیدہ [illegible] اس نے سی اے مکمل کر لیا تو نوکری کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

ایک دن مظہر صاحب نے اسے بلایا اور بولے۔ "بھئی تم کب تک پھرتے رہو گے۔ دیکھو میری تین عدد جنرل قسم کی بڑی بڑی دکانیں تھیں جو اپنی محنت سے میں نے شاپنگ مال میں تبدیل کرلی ہیں، ان کے لیے اور تمہارے سرجن بھائی کے لیے ایک ایسی جگہ شاندار بلڈنگ بنا رہا ہوں جہاں بیٹھ کر تم ان تمام کی دیکھ بھال کیا کرو گے۔ اکاؤنٹس کو اب بڑی باریک بینی سے چیک کرنا پڑے گا کیوں کہ کاروبار کی ہر آکٹ لسٹ کو تم انفرادی طور پر چیک تو کرنے سے رہے۔ اس لیے تمام حساب کتاب کو تینوں شاپنگ مال اور ہمارے نرسنگ ہوم میں رکھنے کے لیے کوالیفائڈ لوگ رکھ لیے گئے ہیں۔"

"یہ تو شاندار کام ہوگا۔ بلڈنگ آفس والی کب تک مکمل ہو گی؟" بیٹے نے پوچھا۔

مظہر صاحب بولے۔ "بھئی تقریباً مکمل ہے، مزید ایک دو ہفتے میں کام بالکل مکمل ہو جائے گا۔" نصیر بولا "ابو یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔ میں کل ہی آپ کے ساتھ جا کر دیکھ لیتا ہوں"۔

نصیر نے تین ہفتے کے بعد دفتر میں بیٹھنا شروع کر دیا اور معمول کی مصروفیات میں مشغول ہو گیا۔ اس عمارت کا افتتاح بھی ماں سے کرایا گیا۔ اعلیٰ طبقہ کے بڑے بڑے لوگ اور دوسرے کاروباری افراد بھی اس افتتاحی تقریب میں شریک ہوئے۔ بیٹی اور سرجن بیٹے نے بھی باپ کے اس اقدام کو بہت سراہا۔ اور یہ افتتاح بہترین ماحول میں اختتام پذیر ہوا۔

چند روز کے لیے مظہر صاحب نے بھی نصیر کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ وہ مختلف برانچوں اور نرسنگ ہوم کا معائنہ ضرور کرتے۔ یہ مظہر صاحب کا روزانہ کا معمول بن گیا لیکن نصیر کے ساتھ زیادہ دیر نہ بیٹھ سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا نصیر بے حد قابل، ایماندار اور نفیس کاروباری شخص بن رہا ہے۔ ایک دن نصیر نے مظہر صاحب کو اپنا منصوبہ بتایا کہ ایسے شاپنگ مال اب ہمیں دوسرے شہروں میں بھی کھولنے چاہئیں کیوں کہ ہمارے ہونے والے بہنوئی بھی ماشاءاللہ سی اے ہیں اور ایم بی اے بھی باہر سے کر کے آئے ہیں۔ ایک ماہ میں ہماری بہن رخصت ہو جائے گی۔ تو کیوں نہ عامر کو ہمارے ساتھ ہی کام کی دیکھ بھال اور دوسرے شہروں کی برانچوں کو سنبھالنے کا کام بھی سونپ دیا جائے۔ مظہر صاحب نے نہایت ہی خوشی سے اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے اجازت دے دی۔

نصیر اب کام میں خاصا مصروف تھا۔ لیکن کبھی کبھی کھانے پر یا صبح ناشتے پر حکومت کے غلط نمائندوں کی فرمائشیں پوری کرنے کے حوالے سے خاصا پریشان نظر آتا تھا۔ مظہر صاحب اس کا غصہ ٹھنڈا کرتے رہتے تھے۔ اسے تو صاف ستھرا کام کرنے کی عادت تھی مگر ملک کے حالات، ماحول عجیب تھا۔

کام میں تیزی آئی تو نصیر چند دنوں کے لیے عامر کے ساتھ دوسرے شہروں میں اپنے شاپنگ مالز کی عمارات کا تعمیری کام دیکھنے اور ضروری کام نمٹانے کے لیے چلا گیا۔

مظہر صاحب نے پہلے دن تو آفس میں مصروف دن گزارا۔ دوسرے دن انہوں نے آفس میں کام کرتے ہوئے ایک نچلے دراز کو کھولا تو ایک ڈائری نما چیز ہاتھ آ گئی۔ انہوں نے اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ چند مقامات پر پڑھتے ہوئے وہ چونک اٹھے۔ ایک صفحے پر متفرق خرچے کے نتیجے میں کچھ اس طرح لکھا تھا۔

1۔ ناپاک اور پلید جانوروں کو کھانا تاریخ.....
-/500 روپے خرچہ اور اس کے بعد مظہر صاحب حیران ہوئے کہ 15 دن کے بعد کی تاریخ میں ایک اور خرچہ اس طرح لکھا گیا تھا۔

2۔ کتوں کے لیے کھانا.....صاحب۔ تاریخ.....
-/600 روپے خرچہ۔

مظہر صاحب کو کچھ سمجھ نہیں آیا، بہرحال انہوں نے ڈائری رکھ دی اور نصیر کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ نصیر کے آتے ہی وہ اس کے ساتھ آفس آ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد وہی ڈائری نکال کر وہی صفحہ کھولا۔ بولے بھئی یہ کس قسم کا کھانا ہے اور یہ کون لوگ تھے۔ نصیر ہنسنے لگا اور پھر بولا، "ابو آگے 2 والا صفحہ بھی نکالیں۔ یہ اشارہ لکھا ہے۔ پہلے جن کی تفصیل درج ہے ایکسائز انسپکٹر اور لیبر والے آئے تھے اور دوسرے نمبر پر انکم ٹیکس کے کرتا دھرتا تھے، یہ اُن لوگوں کی خاطر مدارت پر خرچ ہونے والی رقم کی تفصیل ہے!!

یہ سنتے ہی مظہر صاحب نے قہقہہ لگایا۔ بولے "نصیر احتیاط ضروری ہے۔ باقی اللہ مالک ہے۔"

......❁......❁......



دریام سنگھ......!

ایس۔ امتیاز احمد

دریا مے جیسے کردار کچھ سوچنے پر مائل کرتے ہیں......
قیام پاکستان کے پس منظر میں لکھی ایک کہانی.........!!
اُس محبت کی کہانی جو ذات پات اور مذہب سے بالاتر ہوتی ہے۔
14 اگست کے حوالے سے خصوصی تحریر.........!

صدر بازار سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر کمپنی باغ سے ملی ہوئی ایک پرانی کوٹھی 20 میکلک پارک کے نام سے [illegible] ہے۔ یہاں صوبائی حکومت محکمہ تعمیرات عامہ کا سرکل آفس ہے۔ یہ دفتر مدتوں سے قائم ہے۔ پہلے یہاں بڑے صاحب انگریز ہوا کرتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ دیسی افسران تعینات ہونے لگے۔ یہ دفتر [illegible] میں [illegible] ہے۔ درمیان میں ایک بہت بڑا ہال روم ہے۔ ہال میں

ہیڈ کلرک کے علاوہ ڈائری اور ڈسپیچ کلرکوں کی میزیں ہیں۔ ایک کونے میں دفتری کا چبوترہ ہے۔ یہاں مکمل خاموشی ہے ہر شخص اپنے کام میں مشغول ہے۔

کبھی کسی دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آتی ہے اور پھر سکوت چھا جاتا ہے۔ یہاں کا ماحول خوشگوار اور دفتر کے لوگوں میں بڑا پیار ہے۔ یہاں مذہب اور ذات پات کی تفریق نہیں۔ سیاسی تبدیلیوں اور تحریکوں سے بے نیاز رہنا یہاں کی ریت ہے۔

یہ تقسیم ہند سے پہلے کا وقت تھا۔ ہندو، سکھ اور مسلمان کونے کے مطابق چالیس کے لگ بھگ دیسی افسران اور عملہ یہاں کام کرتے تھے۔ چپڑاسیوں میں محمد خان، سنتو اور وریام سنگھ تھے۔ محمد خان اور وریام سنگھ تو بوڑھے آدمی تھے۔ البتہ سنتو ادھیڑ پن کی طرف گامزن تھا۔ اسی وجہ سے اسے باہر کی ڈیوٹیاں دی جاتی تھیں۔ اکثر سٹاف کے لیے بازار سے کھانے پینے کی چیزیں بھی لا کر دیتا تھا۔ میٹرک پاس کر کے ریاض اس دفتر میں ملازم ہو گیا اور یہ اس کی زندگی کا پہلا عملی تجربہ تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا نوجوان، دفتری ماحول سے بالکل ناواقف سکول سے نکل سیدھا یہاں آ پہنچا۔ مگر اس کے دل میں کام کرنے کی اُمنگ تھی۔ چند دن تو وہ اجنبی بنا رہا لیکن جلد ہی وہاں کے ماحول سے مانوس ہو گیا۔ اب اس کو چپڑاسیوں کے نام بھی یاد ہو گئے تھے۔

ریاض کو ان سب میں پُراسرار شخصیت وریام سنگھ کی لگتی تھی۔ اس نے اکثر دیکھا تھا کہ جب وہ کام میں مصروف ہوتا تو وریام سنگھ اس کے سائیڈ ریک کے ساتھ کھڑا رہتا اور جب بھی ریاض اس کی طرف دیکھتا تو وہ مسکرا دیتا۔ ریاض نے کبھی اس بارے میں سوچ بچار نہیں کی نہ اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی، وہ اسے ویسے ہی بُرا لگتا تھا۔

بالکل کالا رنگ اور اس پر سارے بال سفید، داڑھی کے بال، بھنوؤں کے بال، حتیٰ کہ کلائیوں پر بھی سفید بال تھے۔ اس کے کالے رنگ نے ان تمام بالوں میں گویا سفیدی بھر دی تھی۔ اس کا منہ تو صرف اس وقت دکھائی دیتا جب وہ منہ کھول کر مخصوص انداز میں مسکراتا ورنہ مونچھوں اور داڑھی کے سفید بالوں نے اس کے منہ کو چھپا رکھا تھا۔ اکثر سنتو اس سے مذاق کرتا۔

"سردار جی تہاڈا مونہہ کتھے وے" اور وہ اس کو موٹی سی گالی دے کر ہاتھوں سے داڑھی مونچھوں کے بال ہٹا کر کہتا "ایہہ کیہہ اے (یہ کیا ہے)؟" پرانی سی عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے حرکت کرتی ہوئی اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ جب دیکھتا تو سر کو پیچھے کی طرف کر کے چہرے اور آنکھوں کو اوپر کی طرف اٹھاتا۔ عینک کے فریم پر بندھے ہوئے میلے دھاگے اس بات کا ثبوت تھے کہ شاید اس نے کئی سالوں سے اسے سنبھالا ہوا ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کا ایک مخصوص لباس تھا۔ پرانی میلی سی قمیص موٹے کھدر کی اور ایسا ہی آڑا پاجامہ، سر پر ایک بوسیدہ سی پگڑی جس کا رنگ کبھی خاکی ہو گا لیکن مدتوں کے استعمال سے اب اس کا رنگ ملگجا ہو گیا تھا اور پگڑی جس کے پیچوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ اس بے ترتیب پگڑی سے کہیں کہیں گرد سے اٹے ہوئے سفید بال نکل رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا گویا پگڑی یوں ہی بندھی بندھائی سر پر رکھ لی گئی ہے۔ کبھی محمد خان اس کی گردن کے پچھلے حصے پر دھپ مارتا تو پگڑی گر کر زمین پر آ رہتی اور اس کے سر کے چھوٹے بڑے سفید بال ایک موٹے دھاگے سے سر پر جوڑا بندھے دکھائی دیتے۔ اور وہ ایک




احتیاط کیجیے اسی میں سب کی بھلائی ہے ۔ ایشوریہ






یہ ایکسیڈنٹ جو آپ دیکھ رہے ہیں ، اس کی وجہ میں نہیں ہوں کیونکہ یہ حادثہ میری کسی زیرِ تکمیل فلم کے سیٹ پر نہیں ہوا ۔ نہ سڑک کے کنارے لگے ہوئے میرے کسی سائن بورڈ کو دیکھتے ہوئے ہوا ہے اور نہ ہی میری کسی زیرِ نمائش فلم کے سینما میں ۔ یہ حادثہ تو ایک ایسی فیکٹری میں ہوا ہے جہاں کوٹلہ کے سیفٹی شوز ہیلمٹ گاگل ماسک کور آل لیدر گلوز نیٹڈ گلوز سب ہی کچھ تو موجود تھا مگر ورکرز کی ذرا سی سستی اور لاپرواہی یہ رنگ لائی ۔ آپ کو سوچنا چاہیے کہ ورکرز کو اس قسم کی صورت حال سے محفوظ رکھنے کیلیے فیکٹری کی انتظامیہ ان چیزوں پر ایک بڑی رقم خرچ کرتی ہے ۔ احتیاط کیجیے اسی میں سب کی بھلائی ہے ۔

KOTLAA SAFETY SHOES & KNITED GLOVES

R/NO.1, FIRST FLOOR, ASLAM ARCADE, 16-MCLEOD ROAD, LAHORE. PH : 7314287-88 FAX : 7225293

موٹی سی گالی دے کر جلدی سے پگڑی اٹھا کر سر ڈھانپ لیتا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لوہے کا کڑا ضرور تھا لیکن کبھی اس کے پاس کرپان نہیں دیکھی۔ پاؤں میں چپل ہوتی جو کثرت استعمال سے گھس چکی تھی۔ گرد و غبار سے اٹے ہوئے کالے کالے پیروں پر میل کی تہیں، بڑھے ہوئے ناخن جن میں میل بھرا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی طرف دیکھنے سے گھن آتی تھی۔ ریاض جب اس کے بارے میں سوچتا تو کراہت محسوس کرتا اور اس سے بات کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا لیکن کبھی کبھی دوسرے لوگوں کی طرح اسے تنگ کرنے کے لیے عین اس لمحے وقت پوچھتا جب ہال روم کا بڑا کلاک ٹن ٹن بارہ بجاتا اور دریام لجاجت سے کہتا:۔

"ریاج بابو! تم تو میرا مجاک نہ اُڑاؤ"۔

کچھ عرصے بعد ایک دن ریاض حسب معمول چٹھیاں ڈائری کر رہا تھا تاکہ بارہ بجے سے پہلے ڈاک ہیڈ ہیڈ کلرک کو دے دے۔ وہ بار بار چٹھیوں کو قلمدان کے نیچے دباتا مگر پھر بھی کاغذ پنکھے کی ہوا سے اُڑتے اور پھڑ پھڑاتے اور اس طرح اسے کوفت ہو رہی تھی۔ ریاض نے دریام کو آواز دے کر کہا۔

"دریام سنگھ جاؤ باہر سے دو پتھر لے آؤ" اس کا مقصد تھا کہ چٹھیوں کے اوپر یہ پتھر رکھ دیئے جائیں تاکہ بار بار نہ اُڑیں۔ دریام سنگھ اُٹھا تو ضرور، مگر جانے کی بجائے حسب عادت سائیڈ ریک کے ساتھ آ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔

"دریام سنگھ تم نے سنا نہیں، میں نے کہا کہ باہر سے دو پتھر لے آؤ"۔ ریاض کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔ وہ پھر بھی ساکت کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر سکون اور معصومیت تھی، پتہ نہیں چلتا تھا کہ آیا اس کی خاموشی میں شرارت ہے اور وہ ریاض کو تنگ کر رہا ہے یا واقعی سنجیدہ ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا:۔

"ریاج بابو یہ کام ہم نہیں کر سکتے"

"کیوں دریام؟"

"جناب ہم نے ایک مرتبہ ایک بابو صاحب کو ایک پتھر لا کر دیا تھا۔ ایک دوسرے بابو صاحب سے ان کا جھگڑا ہو گیا اور غصے میں انہوں نے وہ پتھر کھینچ مارا۔ بس خونم خون ہو گیا۔ جب بڑے صاحب تک معاملہ پہنچا تو انہوں نے پوچھا پتھر کس نے لا کر دیے تھے۔ اس پر ہماری پیشی ہو گئی اور سخت ڈانٹ پڑی۔ اس دن سے ہم نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ کسی کو بھی پتھر لا کر نہیں دیں گے"۔

ریاض اپنے کام میں پھر مشغول ہو گیا اور دریام سنگھ کے چہرے پر اس کی مخصوص مسکراہٹ پھیل گئی۔ دن گزرتے گئے۔ کچھ عرصے بعد ریاض کو ڈسپیچ کا کام دے دیا گیا۔ ان دنوں دفتروں میں کام زیادہ ہو گیا تھا۔ ملک میں گہما گہمی تھی، آزادی کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے جلسے ہو رہے تھے۔ انگریز ہندوستان چھوڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اسی لیے مختلف کاموں کو جلد از جلد نمٹانا چاہتے تھے۔ اس محکمے میں بھی کام زیادہ ہو گیا تھا۔ ریاض کو اکثر چھٹی کے بعد بیٹھنا پڑتا۔ سب لوگ چھٹی کر جاتے لیکن دریام سنگھ اس کے ریک کے سامنے کھڑا رہتا جب وہ تھک جاتا تو دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی بنچ پر بیٹھ جاتا۔ ریاض اسے بہتیرا کہتا۔ "جاؤ دریام سنگھ بس میرا تھوڑا سا کام اور ہے، چوکیدار سے کہو کہ دفتر بند کر دے"۔

"نہیں ریاج بابو میں تو ویسے ہی بیٹھا ہوں، آپ کام ختم کر لیں تو میں چلا جاؤں گا"۔ اس کی آواز میں عاجزی ہوتی اور خواہش کا اظہار کہ جب تک ریاض وہاں سے نہ جائے اسے وہیں رہنے دیا جائے۔ پتہ نہیں اس سے اسے کیا سکون حاصل ہوتا تھا۔

ایک ایسا ہی دن تھا جب ریاض کے پاس ڈسپیچ

کا کام کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان دنوں دفتر کی چھٹی چار بجے ہوا کرتی تھی۔ دفتر کے سب لوگ چھٹی کر کے جا چکے تھے۔ ریاض آج کھانے کے لیے بھی کچھ نہ لایا تھا، آج چھابے والا بھی نہیں آیا تھا اور سنتو بھی چھٹی پر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جلد کام ختم کر کے گھر چلا جائے گا۔ لیکن کام میں ایسا منہمک ہوا کہ شام ہوگئی اور پھر رات کا اندھیرا چھانے لگا مگر اسے پورا بھروسہ تھا کہ وہ جلد کام ختم کر لے گا۔ اس نے ہمت نہ ہاری۔ بدقسمتی سے تھوڑی دیر بعد بجلی چلی گئی۔ ہال میں اندھیرا گھپ ہوگیا۔ صرف روشندان سے چاند کی کرن ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے کسی زندان کے سوراخ سے آتی ہوئی روشنی یا پھر مشرقی دروازے سے باہر فاصلے سے چاندنی ایسی معلوم ہوتی تھی گویا کسی غار کے منہ پر مدھم روشنی دکھائی دیتی ہو۔

اندھیرا ہوتے ہی وریام سنگھ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا۔

"ریاض بابو! دفتری لیکھ رام کے بکس میں موم بتی اور ماچس ہے کہو تو لے آؤں؟" پہلے تو ریاض نے یہ مناسب نہ سمجھا لیکن پھر ناچار کہا۔

"اچھا لے آؤ"۔

آج ریاض نے وریام سنگھ کے ساتھ کو غنیمت سمجھا۔ تھوڑی دیر میں وریام سنگھ اندھیرے میں ٹٹول کر موم بتی اور ماچس لے آیا۔ اب اتنی روشنی ہوگئی تھی جس میں کام ہوسکتا تھا۔ ریاض نے جلدی جلدی لفافوں پر پتے لکھنے شروع کیے لیکن اب اسے بھوک ستانے لگی اور جب برداشت سے باہر ہونے لگی تو اس نے وریام سنگھ سے بھی غیر ارادی طور پر اظہار کر دیا۔ وریام سنگھ کچھ دیر تو خاموش رہا پھر اچانک اُٹھا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ "ریاج بابو میں ابھی آتا ہوں" وہ بدستور اپنے کام میں لگا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ریاض نے دیکھا کہ وریام سنگھ نے گھی سے تیار کیا ہوا ایک گرم گرم پراٹھا مع اچار کی پھاڑی لاکر اس کی میز پر رکھ دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا:۔

"ریاج بابو یہ کھالو" اس کی آواز میں لجاجت تھی۔ ریاض اس کی غیر متوقع پیشکش پر حیران ہوگیا اور سخت لہجے میں بولا:۔

"وریام سنگھ یہ کیا؟ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میرے لیے پراٹھا بنا کر لاؤ؟"

"کیا ہوا ریاج بابو' آخر آپ کو بھوک بھی تو لگی ہوئی ہے" وریام نے سراپا درخواست بن کر جواب دیا۔

ریاض کے دماغ میں مختلف خیالات چکر کاٹنے لگے" پتہ نہیں وریام سنگھ نے کس طرح یہ پراٹھا بنایا ہوگا؟ برتن کیسا تھا جس میں آٹا گوندھا؟ توا کیسا تھا جس پر پکایا؟ پتہ نہیں اس نے آٹا گوندھتے وقت ہاتھ بھی دھوئے تھے یا نہیں۔ ریاض کو تو وریام سنگھ سے بڑی گھن آتی تھی۔ کیونکہ اسے اس کے جسم سے بُو آتی تھی۔ پتہ نہیں کبھی نہاتا بھی ہے کہ نہیں؟ سر داڑھی اور بغلوں کے بال بڑھ رہے ہیں۔ اس کی میلی قمیص پسینے سے شرابور رہتی ہے۔ سارے جسم پر میل کی تہیں جمی ہوئی ہوں گی"۔ اس نے چاہا کہ وہ پراٹھا کھانے سے انکار کر دے لیکن اس کے دل میں وریام کے اس فعل سے ایک گونہ قدر بڑھ گئی تھی"۔ اس نے دل کو سمجھایا کہ اگر اس نے کھانے سے انکار کر دیا تو وریام سنگھ کا دل ٹوٹ جائے گا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی ریاض نے آدھا پراٹھا کھا لیا اور شکریہ ادا کیا۔ وریام سنگھ کے لبوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ اُبھر آئی۔

اب ڈسپیچ کا کام بھی ختم ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ریاض دفتر بند کروا کر واپس ہوا۔ پھر ایک دن ریاض نے وریام سنگھ سے کہا۔

"میں کہانیاں لکھتا ہوں ...... کچھ اپنے بارے میں بتاؤ، تمہاری کہانی بھی لکھوں گا"۔

"سچ ریاض بابو!" اس کی باچھیں کھل گئیں۔
اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا "میری کہانی کچھ نہیں ..... سب دُکھ ہی دُکھ ہیں ..... میں ریاست پٹیالہ میں پیدا ہوا تھا۔ سنا ہے میرا باپ مہاراجہ کے ہاں ملازم تھا لیکن میری بدقسمتی کہ بچپن میں ہی ماں باپ کا انتقال ہوگیا۔ یہاں نزدیک ہی قصبہ شاہ پور میں ایک ماموں پرتاب سنگھ تھا اس کی زمینیں تھیں، وہ مجھے یہاں لے آیا، ابھی میں سات آٹھ برس کا تھا کہ ہمارے گاؤں میں ڈاکہ پڑا، میرا ماموں ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا، تب گاؤں کے نمبردار نے مجھے رکھ لیا اور کچھ لکھنا پڑھنا سکھایا مگر اس کی بیوی بڑی سخت تھی اور ہر وقت میرے پیچھے پڑی رہتی تھی۔ ایک دن میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ پھر محنت مزدوری کرتا، دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ آخر ایک رحم دل بزرگ نے اس دفتر میں چپڑاسی رکھوا دیا۔ جب سے یہیں پڑا ہوں"۔
اتنا کہہ کر وریام سنگھ خاموش ہوگیا۔ ریاض نے دیکھا دو موٹے موٹے آنسو اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے نکلے اور داڑھی کے بالوں سے پھسل کر زمین پر آرہے..... پھر تھوڑی دیر بعد بولا:۔
"ریاض بابو میں محبت کا بھوکا ہوں، ماں باپ کا سایہ نہ ملا، بہن بھائی کا پیار نہ دیکھا، کسی نے پیار سے دو بول نہ کہے..... میرا دل دنیا سے بھر گیا"۔
ریاض کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں اس کے دل میں وریام کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہوگیا۔
اخباروں میں اب عجیب عجیب خبریں آرہی تھیں۔
انگریزوں نے پاکستان کا مطالبہ مان لیا۔ عنقریب ہندوستان تقسیم ہو جائے گا پھر سب مسلمان پاکستان چلے جائیں گے، وریام کے دل میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے ریاض سے پوچھا "جب پاکستان بن جائے گا تو ہمارے دفتر کے مسلمان بابو بھی وہاں چلے جائیں گے؟"
"ہاں وریام اگر یہ علاقہ پاکستان میں نہ آیا تو"
"کیا آپ بھی ریاض بابو"۔
"ہاں میں بھی وریام"۔
وہ اب مغموم سا رہنے لگا۔ پھر ایک دن پتہ چلا کہ پاکستان بن گیا۔ قہر بستیں بننے لگیں۔ ادھر شہر میں فسادات پھوٹ پڑے۔ دو دن بعد راستے بند ہو گئے۔ صدر بازار میں بم پھٹا، چھرا گھونپنے کے واقعات ہونے لگے۔ ہندو اور سکھ، مسلمانوں کو قتل کررہے تھے۔ سوداگر بازار میں مسلمانوں کی چند دکانوں میں آگ لگا دی گئی۔ حکام نے مجبور ہوکر کرفیو لگا دیا۔ مسلمانوں کے محلوں میں ٹھیکری پہرہ لگنے لگا۔ جو لوگ ہندو آبادی والے علاقوں میں رہتے تھے وہ وہاں سے نکل کر مسلمان آبادیوں میں آگئے۔ کچھ دنوں بعد مسلمان آبادیوں کے حصے کو کیمپ میں تبدیل کردیا گیا۔
اب صرف کرفیو ختم ہونے کے بعد ہی بازار وغیرہ جاسکتے تھے۔ ریاض کے گھر والے بھی کیمپ ایریا "رفیع منزل" میں آگئے جو ان کے ایک رشتہ دار کی تھی۔ کیمپ کے چاروں طرف ڈوگرہ فوج کا پہرہ تھا۔ ایک چوراہے پر عارضی چوکی بنائی گئی تھی۔ جہاں ڈیوٹی آفیسر موجود رہتا۔ ڈوگرہ فوج اس وقت بلائی جاتی تھی جب ہندو مسلم فسادات رونما ہوتے تھے۔
ریاض کا دفتر جانا کب کا موقوف ہوچکا تھا کسی دفتر والے نے بھی خبر نہ لی۔ دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ اسے وریام سنگھ کا خیال آیا۔ وہ سوچتا وریام سنگھ کو تو اس کے گھر کا پتہ تھا لیکن پھر سوچتا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ پھر واقعی ایک دن وریام سنگھ کیمپ پہنچ گیا۔ کرفیو کا وقت ختم ہوچکا تھا۔ لوگ ادھر اُدھر سودا سلف کے لیے نکلے۔ کسی طرح ریاض تک

پیغام پہنچا کہ کوئی وریام سنگھ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ فوراً چوکی پہنچا۔ دیکھا تو واقعی وریام سنگھ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کھڑا ہے۔ وہ حیران رہ گیا۔ خیریت معلوم کرنے کے بعد ریاض نے کہا۔

"وریامے تم نے ناحق اتنی تکلیف کی"۔

"ریاج بابو! کیا بتاؤں مجھے آپ سے مل کر کتنی خوشی ہو رہی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے مُردہ جسم میں دوبارہ جان پڑ گئی" پھر اس نے وریام سنگھ کی ایک ماہ کی تنخواہ نکال کر دی، وریام سنگھ نے پے رول پر دستخط کیے اور شکریہ ادا کیا۔ وریام نے بتایا کہ کوئی بھی یہ کام کرنے کو تیار نہ تھا لیکن میں نے ہمت کر کے حامی بھر لی کہ اس بہانے آپ سے ملاقات ہو جائے گی"۔

پھر پوچھا "ریاج بابو کب تک پاکستان جائیں گے؟"

"صحیح پتہ نہیں، ممکن ہے پندرہ بیس دن لگ جائیں"۔

"اچھا میں پھر آؤں گا......"

"کیوں تکلیف کرتے ہو وریامے، حالات اچھے نہیں کہیں شرپسند کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو غنڈے سکھوں کو بھی مار رہے ہیں اور چھپ کر پیچھے سے وار کرتے ہیں"۔

"ریاج بابو! مجھ بڈھے آدمی کو کوئی کیا نقصان پہنچائے گا"۔

اب کرفیو کا وقت ہو گیا ہے۔ یکا یک سائرن کی آواز گونجی، لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ریاض نے وریام سے کہا "اچھا وریام، اب تم جاؤ کرفیو کا وقت ہو گیا"۔

وریام سنگھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ریاض کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ چپ چاپ بھاری بھاری قدموں سے روانہ ہوا تو ریاض نے کہا "رب راکھا"۔

ستمبر کی پچیس تاریخ کو اسپیشل ٹرین روانہ ہونے کی اطلاع پورے کیمپ میں پہنچ چکی تھی۔ ابھی پورا ہفتہ باقی تھا، کیمپ کے باسیوں نے اپنا اپنا مال اسباب باندھنا شروع کر دیا۔ کسی طرح وریام سنگھ کو بھی پتہ چل گیا۔ اس مرتبہ پھر اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیری ہو گئی، وہ دل مسوس کے بیٹھ گیا، جیسے اس کی بہت ہی قیمتی شے کھو گئی ہو۔ دو دن اُداس رہنے کے بعد اس نے تہیہ کر لیا کہ اسپیشل ٹرین جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر وہ ریاض کو دیکھنے جائے گا اور یہ اس کی آخری ملاقات ہو گی۔

وہ رات اس نے کروٹیں بدلتے گزاری، نیند آتی بھی تو نہ آئی، جونہی وہ آنکھیں بند کرتا اس کے سامنے ریاض کا چہرہ ابھر آتا۔ کبھی اس کو دفتر میں کام کرتے دکھائی دیتا کبھی دفتر سے نکلتے ہوئے اور کبھی صبح دفتر کی طرف آتے ہوئے۔ اگلے دن چوبیس ستمبر کی صبح نمودار ہوئی۔ وریام سنگھ جلدی اٹھا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر۔ اس کے تیز قدم شہر کی جانب اُٹھ رہے تھے۔ وہ جلد از جلد کیمپ پہنچنا چاہتا تھا۔ ریاض کا آخری دیدار اس کا مقصد تھا۔ اس لیے کسی قسم کی رکاوٹ یا تاخیر اس کی برداشت سے باہر تھی۔ آج اس کے چہرے پر عجیب قسم کی بشاشت تھی۔ من میں ایک نئی ترنگ اور دل میں سرور تھا۔ نامعلوم اس میں کہاں سے روحانی طاقت آ گئی تھی، اس کے بس میں ہوتا تو وہ پر لگا کر اڑ کر پہنچ جاتا یا پھر بازی گروں کی طرح ایک ہی چھلانگ میں کیمپ میں جا دھمکتا۔ بالآخر راستہ طے ہوا۔ وریام نے سکون کا سانس لیا۔ وہ جلدی سے کیمپ کی چوکی میں داخل ہوا اور ڈیوٹی آفیسر کو آداب کہا۔

"کیا بات ہے بابا"

"صاحب جی ریاج بابو کو ملنا ہے"

"کون ریاج بابو؟"

"صاحب جی ہمارے دفتر کے بابو ہیں محکمہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی یہاں ریس منزل میں آئے ہیں"۔

"مگر کیمپ کے لوگ سپیشل ٹرین کے لیے جا چکے ہیں۔ ہم نے فسادات سے بچنے کے لیے شیڈول میں تبدیلی کر دی اور ایک دن پہلے ہی انہیں منہ اندھیرے نکال دیا۔ (گھڑی دیکھ کر) اب تو ٹرین کی روانگی کا وقت ہے"۔

"نہیں صاحب جی میں نے ریاج بابو سے ضرور ملنا ہے"۔

"تو جاؤ ملو بابا...... یہاں سے کوئی زیادہ دور نہیں دو تین فرلانگ کا فاصلہ ہے"۔

دریام سنگھ پھر ایک مرتبہ سرگرم سفر ہو گیا۔ ابھی اس کی ہمت نے جواب نہیں دیا تھا اور وہ پورے عزم کے ساتھ اپنی پوٹلی تھامے ریلوے یارڈ کی طرف چل دیا۔ اس کا تنفس تیز ہو گیا، دل کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھ گئی۔ حلق خشک ہو چکا تھا۔ پسینہ اس کے سر اور جسم سے نکل کر پنڈلیوں تک پہنچ رہا تھا۔ پکی سڑک ختم ہوئی تو دور سے ٹرین کے ڈبے دکھائی دیئے۔ اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ راستہ ناہموار تھا۔ اسے چلنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ جابجا ٹھوکریں کھاتا سنبھلتا وہ بڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ ٹرین کے قریب ہو رہا تھا اس کی کائنات میں ٹھہراؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا جیسے سمندر کی طوفانی کیفیت مدھم ہوتی جاتی ہے۔

لیکن وائے قسمت ابھی وہ قریب سو قدم کے فاصلے پر تھا کہ انجن نے ایک زوردار سیٹی بجائی اور گارڈ نے فضا میں ہری جھنڈی لہرادی، مسافروں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ جونہی دریام سنگھ نے انجن کی سیٹی سنی اس کے جسم میں پھر ایک بھونچال سا آگیا۔ اک قیامت کی سی کیفیت، گویا عنقریب زمین و آسمان تہ و بالا ہو جائیں گے۔ اسے اپنی امیدوں کے محل گرتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

اب وہ ناامیدی کے سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ دل میں ایک ہوک اٹھی اور زبان سے نکلا۔

"اوہ واہگرو! ...... کیا اب میں ریاج بابو کو کبھی نہ دیکھ سکوں گا؟"

اس نے دل میں پرارتھنا کی ...... "کرپا کرو مہاراج"...... اور اچانک گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ چند گز کے فاصلے پر رک گئی۔ جیسے کوئی معجزہ ہو گیا ہو۔ وارفتگی میں دریام سنگھ نے دوڑنے کا ارادہ کیا۔ وہ ایک بھاری پتھر سے ٹکرایا اور لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ اس کی چیخ نکل گئی "ہائے" ٹخنے پر چوٹ لگی اور خون بہنے لگا۔ عینک کہیں گر کر ٹوٹ گئی پگڑی گر پڑی۔ اس کے پیچ کھل گئے۔ صرف ایک سرا دریام سنگھ کے ہاتھ میں تھا ...... دوسرے ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی تھی اور وہ پوری طاقت سے دیوانہ وار ٹرین کی طرف بڑھ رہا تھا اور چلا رہا تھا "میں آ رہا ہوں ریاج بابو! میں آ رہا ہوں"۔

اب دریام کی آواز گاڑی والوں کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ کچھ لوگ اس کی طرف لپکے اور اس کو دونوں طرف سے سہارا دیا۔ کبھی کبھی انسان منزل مقصود پر پہنچ کر بھی اسے کھو دیتا ہے۔ دریامے پر اب غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ کسی نے جلدی سے پانی کے چھینٹے دیئے اور ہوا کی تو دریامے نے بند آنکھیں کھول دیں۔ لوگوں کے پوچھنے پر دریام نے کپڑے کی پوٹلی ان کے حوالے کی اور کہا:-

"یہ ریاج بابو کو پہنچا دیں"۔

کھول کر دیکھا تو اس میں "گڑ" مکی کا آٹا اور کچھ مٹھائی کی ڈلیاں تھیں"۔ تھوڑی دیر میں ریاض بھی وہاں پہنچ گیا ...... اس نے کہا......!

"دریامے تمہاری کہانی مکمل ہو گئی"۔



سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

فریش کریم چاکلیٹ کیک



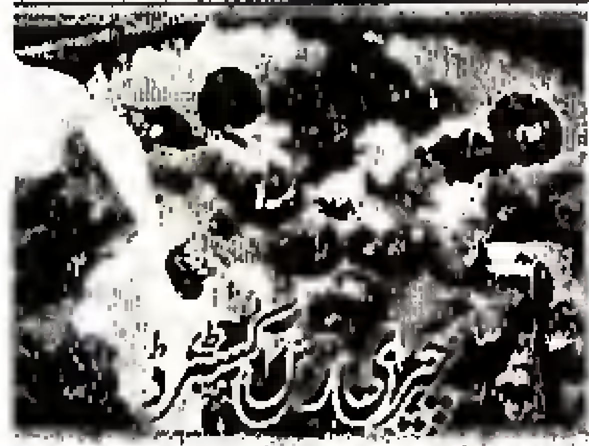
اجزاء:

میدہ	دو ٹیبل اسپون
چینی	دو ٹیبل اسپون
انڈے	دو
فریش کریم	ایک پاؤ
آئسنگ شوگر	چھ ٹیبل اسپون
کوکنگ چاکلیٹ	آدھا کپ
ریڈ شوگر بال	
رول بسکٹ	ایک پیکٹ
شوگر سیرپ	

ترکیب:

انڈے کو اچھی طرح پھینٹ کر اس میں پسی ہوئی چینی ڈال کر پھینٹیں پھر تھوڑا تھوڑا میدہ ڈال کر چمچ سے فولڈ کر کے پانچ انچ کے پین میں ایک سو اسی درجہ حرارت پر بیک کریں۔ بیکنگ کے بعد کیک کو دو حصوں میں کاٹ کر اس پر شوگر سیرپ ڈالیں۔ کریم کو پھینٹ کر آئسنگ شوگر ڈال کر لگائیں دوسرا حصہ رکھ کر کریم لگا دیں۔ سائیڈ پر بسکٹ لگا کر اوپر چاکلیٹ ڈال دیں اور ریڈ بال ڈال کر پیش کریں۔

چیری رس کسٹرڈ



اجزاء:

کسٹرڈ	دو پیکٹ
دودھ	ایک لیٹر
چینی	ایک پیالی
چیری	ایک چھوٹا ڈبا
کارن فلور	آدھی پیالی

ترکیب: دودھ دیگچی میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیجئے۔ تھوڑے سے دودھ یا پانی میں کسٹرڈ گھول لیجئے۔ جب دودھ اُبلنے لگے تو اس میں کسٹرڈ ڈال دیجئے اور ساتھ ساتھ چمچ ہلاتی جایئے تاکہ گٹھلی نہ بننے پائے۔ تھوڑا سا گاڑھا ہونے پر چینی ڈال دیجئے اور مزید پکایئے۔ گاڑھا ہو جانے پر اُتار لیجئے اور کسی برتن میں ڈال کر جمنے کیلئے فریج میں رکھ دیں۔ چیری کے ڈبے کو کھول کر چیری کو الگ کر لیجئے اور اس کا رس یا شیرہ کسی الگ برتن میں نکال لیجئے۔ اس شیرے میں کارن فلور اچھی طرح گھول لیجئے اور پھر کسٹرڈ کی طرح پکایئے۔ گاڑھا ہو جائے تو اُتارلیں۔ کسٹرڈ جم جائے تو اسے فریج سے نکال لیں اور اس پر چیری کے شیرے اور کارن فلور کا آمیزہ ڈال دیں۔ حسب پسند اس پر چیری سجا کر یا اس کے بغیر ہی فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیجئے اور ٹھنڈا ہو جانے پر پیش کریں۔

کپ کیک

اجزاء:

میدہ	ایک کپ اور آدھا کپ
چینی	آدھا کپ
مکھن	ایک چوتھائی کپ
انڈے	چار عدد
بیکنگ پاؤڈر	دو کھانے کے چمچ
ونیلا ایسنس	چار قطرے
کوکو	دو کھانے کے چمچ
چاکلیٹ چپ	
شوگر چنکس	

ترکیب:

میدے میں بیکنگ پاؤڈر ڈال کر مکس کرلیں۔ انڈے کو اچھی طرح پھینٹنے کے بعد چینی اور مکھن ڈال کر پھینٹیں۔ اب اس میں ونیلا ایسنس اور میدہ شامل کرکے مکس کرکے کپ کیک کے سانچوں میں ڈال کر اوپر چاکلیٹ یا شوگر چنک ڈال کر 180 ڈگری پر 20 منٹ بیک کرلیں۔ کیک کے مکسچر میں سے تھوڑا مکسچر لے کر اس میں دو کھانے کے چمچ کوکو تین



کھانے کے چمچ دودھ ڈال کر مکس کریں اور کپ کیک میں ڈال کر بیک کرلیں۔

بادام کا شربت

اجزا:



بادام کی گری عمدہ قسم کی	آدھا سیر
چینی	ڈیڑھ سیر
الائچی سبز	بارہ عدد
پانی	ایک سیر

ترکیب:

بادام کی گری ایک دن پہلے پانی میں بھگودیں۔اور دوسرے دن باریک پیس لیں۔ پھر پانی ڈال کر باریک کپڑے سے چھان لیں۔اب اس پسے ہوئے باداموں میں چینی اور پانی ڈالکر چولہے پر چڑھادیں جب قوام تیار ہوجائے تو الائچی بھی باریک پیس کر اسمیں شامل کر لیں۔ اور اسکو گاڑھا ہونے دیں۔ یہ شربت کافی گاڑھا ہوتا ہے۔اب اسے اُتار کر ٹھنڈا ہونے پر کسی مرتبان میں ڈال لیں اور دو چمچ ایک گلاس میں ڈالکر پانی یا دودھ میں ملا کر نوش فرمائیں بہت ہی لذیذ اور دل و دماغ کیلئے مفید ہوتا ہے۔

بادام کی آئس کریم

اجزاء:

مغز بادام شیریں	ساڑھے تین چھٹانک
مصری	پانچ چھٹانک
انڈوں کی زردی	آٹھ عدد
بالائی	ایک کلو
مغز بادام تلخ	چند عدد
نارنگی کا چھلکا	ذرا سا

ترکیب:

بادام کی گریوں کو گرم پانی سے بھگو کر چھیل لیں۔ بالائی کو جوش دے کر اور زردی کو مصری کے ساتھ پھینٹ کر بالائی میں ملا کر چھان لیں۔ پھر ہلکی آنچ پر مرکب کو بغیر جوش اس قدر پکائیں کہ سخت ہو جائے۔ پھر اُتار کر بادام کی قاشیں تھوڑی سی ٹھنڈی بالائی میں ملا کر اس مرکب کو چند منٹ تک پکائیں پھر آنچ دیں۔ پھر چھان کر اتنا پھینٹیں کہ بالکل ٹھنڈا



ہو جائے پھر نارنگی کا ذرا سا چھلکا ملا کر رکھ دیں۔ بعدازاں مشین کے ذریعے جمالیں۔

کھوپرے کے بسکٹ

اجزاء:

بورا	چھ اونس
خشک ناریل	تین اونس
انڈے کی سفیدی	بڑے دو عدد
میدے	پون اونس
بادام (ست)	آدھا چمچہ

ترکیب:

دو پکانے والی ٹرے پر کاغذ لگائیں۔ انڈوں کی سفیدی کو پھینٹیں۔ تھوڑی سی شکر ملائیں اور گھوٹتے



جائیں۔ میدہ کھوپرے کے ساتھ گھونٹیں۔ کیچر کو چ کے تنور میں پچیس منٹ تک پکائیں۔ ٹھنڈا کر کے ٹکڑے کاٹیں اور کاغذ نکال دیں۔ اسے ٹین میں رکھیں جس میں ہوا کا گزر نہ ہو۔

کافی آئس کریم

اجزاء:

دودھ	دو کلو
کریم	چار اونس
چینی	تین چھٹانک
کافی کے دانے	ایک بڑا چمچہ
نیس کافی	چار چمچے
کسٹرڈ پاؤڈر	چار چمچے

ترکیب:

دودھ کو پکنے کے لیے چڑھا دیں اور سکھا کر ڈیڑھ کلو کرلیں۔ اب اس میں چینی ڈالیں اور کسٹرڈ ڈال کر تیار کرلیں۔ کافی کو ایک پیالے میں ڈالیں اس میں کریم ڈال کر اس کو خوب حل کریں۔ جب جھاگ اٹھ آئے تو اس میں ایک کپ دودھ کا ملائیں اور یہ کافی کسٹرڈ میں ڈال کر خوب ملائیں۔ بلکہ انڈے پھینٹنے والی مشین سے خوب پھینٹیں اور پھر آئس کریم مشین جو کہ برف ڈال کر تیار کرلی ہو اس میں جمالیں۔

کریمل کیک

اجزاء:

میدہ	تین کپ
انڈے	سات عدد
مکھن	دو پیکٹ
دودھ	ایک کپ
چینی	دو کپ
ونیلا ایسنس	



ترکیب:

مکھن اور چینی اچھی طرح پھینٹ لیں اور کریم سی بنالیں اور چھ انڈے ایک ایک کر کے ڈالیں۔ چار چمچ چینی کریمل بنالیں اور سانچے میں ڈال دیں۔ میدے میں ونیلا اور بیکنگ پاؤڈر ڈال کر کریم میں ملادیں۔ ٹرے میں پانی ڈال کر سانچہ رکھ کر دو سو سنٹی گریڈ پر رکھ کر 35 تا 40 منٹ کے لیے رکھ دیں۔









نعت

تیری رحمت کے آشیانوں میں
حوصلہ آ گیا اُڑانوں میں
تذکرہ ایک ذات کا ہر سُو
سب زمینوں میں آسمانوں میں
کہنے کو اس جہان میں ہیں وہ
اور ظاہر سبھی جہانوں میں
اسم ان کا محمدؐ عربی
اور گونجے ہے سب زبانوں میں
ذکر میرے حضورؐ کا جاری
آتے جاتے سبھی زمانوں میں
ایک نقشِ حسیں جھلکتا ہے
میری نعتوں مرے ترانوں میں
طاہر ابدال ہوں غلام رسولؐ
میں بھی شامل ہوں مدح خوانوں میں

(طاہر ابدال طاہر)

لیلۃ القدر

قدر تعظیم اور تکریم اور توصیف کامل ہے
کہ یہ شب عظمت و شرف اور عزت میں بھی کامل ہے
ہزاروں شب سے ہے بڑھ کر فضیلت ایک اس شب کی
کہ اُمت پر محمدؐ کے خصوصی نظر ہے ربّ کی
اگر ہو بندگی دس رات کی رمضانِ اعظم میں
تو یہ کامل عبادت آٹھ صدیوں سے بھی بڑھ کر ہے
انعامِ خاص ربّ نے اُمت احمدؐ کو دے ڈالا
ثواب و اجر میں صدیوں کی رحمت کو بھر ڈالا
تقدس کی عظمت قرآں کے نزول سے کر دی گئی
ہوائیں نور سے پُرنور ہو کر اس طرح جھومیں
خدا نے خود یہ فرمایا یقیناً ہم نے بھیجا ہے
بلا شک و شبہ قرآن کو ہم نے اتارا ہے
پھر اس کی عظمتیں دیکھو ہے اس شب میں نزول اس کا
وہ شب جو قدر والی' افضل و اشرف و برتر ہے
مفسر کچھ تو کہتے ہیں عبادت سال بھر کی میں
یہ بندہ پا ہی لیتا ہے قدر کی شب بزرگی میں
مگر کچھ متفق تھے ماہِ قیام کی عشرہ یہی راتیں
اللہ کی رحمتوں کی لے کے آتی ہیں یہ برساتیں
وہ شب بیدار ان راتوں کے اس کو پا ہی لیتے ہیں
کہ اس شب میں ہر اک نیکی ہزاروں بار کرتے ہیں
ترا ہی قرنوں پہ حاوی ہے یہ شب ارفع و اعلیٰ
کہ ہر لمحہ ہے اس شب کا ہزاروں نعمتوں والا
فرشتے اور روح الا میں ہر امر خیر کو تھامے
اترتے ہیں پرے بن کر کہ سب میں خیر کو بانٹیں
عظیم الشان برکت' خیر اور رحمت اترتی ہے
یہ سب برکت حیات باطنی کی اُن کو ملتی ہے
یہ روحوں کی غذا بنتی ہے شب بیدار لوگوں کی
فرشتوں سے دعائیں اجر کی ملتی ہیں جنتوں کی
رحمت و رافت کے ملائک سدرۃ المنتہیٰ کے فرشتے ہیں
کہ جن کے دل ہر اک مومن کی الفت میں دھڑکتے ہیں
یہ چاروں سو پھیلائے پر ہر اک مومن کے مسکن پر
اللہ کے نور کی چاروں طرف برسات کرتے ہیں
اسی شب میں امن اور خیر اور سلامتی اترتی ہے
کہ شب بھر مومنوں پر امن کی برسات ہوتی ہے
جبھی ہوتی ہے اس کی صبح ملائکہ کی قطاروں سے
تو ملا ہے سکوں مومن کو رحمت کے نظاروں سے

عکس تابندہ بھی تو اس صبح چھپا لیتا ہے کرنوں کو
یہ امر رب ہے صبح قدر لائی ہے بہاروں کو
بہت ٹھنڈی' بہت پر نور یہ صبح قدر آتی ہے
کہ ہر مومن کو جنت کا حسیں مژدہ سناتی ہے
نوشابہ اختر

غزل

محبت کے بدلے سزا دے گیا
عجب دوستی کا صلہ دے گیا
وفا میں نے مانگی جفا دے گیا
وہ جاتے ہوئے غم نیا دے گیا
تڑپنا سسکنا ہی اب رہ گیا
بچھڑتے ہوئے وہ دعا دے گیا
نجانے کنارے کہاں کھو گئے
سفینہ کہاں ناخدا دے گیا
اندھیروں کا ہے رقص چاروں طرف
چراغوں میں کیسی ہوا دے گیا
در میکدہ اور رانا ہیں ہم
وہ جینے کی کیسی ادا دے گیا
(قدیر رانا/راولپنڈی)

کچھ خواہشیں

کچھ خواہشیں بھی
کتنی ضدی اور منہ زور ہوتی ہیں
کنول کی قبر میں انہیں
جتنا گہرا بھی دفن کردو
ذرا سی نمو پاکر
کبھی نہ کبھی کسی صورت
ناگ پھنی کے پودوں کی مانند
خواہشوں کے صحرا میں
سر نکال ہی لیتی ہیں
نندگزاروں کی تپش

معراج کی شب

معراج کی شب اعلان ہوا
نعلین ہی پہنے آجاؤ
نعلین کے بوسے کے صدقے
رہتا تھا مگر اس سے پہلے
غلمان فرشتوں حوروں نے
بیہوش ہوا تھا بشر مگر
جو دیکھ سکے جلوہ تیری
صدیق شہادت دے دے گا
رہنے دے پریشاں جاہل کو
ہے شوق چراغاں آج کی شب
ہیں دونوں جہاں جگمگ جگمگ
یہ عرش کی ساری راہوں میں
محبوبؐ ہماری راہوں میں
یہ عرش ہمارا قائم ہے
یہ سسکیوں میں اور آہوں میں
وہ راہوں میں چوراہوں میں
ہے فرق محمدؐ و موسیٰؑ میں
ہے ایسا نور نگاہوں میں
تو جسم سے آیا ہے ملنے
ابلیس کی ذلت گاہوں میں
یہ عرش کے سارے مکینوں کا
ہے نور بھرا مصباحوں میں
(شوق خالو ابی خانوادہ سے)

انھیں جھلساتی ہیں
نہ پس زنداں جن جانے سے
خوف آتا ہے
نہ دریا کی بپھری ہوئی موجیں
ان کے ارادوں کا خون کرتی ہیں
کچھ خواہشیں بھی کتنی ....!

(ڈاکٹر درخشاں انجم/ کراچی)

غزل

وفا کو درد لکھنا درد کو آرام جاں لکھنا
ہمیں آہی گیا آخر محبت کی زباں لکھنا
زمین کوچہ جاناں کی قیمت کوئی کیا جانے
اگر لکھنا پڑے تو اس زمیں کو آسماں لکھنا
قلم تو وقف ہے ذکر بہاراں کے لیے ہمدم
مرا مسلک ہے ویرانہ کو رشک گلستاں لکھنا
اگر قربت کا اک لمحہ میسر آ نہیں سکتا
تو پھر لازم ہے ساری زندگی کو رائیگاں لکھنا
امتیاز لکھنے کی عادت ہو گئی ہے تم کو دنیا میں
بجائے اپنے غم کے تم کو حدیث دیگراں لکھنا

(ایس۔ امتیاز احمد/ کراچی)

غزل

لوٹ کے ہم نہ گھر گئے ہوتے
اس سے اچھا تھا مر گئے ہوتے
دیکھ لیتے جو مسکرا کے تم !!
زخم سب دل کے بھر گئے ہوتے
کاش تم اور گفتگو کرتے
کاش لمحے ٹھہر گئے ہوتے
تیرے کوچے سے اجنبی کی طرح
کاش ہم بھی گزر گئے ہوتے
موت آئی اگر جوانی میں
ہم بھی کچھ نام کر گئے ہوتے
غم نہ ہوتا جو تیرے کوچے سے
لے کے ہاتھوں پہ سر گئے ہوتے
تیری رسوائیوں کا خوف رہا
ورنہ کب کے بکھر گئے ہوتے
دل میں رکھتے جو تم مری چاہت
نالے نہ بے اثر گئے ہوتے
نیئر کرتے نہ ہم جو مشق سخن
دن ہمارے سنور گئے ہوتے

(نیئر رضادی/ کراچی)

ہو میرا کام ضعیفوں سے محبت کرنا

رات کو آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
صبح کو پوری ہو دعا بن کے تمنا میری
بچی رہے جان میری پولیس رہا ان سے
زندگی وہ نہ بن جائے کہیں سزا میری
ڈوں تھپڑ میں انھیں ان کے رخساروں پہ
ڈوں ڈنڈے میں انھیں تشریف گاہوں پہ
کبھی تھانے کی صورت نہ میں دیکھوں یارب
پولیس کے بھاری "چھتر" سے بچانا مجھے یارب
ہو میرا کام ہٹلر سے بھی پھر پنگا لینا
کبھی مکا، کبھی تھپڑ کبھی ٹکر لینا
میرے اللہ تلنگوں سے بچانا مجھ کو
راہ جو جیل کی ہو اس سے بچانا مجھ کو
ہو میرا کام برائی سے بھی نفرت کرنا
وہ مشدوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
دہشت کی جو راہ ہو اس سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس راہ پہ چلانا مجھ کو
ہر لمحے چہرے پہ رہے میرے تبسم یارب
شر انگیزوں کے شر سے بھی بچائے رکھنا

اللہ مجھے انس و جن کے شر سے بچائے رکھنا
راہ جو سچ ہو اس راہ پہ چلائے رکھنا
(اقبال تبسم)

مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں۔!

وہ میرے اداس دل پر
وہ تیری خوشبوؤں کی دستکیں
مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں
صبح کو کوئل کی کوک
سرِ شام شفق کی رنگینیاں
وہ خواب جو بُنے تھے میں نے
وہ تمام رنگ زندگی کے
چاہے تھے میں نے زندگی سے
ہواؤں کی نرم سی سرگوشیوں پر
اک تیرے آنے کا سن کر
وہ تیری خوشبوؤں کی دستکیں
مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں
وہ میرے اُداس دل کو
بہار کا پیراہن دینے کو
وہ تیری خوشبوؤں کی دستکیں
مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں۔۔۔!
(مریم ماہ منیر۔لاہور)

غزل

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات، جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کرنی نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل، گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے، پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی
(مرزا اسد اللہ خان غالب)

وادیٔ گنگا میں ایک رات

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادیٔ گنگا ترے شاداب نظارے
یہ بکھرے ہوئے پھول یہ بکھرے ہوئے تارے
خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے
یہ چاندنی رات اور یہ پُر خواب فضائیں
اک موجِ طرب کی طرح بے تاب فضائیں
سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضائیں
جھکے ہوئے نظارے ہیں بہکے ہوئے تارے
یہ تارے ہیں یا نور کے مے خانے ہیں آباد
معصوم و حسیں حوروں کے کاشانے ہیں آباد
مستانہ ہواؤں پر پری خانے ہیں آباد

یا دامن افلاک میں بے تاب شرارے
مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی صورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
نیندوں میں ہیں کھوئی ہوئی بے دار ہوائیں
گل زار میں گل ریز گہر بار ہوائیں
یا نور میں ڈوبی ہوئی سرشار ہوائیں
یا بال فشاں مستی نکہت کے نظارے
صحرا ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی پُر کیف بہاروں کے شبستاں
شاعر کو تمنا ہے یہیں رات گزارے

(اختر شیرانی)

غزل

اپنا آپ تماشا کرکے دیکھوں گا
خود کو خود سے منہا کرکے دیکھوں گا

وہ شعلہ ہے یا چشمہ کچھ بھید کھلے
پتھر دل میں رستہ کرکے دیکھوں گا

کب بچھڑا تھا، کون گھڑی تھی یاد نہیں
لمحہ لمحہ یکجا کرکے دیکھوں گا

وعدہ کرکے لوگ بھلا کیوں دیتے ہیں
اب کے میں بھی ایسا کرکے دیکھوں گا

کتنا سچا ہے وہ میری چاہت میں
محسن خود کو رسوا کرکے دیکھوں گا

(محسن بھوپالی)

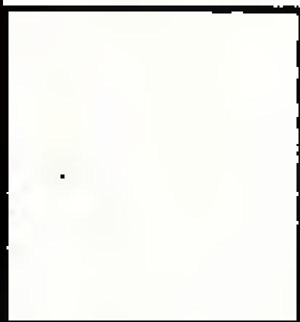
غزل

اس دور کی دنیا سے گزر کیوں نہیں جاتے
یہ لوگ بھی کیا لوگ ہیں مر کیوں نہیں جاتے
ہے کون زمانے میں میرا پوچھنے والا!
ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ گھر کیوں نہیں جاتے
شعلے ہیں تو کیوں ان کو بھڑکتے نہیں دیکھا
ہیں خاک تو راہوں میں بکھر کیوں نہیں جاتے
آنسو بھی ہیں آنکھوں میں دعائیں بھی ہیں لب پر
بگڑے ہوئے حالات سنور کیوں نہیں جاتے

(حبیب جالب)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پر کرکے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔



کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

نام:.................... تعلیمی قابلیت:....................
عمر:.................... پسندیدہ شاعر:....................
پسندیدہ غزل/نظم:....................
مشاغل:.................... تاریخ پیدائش/برج:....................
شادی شدہ/غیر شادی شدہ:.................... پتہ:....................
ای میل:....................

نوٹ: اپنی پسند/ناپسند، شاعری کی ابتدا، مزاج، اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کرکے بھیجیے۔

گھر اور شہر

ڈاکٹر درخشاں انجم

اب مجھے معلوم ہوا کہ یہی میرا شریک سفر ہے، یعنی امیر علی..... میرے خواب ریزہ ریزہ ہوگئے۔ پہلے ہی بمشکل اپنے ناتواں دل کو سنبھالا ہوا تھا اور اب تو زندگی بھر کا رونا تھا..... ان لوگوں نے مجھے اور میرے گھر والوں کو دھوکہ دیا تھا۔ دل تو یہ چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روؤں، کتنے خودغرض تھے یہ لوگ۔

ایک عورت کی کہانی جس کے ساتھ شادی کے نام پر بہت بڑا دھوکہ ہوا تھا



یہ اوائل بہار کی ایک دھنک رنگ اور خوشبو بکھیرتی شام ہے۔ تاحد نظر تک سبزہ ہی سبزہ نظر آرہا ہے۔ دور پہاڑی سے بہتا ہوا جھرنے کا سفید جھاگ اُڑاتا پانی نیچے جھیل میں آکر نیلا دکھائی دے رہا ہے۔ جس پر اُڑتے ہوئے سفید بگلے کتنے اچھے دکھائی دے رہے ہیں۔ ان سرسبز درختوں کے درمیان رنگ برنگے پھولوں کے بیچ میرا کا ٹھما بڑا سا بنگلہ ایک عجیب سحر خیز سا منظر پیش کرتا ہے۔

میں اکثر اس ٹیرس پر کھڑی گھنٹوں گھنٹوں ان حسین مناظر میں گم سی رہتی ہوں۔ اگر یہ کاٹیج ہمارے ملک کے کسی شہر میں ہوتا تو شاید میں اپنے آپ کو دنیا کے خوش نصیب انسانوں میں شمار کرتی لیکن یہ میرا ملک نہیں۔ ہاں! تو میں کہہ رہی تھی کہ میں ہمیشہ یہاں کھڑی ان مناظر میں گم ہو جاتی ہوں لیکن آج بظاہر تو میں انہیں دیکھ رہی ہوں میرا ذہن کہیں اور ہے۔

شاید کل یہ سب کچھ نہ رہے۔ یہ بات نہیں کہ یہ سب کچھ مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ قدرتی حسن میری کمزوری ہے اور آج جبکہ یہ سب میرا ہو چکا ہے میں بلا شرکت غیرے ان سب کی مالک و مختار ہو چکی ہوں تو سوچ رہی ہوں مجھے کیا کرنا چاہئے؟

امیر خان نے اس خوبصورت سی وادی میں یہ مکان اپنی ذاتی رہائش کے لئے خریدا تھا۔ یہ انسان بھی کتنا حریص ہے۔ دودن کی زندگی میں اپنے آرام و آسائش کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا۔ سمگلنگ، منافع خوری، حق تلفی اور جانے کیا کیا کچھ، یہاں تک کہ بے گناہ انسانوں کی جان تک لینے سے دریغ نہیں کرتا مگر اسے کیا معلوم کہ موت اس کے پیچھے پیچھے منڈلا رہی ہوتی ہے یا پھر کسی وقت کسی بہانے زندگی کی شام ہو جائے تو اسے سوائے دو گز زمین کے اور کیا ملتا ہے۔ اسے بھی کیا ملا، حالانکہ وہ اربوں کا مالک تھا۔ خاندانی دشمنی کی بنا پر والدین کے قتل کے بعد خود اس نے نشے میں پناہ ڈھونڈی۔ چاچے ماموؤں نے تینوں بھائی بہنوں کی شادیاں کروائیں اور اسے دشمنوں کی پہنچ سے دور سمندر پار بھیج دیا۔ ان کا خیال تھا وہاں جا کر اس کے نشے کی عادت بھی ختم ہو جائے گی۔ اس کے بارے میں تو اس کے خاندان کا خیال درست نکلا مگر اس نے دوسروں کو اس کا عادی بنا دیا۔ یہ زہر کتنی ہی رگوں میں اُتارتا گیا۔ بدلے میں اُتنے ہی پیسے ملتے گئے اور کچھ ہی سالوں میں وہ ایک امیر و کبیر انسان بن گیا۔ اپنے نام کی طرح نوجوان نسل میں بغیر سوچے سمجھے یہ زہر اُتارتا رہا یہاں تک کہ قدرت کی طرف سے دی گئی ڈھیل کا وقت بھی ختم ہو گیا۔ معمولی سی بیماری کے بعد ڈاکٹروں نے اسے بلڈ کینسر تشخیص کیا، تب اسے ہوش آیا کہ اب رسی کھینچنے کا عمل شروع ہوا چاہتا ہے۔ بہت سٹپٹایا مگر دیر ہو چکی تھی۔ اب ہر سال خون کی تبدیلی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ بھاری اخراجات کے علاوہ بون میرو(Bone Marrow) کے اذیت ناک مراحل سے گزرنا ہوتا، یہ سلسلہ کئی سالوں تک چلتا رہا۔ اس کا ایک بھائی والدین کی موت سے پہلے ہی یہاں آ گیا تھا۔ اس کے آنے کے بعد اس کی دو شادی شدہ بہنیں بھی آ گئی تھیں۔ انہیں بھی اس نے علیحدہ علیحدہ فلیٹ پاکستانی کمیونٹی میں دلوا دیے تھے۔ اس کے علاوہ بھی مالی امداد کرتا رہتا تھا۔ اب جبکہ اس کی بیماری پر اس کے سارے پیسے لگنے لگے تو انہوں نے بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ سب نے مصنوعی مجبوری کا سہارا لینا شروع کر دیا۔ ملازم یا ملازمائیں اوّل تو وہاں ملتی نہیں تھیں اور کوئی ملا بھی تو بھروسے کا نہیں۔ البتہ پاکستانی کمیونٹی سے تلاش بسیار کے بعد جز وقتی چوکیدار اور ایک خانساماں کا بندوبست اس کے دوست اسفند علی نے کر دیا تھا۔ خانساماں اکثر چھٹی کر لیتا تھا۔ امیر خان کے بیمار ہونے پر ایک جز وقتی نرس کا بھی انتظام کرنا پڑا تھا۔ جس کی فیس بہت زیادہ تھی۔ اس کے مالی حالات بھی خراب ہوتے جا رہے تھے۔ اب اس کی تیمارداری کا کام سب کے لئے دردِ سر بنا ہوا تھا۔ تب اس کے دوست

افتخار احمد نے اسے شادی کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن آنکھوں دیکھی مکھی کون نگل سکتا تھا۔ وہاں تمام لوگ اس کے بارے میں جانتے تھے۔ کافی سوچ بچار کے بعد پھر اسفند علی کا مشورہ کام آیا۔ اس نے پاکستان میں موجود اپنی خالہ سے کہا کہ وہ کسی ایسی لڑکی کا بندوبست کریں جو غریب ہونے کے ساتھ ساتھ قابل اعتماد بھی ہو۔ شکل وصورت خواہ جیسی بھی ہو۔

اس کی خالہ نے جس کی ماں جی سے خوب بنتی تھی۔ اماں کے سامنے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئیں۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہائش پذیر لڑکے کے لئے غریب اور معمولی شکل وصورت والی لڑکی کی منطق سمجھ میں نہیں آرہی تھی، جبکہ ایسے لڑکوں کے تو مطالبات ہی بہت ہوتے ہیں۔ چلو غربت والی بات بھی مان لیتے ہیں کیونکہ کچھ صاحب حیثیت لوگوں کو روپے پیسے یا جہیز کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن شکل وصورت تو سبھی دیکھتے ہیں۔ ہمارا گھرانہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور شکل وصورت بھی اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں بہنوں کی اچھی بنائی تھی مگر افتخار احمد کی خالہ میرے لئے بضد تھیں۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ابا نے لڑکے کی تصویر مانگی، ذرا انتظار کے بعد وہ بھی آگئی۔ اماں کو لڑکا پسند آگیا اور یوں بات آگے بڑھی۔ شادی کے سارے معاملات طے پاگئے، لڑکا کسی مصروفیت کی بنا پر نہیں آسکتا تھا اس لیے فون پر ہی نکاح ہوا۔ کچھ دن پاسپورٹ اور ویزے وغیرہ کی تیاریوں میں لگے۔ آخر تین چار ماہ کے بعد میری رخصتی عمل میں آئی۔ سارا خاندان مجھے رخصت کرنے آیا تھا مگر صرف ایئرپورٹ تک۔ سب لوگ مجھے ڈیپارچر لاؤنج تک چھوڑ کر خداحافظ کہتے ہوئے واپس چلے گئے۔ میں پہلی بار اکیلی اتنے لمبے سفر پر جارہی تھی۔ ایک تو اپنوں سے بچھڑنے کا غم دوسرے اتنا طویل سفر پھر مستقبل کا خوف اور ہمسفر سے ملنے کی آرزو، انجانے خوف کے حصار میں گھری ہوئی پیا کے دیس کو جارہی تھی۔

آخر اس طویل اور تھکا دینے والے سفر کا اختتام ہوا۔ میں چیکنگ وغیرہ کے مراحل سے گزر کر ایئرپورٹ کے عملے کی نگرانی میں ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر ہونقوں کی طرح گھبرائی گھبرائی سی ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی تصویر میرے ہاتھوں میں تھی۔ تب ہی ایک گاڑی میرے نزدیک آکر رُکی میرا دل زور سے دھڑکا کہ شاید امیر خان کی گاڑی ہے، لیکن یہ......وہ تو نہیں تھا...... پھر...... گاڑی میں بیٹھے شخص نے میرے قریب آکر میری مشکل آسان کردی۔ ''غالباً آپ......شفق منیر ہیں''۔ ''اور میں افتخار احمد...... امیر خان کا دوست سمجھ لیں'' اس نے خوشگوار لہجے میں اپنا تعارف کرایا مگر آنکھیں اس کے مسکراتے چہرے کی چغلی کھارہی تھیں۔ ایک الجھن تھی اس کی آنکھوں میں جسے میں سمجھ نہیں سکی۔ ''وہ کیوں نہیں آئے؟'' شکوہ میرے ہونٹوں سے پھسل ہی گیا۔ ''انہیں کوئی ضروری کام تھا'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ میں تذبذب کا شکار تھی۔ ''محترمہ یہ پاکستان نہیں امریکہ ہے یہاں ہر موڑ پر ایسے واقعات سے واسطہ پڑے گا''۔ اس نے میری سوچ کو پڑھتے ہوئے ہلکا سا طنز کیا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ پھر ایک اور طویل سفر کا آغاز ہوا۔ مستقبل کے تانے بانے بنتے گاڑی ایک شاندار کاٹیج کے پارکنگ ایریا میں پہنچ کر رُکی تو میرے خوابوں کا سلسلہ بھی منقطع ہوا۔ تین چار خواتین اندر سے آتی دکھائی دیں ''لیں جی سنبھالیں اپنی بھابی صاحبہ کو'' افتخار احمد نے تھکے تھکے سے انداز میں انہیں مخاطب کیا۔ میں اُن کے ساتھ گھر

کے اندر چلی گئی۔ اندر ایک ادھیڑ عمر آدمی ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ شاید بیمار تھا جب ہی کمبل سے آدھا جسم چھپایا ہوا تھا۔ "لیں جی! اپنی بیگم سنبھالیں، اور بیگم صاحبہ! ذرا اپنے میاں کا خیال رکھیے گا یہ کچھ بیمار ہیں"۔ بہن بھائی تعارف کے بعد مجھے ان کے کمرے میں چھوڑ گئے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ یہی میرا شریک سفر ہے، یعنی امیر علی...... میرے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ پہلے ہی بمشکل اپنے ناتواں دل کو سنبھالا ہوا تھا اوراب تو زندگی بھر کا رونا تھا...... ان لوگوں نے مجھے اور میرے گھر والوں کو دھوکہ دیا تھا۔ دل تو یہ چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روؤں، کتنے خود غرض تھے یہ لوگ اپنی خوشیوں آرام کی خاطر میری زندگی برباد کر دی تھی اور کتنی جلدی یہاں چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔

"بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے دیکھ کر؟" امیر خان نے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائے ہوئے پوچھا۔ "ن...... نہیں" میں نے لڑکھڑا کر دیوار کو تھام لیا "حوصلہ...... حوصلہ" اس نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ "ادھر آؤ!" اس نے اپنے پاس بیٹھ کر آنے کا اشارہ کیا مگر میں اس وقت تک خود کو سنبھال کر پاس پڑے صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔ کچھ لمحے یونہی بیت گئے۔ "بھئی کچھ تو بولو"۔ آخر وہ میری خاموشی سے اُکتا ہی گیا۔ "تم نے شاید اس طرح کی شادی کا تصور نہیں کیا ہوگا۔ مگر یہ ہماری مجبوری تھی اور یہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے، سارے اپنی اپنی دنیاؤں میں مصروف رہتے ہیں، کون کسی کے لئے وقت نکالتا ہے؟" میری طرف سے مایوس ہو کر اس نے خود ہی وضاحتیں پیش کرنا شروع کر دی تھیں۔ "اور پھر میرا یہاں سوائے ایک بھائی اور دو بہنوں کے اور کوئی ہے بھی نہیں اور وہ سب بھی اپنی اپنی مصروفیات میں کھوئے ہوئے ہیں۔ دیکھا نا تم نے! کیسے ایک نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر نکل گئے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اُداسی سمٹ آئی۔ تب بہت کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ مگر اتنا کچھ ہوتے ہوئے اتنا دولت مند انسان تنہا کیوں تھا، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"دیکھو شفق! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے" بہت دیر کے بعد وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ میرا دل خوش فہمیوں کی لپیٹ میں آ کر دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ شاید اب...... کوئی پیار بھرا جملہ میری جانب اچھالے یا کوئی بہت راز کی بات بتائے۔ میں ہمہ تن گوش تھی۔ "یہ شادی ایک مجبوری تھی میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں، میں بلڈ کینسر کا مریض ہوں، سب آہستہ آہستہ میرا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ مجھے ایک کل وقتی ملازمہ کی ضرورت تھی جو یہاں ملنی مشکل تھی۔ اسفند علی نے مجھے اس مسئلے کا آسان حل بھی بتایا کہ میں کسی ایسی لڑکی کا انتخاب کروں جو مالی حیثیت میں کمتر ہو۔ پھر میرا یہ مسئلہ بھی اسی نے حل کر دیا۔ میں نے تمہارے والدین کو اتنا دے دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنے کے بعد بھی اپنی باقی ماندہ زندگی بھی اچھی طرح گزار سکتے ہیں"۔

میں جو اتنی دیر سے اپنے خوابوں کے چکناچور ہونے پر جاں بلب تھی اس کی اس بات پر یکدم چیخ پڑی "کیا...... میرے والدین نے مجھے فروخت کر دیا ہے؟"۔

"نہیں انہیں تو کچھ پتہ نہیں ہم نے اپنی خوشی سے کچھ ڈالرز ان کے اکاؤنٹ میں بھجوا دیئے ہیں"۔ اس نے تسبیح ایک طرف رکھ کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "تو آپ نے! ہماری کم مائیگی کا سودا کیا"۔ میری آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگیں۔ "نہیں...... نہیں ایسی بات

نہیں" اس نے مجھے بہلایا۔

اس رات میں سارا وقت جاگتی رہی۔ ایک تو اجنبی شہر' دوسرا اتنا بڑا فریب، کبھی والدین کی طرف سے دل بُرا ہونے لگتا کبھی سوچتی کہ کسی طرح واپس چلی جاؤں۔ تصور میں اپنے والدین کا شرمندہ اور مایوس چہرہ بھائی بہنوں کی سرد نظریں، خاندان والوں کی تمسخرانہ ہنسی آجاتی، پھر ارادے ڈانوں ڈول ہونے لگتے۔ دل نے بھی کہا، جب ملازمہ سمجھ ہی لیا گیا ہے تو کیوں نہ اسی رشتے کا حق ادا کردیا جائے۔ اور میں اپنی ذات کی نفی کرکے امیر خان کی کنیز ہی بن گئی۔ کتنی بہاریں آئیں، کتنے پت جھڑ بیتے کتنے موسم گزرے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ گھر کے کام کاج کے علاوہ میں نے اپنے آپ کو اس کی خدمت کے لئے ہی وقف کردیا۔ دُکھ صرف اس بات کا تھا کہ میرے اپنوں نے مجھے اپنا مستقبل سنوارنے کی خاطر یوں بے مول کردیا تھا۔ کچھ عرصہ ٹھہر کر کم از کم معلومات تو لے لیتے۔ جب دل کا درد حد سے زیادہ بڑھ جاتا تو میں آنسو بہانے کی خاطر ٹیرس پہ چلی آتی۔ وہاں بیٹھ کر بہت ہلکی پھلکی ہوجاتی، پھر بہت دیر تک ان نظاروں میں گم رہتی۔ اتنا کچھ میں نے اس انسان کے لئے کیا مگر کیا مجال کہ اس نے مجھ سے ہمدردی کے دو بول بولے ہوں یا میرے کسی کام کو سراہا ہو۔ بلکہ ہر کام میں نقص ہی نکالتا رہا۔ اب تو اس کے بھائی بہن بھی آنے جانے لگے تھے۔ مفت کی ملازمہ جو مل گئی تھی۔ صرف کھانا اور فرمان جاری کرنا ان کا کام تھا اور امیر علی انہیں سامنے پاکر پھولے نہیں سماتا تھا۔ باقاعدہ تیمارداری اور دیکھ بھال سے اس کی طبیعت بھی بہتر ہوگئی تھی۔

میں بھی گوشت پوست کا ایک انسان تھی میرے سینے میں بھی دل تھا۔ اس دل کو تو وہ میرا رہنے دیتا۔ شک کے نیزوں سے وہ ہمیشہ میرا وجود چھلنی کرتا رہا۔ ہر آئے گئے کے سامنے شیر کی طرح گھورتا رہتا۔ اول تو امیر خان گھر سے باہر بہت کم ہی جاتا تھا، اگر کبھی کسی انتہائی ضروری کام کے لیے جانا پڑتا تو واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھ گچھ شروع ہوجاتی۔ جیسے میں کسی کے ساتھ عیاشیاں کررہی تھی۔ بستر کی سلوٹوں سے لیکر ڈسٹ بن تک کی چھان بین کرتا کہ کوئی ثبوت ہی مل جائے۔ مجھے اکیلے کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کبھی کہیں جانا ہوتا تو اپنی بہن یا بھائی کے ساتھ بھیجتا تھا۔ حالانکہ اس کی بہنیں بھائی، بھتیجیاں، بھانجیاں سکرٹ بلاؤز ٹراؤزر میں ملبوس شتر بے مہار کی طرح جدھر منہ آتا نکل جاتیں۔ افتخار احمد کو مجھے لانے ایئرپورٹ بھیج دیا گیا تھا مگر اب مجھے اس کے سامنے بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی سے اپنا درد بیان کرسکتی اور نہ کسی کی خوشیوں میں شریک ہوسکتی تھی، کاغذ قلم استعمال کرنے کی اجازت تھی نہ ہی فون۔ بابا یا ماں جی کا فون آتا تو اسی لینڈ لائن فون پر جو امیر خان کے سرہانے پڑا ہوتا۔ اس پر بھی سپیکر آن کردیتا تاکہ ادھر کی باتیں میرے ساتھ وہ بھی سُن سکے۔

وہ ایک دھندلی سی شام تھی۔ کئی دنوں سے برفباری کا سلسلہ جاری تھا، سردیاں عروج پر تھیں۔ امیر خان کی طبیعت پچھلے کئی دنوں سے گری گری سی تھی۔ اس کے بھائی بہنیں سرشام ہی آکر اسے دیکھ گئے تھے۔ اچانک رات کو اس کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ میں نے ڈاکٹر کو فون کرنا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ کچھ دیر کے بعد ہی افتخار احمد ڈاکٹر کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ شاید امیر خان نے ہی اسے فون کیا تھا۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیاں لکھ کردی تھیں ڈاکٹر کے ساتھ افتخار نسخے لیکر نکل گیا۔ بہت دیر کے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس

کے آنے پر میں باہر آ گئی، باہر آتے ہوئے مجھے افتخار کی آواز سنائی دی۔ ”دیکھو خان صاحب! زندگی اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں کب کس وقت کون چلا جائے انسان کو کچھ علم نہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ اب اپنی بچی کچی جائیداد وغیرہ کی وصیت کر دو، ورنہ بعد میں بڑا مسئلہ بنے گا“ میں تجسس کے مارے دروازے کی آڑ میں ہو گئی۔ ”کیا ....وصیت کروں جو کچھ ہے وہ میرے بھائی بہن کے کام آئے گا، اور کچھ اس میں سے اس غریب مسکین کو دینا چاہیں تو دیں گے ان کی مرضی“۔ گویا وہ اب بھی انہیں ہی نوازنا چاہ رہا تھا۔ جنہوں نے ضرورت کے وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک بار پھر میں آسمان سے زمین پر آ گئی۔ زندگی کے اتنے سال اس کی خدمت کرتے رہنے کے بعد بھی میں اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں بنا سکی تھی۔ اس پہ ستم یہ کہ وہ کوئی میرا ہم عمر اور صحتمند انسان نہیں تھا۔ اس نے سب کچھ پوشیدہ رکھ کر یہ شادی کی تھی اور حیرت اس بات پر کہ وہ کوئی بے دین انسان بھی نہیں تھا۔ خواہ ماضی میں کچھ بھی رہا ہو۔ سچی بات ہے مجھے ایسے دیندار انسان سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ مگر جو کچھ وہ کہہ رہا تھا میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن رہی تھی۔

”لیکن...... کچھ ان کے لئے بھی ہونا چاہیے تھا“ اس نے ایک بار پھر میری حمایت کی۔ ”یہ کیا کم ہے کہ وہ امریکہ جیسے بڑے شہر میں عیش کر رہی ہے۔ وہاں اس کے والدین کو بھی میں نے بہت کچھ دے دیا ہے“۔ شاید افتخار احمد کے پاس امیر خان کے اس جواب کے بعد کچھ بھی کہنے کو نہیں رہ گیا تھا۔

اس کی طبیعت کئی دنوں تک گرتی سنبھلتی رہی۔ جیسے چراغ بجھنے سے پہلے کئی دفعہ پھڑ پھڑاتا ہے۔ اسی طرح جلتے بجھتے وہ ایک دن بالکل بجھ گیا۔ اب مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ میرا سائبان تھا۔ نام نہاد ہی سہی سائبان تو تھا جس کے نیچے میں زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ تھی۔ امیر خان کے انتقال کے بعد اس کے گھر والوں نے طرح طرح کی باتیں شروع کر دیں۔ بیمار تو وہ پہلے ہی تھا اس بات کا الزام تو وہ مجھے دے ہی نہیں سکتے تھے البتہ اس کی موت کا ذمہ دار مجھے ہی ٹھہرا دیا گیا کہ میں نے اس کی صحیح دیکھ بھال نہیں کی۔ مجھے پتھر مارنے والوں میں افتخار احمد بھی شامل تھا جو میرے ایک ایک پل کے عذاب کا گواہ تھا۔ عدت پوری ہونے کے دوسرے ہی روز امیر خان کے بھائی بہنیں آ گئے۔ ”چلو نکلو بڑے عیش کر لئے“ میری بڑی نند نے نفرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ چھوٹی سامان نکلوانے کے لئے مری جا رہی تھی۔ ”دیکھنا زیور زیورات پر بھی دھیان رکھنا“۔ میں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح اس گھر کے در و دیوار پر نظر دوڑائی۔ تب نجانے کہاں سے افتخار احمد آ گئے ”یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے حیرت سے سب کی طرف دیکھا۔ ”کیوں؟ اب یہ یہاں رہ کر کیا کریں گی“ بھابی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر یہ گھر اس کا تو نہیں کہ محترمہ یہیں ٹانگیں پھیلائے پڑی رہیں گی“۔ اس کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔

”یہ کہیں نہیں جائے گی، یہیں رہے گی“ اس نے بڑے رسان سے کہا۔ پہلے تو سب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ”کیا؟“ پھر بیک وقت سب کے منہ سے نکلا۔ ہر آنکھ میں سوالات تھے۔ ”امیر خان نے مرتے وقت یہ مکان، گاڑی اور بینک میں جو کچھ بچ گیا تھا ان کے نام کر دیا تھا“۔ افتخار کے اس انکشاف پر ان لوگوں کے ساتھ میں بھی حیران ہو گئی۔ ”یہ نہیں ہو سکتا؟“ نصیر خان سمیت وہ سب

بے ہنگم ٹریفک والے 10 بدترین شہر

تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی نے دنیا بھر میں کئی مسائل پیدا کر دیے ہیں، ان میں ٹریفک کا مسئلہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ حال ہی میں ایک امریکی جریدے کی جانب سے دنیا کے 10 ایسے شہروں کی فہرست جاری کی گئی ہے جو بے ہنگم اور بڑھتی ہوئی ٹریفک کی وجہ سے شدید مسائل کا شکار ہیں۔ فہرست کے مطابق چین کا شہر بیجنگ ٹریفک کے حوالے سے دنیا کا بدترین شہر ہے جبکہ جنوبی کوریا کا شہر سیول، فرانس کا شہر پیرس اور اٹلی کا شہر روم بتدریج دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبر پر ہیں۔ بھارت کا شہر ممبئی بدترین ٹریفک کے حوالے سے پانچویں نمبر پر ہے جہاں گائے سمیت مختلف جانوروں کی وجہ سے ٹریفک کی صورتحال ابتر ہو چکی ہے۔ کینیڈا کا شہر ٹورنٹو، فلپائن کا دارالحکومت منیلا، نائیجیریا کا شہر لاگوس، منگولیا کا شہر یولان باتر اور یونان کا شہر ایتھنز بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

(مرسلہ: شفقت طاہرہ ورک۔ کراچی)

چلانے لگے۔ ”وہ تو کہتا تھا سب کچھ تم لوگوں کا ہے..... اور یہ بھی؟“ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”وہ بہت ہوشیار تھا، وہ تم لوگوں کو فریب دے کر کام نکالتا رہا۔ یہ رہے کاغذات“۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ”لیکن یہ کاغذات تمہارے پاس کیسے آئے؟“ نصیر خان اور اس کے بڑے بھنوئی کامل خان کو اب تک یقین نہیں آرہا تھا۔ ”کل ہی وکیل یہ مجھے دے گیا تھا۔“ اس نے کاغذات ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اب تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی شک کی، اس لیے سب بے نیل و مرام واپس لوٹ گئے۔ اب وہاں صرف میں، افتخار احمد اور چوکیدار رہ گئے تھے۔ افتخار نے بھی شاید اس طرح اکیلے میں میرے پاس رہ کر ان کے شک کو ہوا نہیں دینا چاہی اور فائل مجھے پکڑا کر چند اہم باتیں بتاتا ہوا اسی وقت گھر سے نکل گیا۔

مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ سچ کہتے ہیں اس کائنات کا خالق پل میں بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا دیتا ہے۔ اس نے پہلے مجھے عرش سے فرش پر پھینکا اور پھر فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا۔ اب یہ سب میرا تھا ......صرف میرا...... افتخار نے خطرے کے پیش نظر پہلے کی طرح سیکورٹی انتظام بھی رہنے دیا تھا۔ اب کسی کو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے دس دفعہ سوچنا تھا۔

کتنے ہی روکھے پھیکے دن یونہی گزر گئے۔ میں روز اس ٹیرس پہ کھڑی ہو کر منصوبے بناتی رہتی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ واپس لوٹ جاؤں یا یہیں زندگی گزارنی چاہیے، اب تو یہ سب میرا تھا۔ پھر افتخار احمد بھی کئی بار ڈھکے چھپے لفظوں میں کچھ باتوں کا اظہار کر چکا تھا۔ مگر ......اسے تو ...... یہاں رہنا تھا...... اور میں، میرا تو صرف جسم یہاں تھا۔ مگر روح تو اب تک وہیں میرے ملک کے اسی شہر میں ہی قیام پذیر تھی جہاں میں پیدا ہوئی۔ پلی بڑی تھی۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہاں کا ایک ایک منظر میرے ذہن کے پردے پر نقش تھا۔ میرے کانوں میں اب بھی میرے ہم وطنوں کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ امیر نے کئی بار مجھ سے پوچھا تھا، یہ تم بار بار چونک کیوں جاتی ہو، کہاں گم رہتی ہو؟۔ میں اسے کیا بتاتی۔

آج پھر افتخار احمد آیا تھا، وہی سوال لیے۔

"ہاں! تو کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"میں جا رہی ہوں"۔ میرے سپاٹ لہجے میں اعتماد تھا مگر ساتھ ہی آنکھوں میں ایک بے نام سی اُداسی اُتر آئی تھی۔ "میں اپنے شہر اپنے ملک واپس جا رہی ہوں۔"

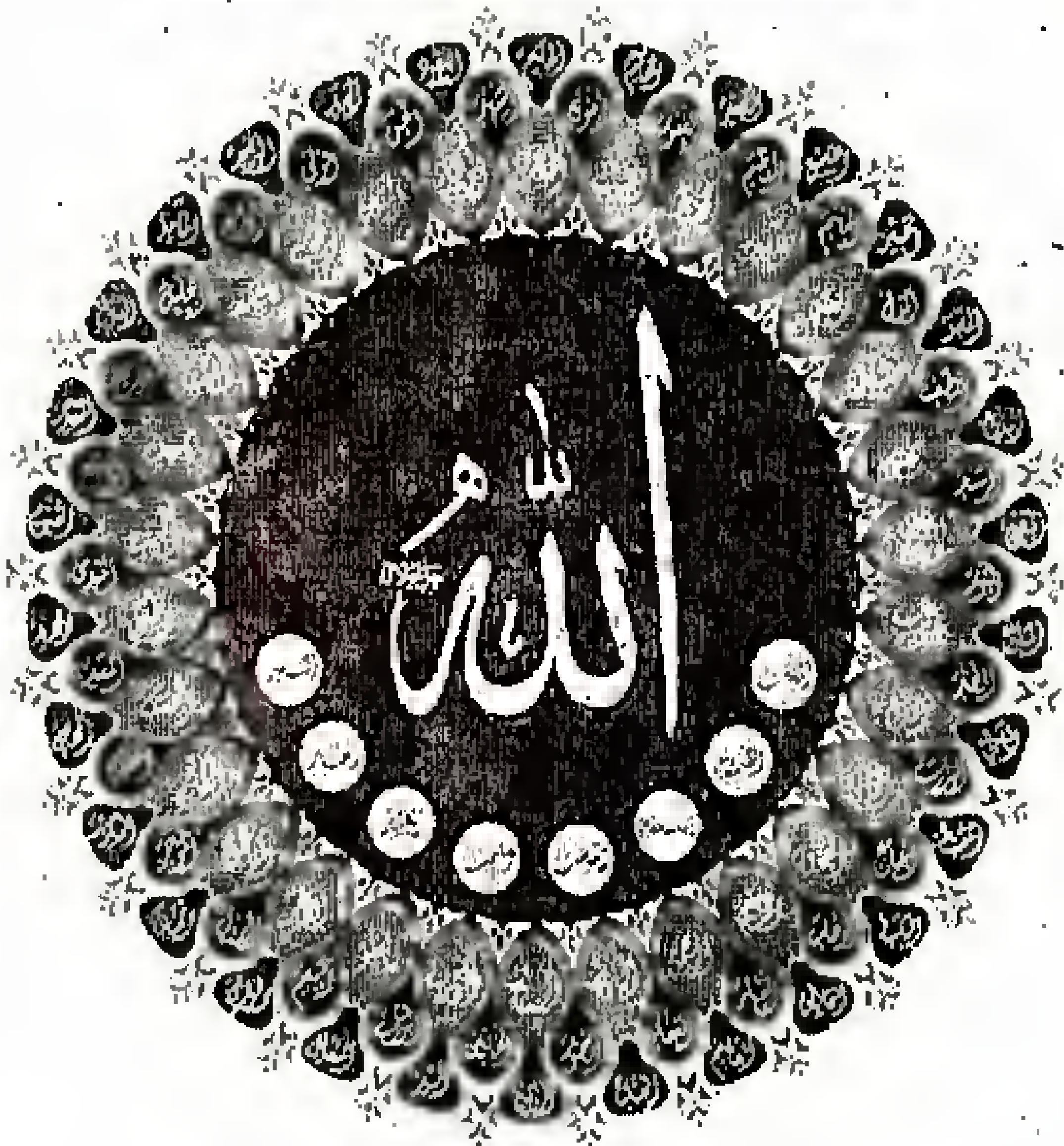
"لیکن ...... اب وہاں جا کر کیا کریں گی آپ! آپ کے والدین بھی نہیں رہے، بھائی بہنوں کی شادیاں ہو گئیں ...... اور ...... پھر ...... پھر آپ کو تو یہ جگہ بہت بھاتی تھی۔ یہ گھر یہ دلکش نظارے بہت اچھے لگتے تھے آپ کو" آخر میں اس نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر ہمارے ملک میں بھی ایسے مناظر کی کمی نہیں ہے، رہ گئی گھر کی بات، تو ایسا گھر وہاں بھی بن سکتا ہے مگر میرا ملک میرا شہر یہاں نہیں آ سکتا۔ آپ اس مکان کی قیمت لگوائیں اور میرے جانے کا بندوبست کریں"۔ میرا حتمی فیصلہ سن کر وہ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گیا۔ مکان کی فروخت سے لے کر میرے پاکستان آنے تک کے سارے انتظامات اسی نے مکمل کیے تھے۔ اس وقت وہ مجھے ڈیپارچر لاؤنج میں چھوڑ کر نہ جانے کدھر نکل گیا تھا۔ میں اس سرزمین کو چھوڑنے سے پہلے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ پتہ نہیں کس طرح اس نے مکان اور دیگر اشیا کے کاغذات میرے نام کروائے تھے ورنہ امیر خان تو ان باتوں سے منکر رہا تھا۔ پرواز کی روانگی کا اعلان ہوا تو اس کے آنے کی امید بھی ختم ہو گئی۔ آنے جانے والے چہروں کو دیکھتے ہوئے میں شکستہ قدموں سے جہاز میں سوار ہو کر اپنی سیٹ تک پہنچی۔ ایک پھانس سی دل میں چبھ رہی تھی۔ غم اور خوشی بیک وقت دونوں کیفیتوں سے دوچار تھی۔ کیا میں امیر خان کو یاد کر کے غمزدہ ہو رہی تھی لیکن اس نے مجھے دیا کیا تھا، نہ ازدواجی خوشیاں نہ آل نہ اولاد ...... بلکہ آخری وقت تک مجھے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ میری زندگی کے پندرہ ہنستے مسکراتے سال اس نے کھالیے تو پھر میں اسے یاد کر کے غمزدہ کیوں ہو رہی تھی۔ دوسری طرف اپنے وطن اپنی مٹی کی طرف لوٹنے کی خوشی تھی، گو کہ اب وہاں بھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔ والدین جیسی ہستی اب باقی نہ رہی تھی۔ لیکن پھر بھی تھا تو میرا وطن، جس کے ایک ایک ذرے سے جسم و جاں کا رشتہ جڑا ہوتا ہے۔ پھر یہ پھانس کیسی تھی جو مجھے بے چین کر رہی تھی۔ میں اس وقت تک اپنی اس بے کلی کا کھوج لگاتی رہی جب تک کہ جہاز نے اُڑان نہ بھر لی۔

پھر دل میں خیال آیا کہ شاید میری اُداسی اور بے کل کیفیت اس شخص کی وجہ سے تو نہیں جس نے مجھے ڈیڈیا بھی اور بھنور سے نکلنے میں میری مدد بھی کی۔ اور میں تو اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔ تب ہی مجھے اپنے برابر ایک مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ مڑتے ہی حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ "آپ ...... آپ ...... یہاں" دل ایک خوشگوار انداز میں دھڑکا۔ "میں نے آپ کو بہت ڈھونڈا"۔ کچھ دیر کے بعد میں اپنی حیرت پہ قابو پاتے ہوئے بولی۔ "لیکن آپ مجھے ڈھونڈ کیوں رہی تھیں؟"۔ افتخار احمد کی آنکھوں میں شرارت کا عکس نمایاں نظر آ رہا تھا ...... "لیکن آپ کہاں؟ اور کیوں جا رہے ہیں اچانک مجھے یاد آیا آپ تو غالباً یہاں" ...... "ہاں! یہاں رہتا تھا" اس نے میری بات پوری ہونے سے پہلے کہا "مگر اب نہیں"، "کیا مطلب" میں گڑبڑائی۔ "گھر کہیں بھی بن سکتے ہیں مگر شہر تو کہیں نہیں جا سکتا۔" اس نے مسکراتے ہوئے میری ہی بات مجھے لوٹا دی۔

......❀......❀......

اسماء الحسنٰی کامیابی کا راستہ

پیر شاہ محمد قادری



○ زندگی کے تمام معاملات میں مسلسل ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔ ہر طرف سے مایوسی کا شکار ہوں۔ کسی کے لئے کچھ کروں کوئی پزیرائی حاصل نہیں ہوتی، جس کے ساتھ نیکی کرتا ہوں۔ بدی ملتی ہے، شادی میں تاخیر ہے کیونکہ تنخواہ اتنی کم ہے کہ بیوی بچوں کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیا آپ میری کوئی راہ نمائی کرسکتے ہیں؟ (نصیر۔ ریالہ خورد)

☆ عزیزم! آپ کے طویل خط سے یہ بات ظاہر ہے کہ آپ تمام حالات اور واقعات کو اپنی رائے اور ضرورت کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ آپ کے تمام فیصلے مشروط ہو جاتے ہیں۔ میں یہ کروں گا تو وہ یہ کرے گا۔ زندگی خلوص، محبت، ایثار

کے بغیر نامکمل ہے، آپ اپنی زندگی سے غرض کو نکال دیں ۔ بے لوث مدد کریں ۔ صرف مثبت احساس ہی زندگی میں خوشیاں عطا کرتا ہے آپ "یا سلام یا قدوس یا کریم یا اللہ" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف ۔ آپ کی زندگی کے حتمی رُخ اعتدال پر آجائیں گے۔

O میرے پانچ بچے ہیں اور سب کے سب انتہائی نالائق، ضدی، ہٹ دھرم ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان کو کس طرح کی تہذیب اور تربیت دوں کہ یہ انسان بن جائیں ۔ کوئی ایسا وظیفہ تجویز کر دیں کہ جس سے ان کے اندر تبدیلی پیدا ہو جائے اور وہ فرمانبردار ہو جائیں ۔ (ریحانہ خالد ۔ لاہور)

☆ بہن ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک ہم گھریلو تشدد پر قابو نہیں پائیں گے، بچوں کو عزت و احترام نہیں دیں گے، شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو فرد کی حیثیت سے تسلیم نہیں کریں گے، ہم کس طور سے بچوں کے بہترین انسان ہونے کی توقع کر سکتے ہیں ۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ تحمل اور بردباری کو اپناؤ، خوش اسلوبی سے گفتگو کرو، لیکن جو ماحول ہم بچوں کو دے رہے ہیں وہ نا تو دین کے مطابق اور نہ ہی اخلاقی معیار پر پورا اُترتا ہے ۔ باپ سگریٹ پیتا ہے اور بچے کو سگریٹ پینے پر دھنائی کر دیتا ہے، شوہر بیوی سے تنخواہ چھپاتے ہوئے اس سے سب کچھ بتانے کی توقع کرتا ہے۔ ساس داماد کو گرویدہ بنانے اور بہو کو پیر کی جوتی بنانے کے گر سیکھنے میں لگی رہتی ہے، کیا ہم اس سے بے خبر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہے ہیں علیم و خبیر اللہ سب جاننے والا ہے اور ہم یہ جاننے کے باوجود اس کی نافرمانی کر کے اپنی اولاد کو فرمانبردار دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہر نماز کے بعد 500 مرتبہ "یا ھادی یا کریم" پڑھ کر دعا کریں۔ گفتگو میں نرمی اختیار کریں۔

O جیسا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاکستان کے حالات امن و امان، بیروزگاری کے باعث خراب ہوتے جا رہے ہیں، لہٰذا میں بیرون ملک جانا چاہتا ہوں تاکہ میرے حالات بہتر ہو جائیں۔ مجھے کوئی اسم الٰہی تجویز فرما دیں۔ آپ کا سورۃ التغابن کا آرٹیکل بہت اچھا تھا۔ کیا ہم ان میں سے کسی عمل کو اپنی ضرورت کے مطابق پڑھ سکتے ہیں؟ (احمد فرقان ۔ فیصل آباد)

☆ عزیزم! یقیناً ملک کے حالات بہت مخدوش ہیں لیکن اگر گھر کو سہارے کی ضرورت ہو تو کیا اسے چھوڑا جاتا ہے، انگریزی کہاوت ہے کہ جب جہاز ڈوبنے لگتا ہے تو سب سے پہلے چوہے بھاگتے ہیں۔ ہم اپنے نوجوانوں سے، صاحب فہم و ذکاء سے کہتے ہیں کہ وطن عزیز کو بیچ منجدھار میں نہ چھوڑیں ۔ بہادر بنیں اور ہر سطح پر ملک کی ترقی میں ہاتھ بٹائیں ۔ آپ ہر نماز کے بعد 240 مرتبہ "یا وہاب یا مانع یا رزاق یا فتاح" پڑھ کر دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ اسباب مہیا کر دیں گے۔ ان شاء اللہ

O پیر صاحب اکثر آپ کی خبریں اور آرٹیکل اخبار میں پڑھتا رہتا ہوں ۔ میرا ایک سوال ہے کہ ہر چیز اگر مقدر میں لکھ دی گئی ہے تو پھر دعا اور جدوجہد کی کیا ضرورت ہے؟ ہر شئے کو ایک خاص سطح تک رہنا ہے تو پھر بھاگ دوڑ کاہے کو کی جائے، امید ہے کہ آپ نے بُرا نہیں مانا ہوگا۔ (محمد ندیم ۔ گوجرانوالہ)

☆ ندیم میاں! اللہ تعالیٰ نے ہمیں محدود اختیارات اور لامحدود جدوجہد کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ ہمارے اعمال کے منطقی نتیجے ہی ہماری تقدیر بنتے ہیں ۔ لہٰذا جدوجہد نا صرف اپنی بقا بلکہ انفرادی اور اجتماعی ترقی کے لئے بھی ضروری ہے، اگر آپ ڈپریس، خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں تو دل جمعی سے نماز پڑھیں اور ہر نماز کے بعد "یا فتاح یا رافع"

313 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ معاملات آسان فرمائیں گے۔ان شاء اللہ

○ مجھے اولادِ نرینہ کی بہت آرزو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تین حور جیسی بیٹیاں عطا کی ہیں اب آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ نام باقی رہنے کے لئے ایک بیٹا عنایت کردیں۔ کوئی اسم الٰہی عطا کریں۔(فہد عرفان۔اسلام آباد)

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کی آرزو کو پورا فرمائے (آمین) لیکن نام کے لئے اولاد نہیں اچھے اعمال، افکار کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہمارے اور آپ کے آقا ﷺ کی صاحبزادی سے آپ ﷺ کی نسل پاک کا سلسلہ بڑھا۔ ابوجہل کے کتنے بیٹے ہونے کے باوجود کون اس کی ذریت میں سے ہونے کا دعویٰ کرتا ہے؟ داتا گنج بخشؒ نے شادی نہیں کی تھی لیکن ان کی علمی، تبلیغی، روحانی اور دین کی کاوشوں نے ان کا نام زندہ و جاوید کردیا۔آپ ہر نماز کے بعد "یا کریم یا سلام یا وارث یا باقی" 313 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف، اللہ تعالیٰ آپ کو گوہر مقصود عطا فرمائیں گے۔ان شاء اللہ

○ کافی عرصے سے شدید ڈپریشن میں مبتلا ہوں۔ ہر وقت کچھ ہونے کا خوف، حادثے کا خوف ذہن پر طاری رہتا ہے۔ بچے اچھے خاصے بڑے ہیں وہ میری حالت پر کبھی افسردہ ہوتے ہیں کبھی چڑ جاتے ہیں۔لیکن میں کیا کروں۔ایک انجانا خوف دل کو لرزائے رکھتا ہے، میری بیگم بھی میری اس حالت سے بہت پریشان ہیں، کوئی ایسا اسم الٰہی تجویز کر دیجئے کہ میرے دل سے خوف نکل جائے۔(راشد محمود۔کراچی)

☆ برادرم! اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی پناہ میں رکھے اور ہر قسم کی بلاؤں، شر اور حادثات سے محفوظ رکھے(آمین) سیدنا علی مرتضیٰؓ کا ارشاد ہے کہ موت تمہاری حفاظت کرتی ہے جب تک کہ وقت نہیں آجاتا۔ایک صحابی جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے اوران کی عیادت کو ان کے دوست تشریف لائے تو انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "مجھے اپنی بیٹیوں کے خرچ اور معاملات کی فکر نہیں اس لئے کہ میں نے اپنی بچیوں کو سورۂ بقرہ سکھا دی ہے۔" آپ بکثرت "یا سلام" پڑھا کریں اور ہر نماز کے بعد 115 مرتبہ "یا سلام یا حفیظ" پڑھ کر دعا کیا کریں۔

○ میرے بچے اچھے سکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ محنت بھی خوب کرتے ہیں لیکن امتحانات کے دوران پریشان ہو جاتے ہیں، ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں اور جو آتا ہے وہ بھی ذہن سے نکل جاتا ہے۔کوئی ایسا اسم الٰہی بتائیے کہ جس سے بچوں کا یہ تعلیمی مسئلہ حل ہو جائے۔(محمد سلیم۔رحیم یار خان)

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمارے بچوں کو دین و دنیا کے تمام امتحانات میں سرخرو فرمائے(آمین) ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ "سورۂ الم نشرح" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف۔

○ ہمارے پڑوس میں ایک خاتون رہتی ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کے ہاں بچی کی ولادت ہوئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اس نومولود بچی کو دودھ پلا رہی ہوں کہ اچانک میرا بیٹا آتا ہے اور کہتا ہے کہ امی ابو آگئے ہیں میں گھبرا کر بچی کو گود سے اتار کر جلدی سے گھر آجاتی ہوں اور ڈرتی ہوں کہ میرے شوہر کو پتا نا چل جائے پھر آنکھ کھل جاتی ہے ایسے خواب مجھے اکثر آتے ہیں حالانکہ میرے اپنے پیارے پیارے بچے ہیں اور کوئی پریشانی بھی نہیں ہے۔(حفصہ سلطانہ۔کراچی)

☆ عزیز بہن! یوں لگتا ہے کہ آپ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اخراجات کرتی ہیں جس کے باعث

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  پریمیم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

آپ ذاتی طور پر مالی مسائل کا شکار ہو جاتی ہیں، شوہر کی اجازت کے بغیر اس کی کمائی کو گھر سے باہر غیروں پر خرچ کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس طرز عمل کو ترک کر دیں آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہر نماز کے بعد 300 مرتبہ ''یا قدوس'' پڑھا کریں اللہ تعالیٰ ہم سب کو آسانیاں عطا فرمائے۔ آمین

○ سورۃ التغابن کے اعمال اور فضیلت کے متعلق بتا دیجیے؟ (مومنہ عمران۔ لاہور)

☆ قرآن پاک مومنوں کے لئے شفا ہے یہ اللہ کا فرمان ہے۔ اس سورہ میں جو فضائل بیان کئے گئے ہیں ان کے مطابق ہم دینی اور دنیاوی معاملات میں آگے بیان کردہ وظائف سے مستفیض ہو سکتے ہیں (وما توفیقی الا باللہ)

بچیوں کی شادی

جو والدین اپنی بچیوں کی شادی کے مسئلہ پر بہت پریشان ہوں۔ شادی کے لئے رشتہ کہیں بھی، کسی بھی وجہ سے طے نہ پاتا ہو یا ہو کر ٹوٹ جاتا ہو تو اس کے لئے مندرجہ ذیل عمل بے حد فائدہ مند ثابت ہو گا۔

اس مقصد کے لئے لڑکی کے والدین میں سے کوئی ایک بعد نماز عشاء یا بعد نماز تہجد دو رکعت نماز اس طریق سے پڑھیں کہ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ التغابن ایک مرتبہ پڑھیں۔ سلام پھیرنے کے بعد اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگیں۔ بفضل تعالیٰ سات یوم کے مسلسل عمل سے کہیں نہ کہیں رشتہ طے ہو جائے گا (ان شاء اللہ تعالیٰ) اچھے رشتے کے لئے یہ عمل اکیس یوم تک کریں اور ادارہ سے لوح شرف زہرہ منگوالیں۔

جو اس سلسلے میں اکسیر کا اثر رکھتی ہے۔ سورۃ تغابن کو زبانی یاد کر لیں تاکہ ادائیگی نماز میں سہولت رہے۔ (اس عمل کو بغیر اجازت نہ کریں)

وسعت رزق

رزق کی تنگی دور کرنے اور کشائش رزق کے لئے یہ عمل بہت مفید ہے۔

اس مقصد کے لئے پریشان حال شخص اپنا روز کا معمول یہ بنالے کہ بعد نماز عشاء اسی جگہ بیٹھ کر تین بار سورۃ تغابن اول و آخر درود شریف سات سات مرتبہ پڑھ کر اللہ کے حضور دعا مانگا کریں۔ اس عمل کی بدولت ان کے رزق کی تنگی رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی (ان شاء اللہ) اور جلد ہی وہ بے حساب رزق کمانے والوں میں شمار ہوں گے اور یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ بے گمان رزق کہاں سے آتا ہے۔

حفاظت آسیب و بلا اور خوف جنات

جس شخص کو کسی ایسی جگہ رہنے کا اتفاق ہو یا کسی سنسان راہ سے گزر ہو اور آسیب و بلا، جنات کے خوف اور راستے کی آفات سے محفوظ رہنا چاہتا ہو تو حسب ذیل عمل اختیار کرے۔

اس مقصد کے لئے باوضو ہو کر ایک مرتبہ سورۃ تغابن اول و آخر درود شریف تین تین مرتبہ پڑھ کر اپنے پورے جسم پر دم کرے اور پھر سورۃ تغابن پڑھتا ہوا اس راہ سے گزرتا چلا جائے۔ ان شاء اللہ ہر قسم کے آسیب، جنات اور بلاؤں کے شر سے محفوظ و مامون رہے گا۔ (عمل شروع کرنے سے پہلے اجازت لے لیجیے)

پیر شاہ محمد قادری B-359، فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان
فون نمبر: 35167842-35168036-42-92+
بذریعہ خط جواب کے لئے جوابی لفافہ ہمراہ ارسال کریں۔

آخری لمحہ



مشتری چلائی اور اس نے انور سے مجھے چھوڑنے کو کہا لیکن انور پر دولت کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ احساسِ جرم اور اس کے افشا ہونے پر اس کے اندر اتنی طاقت آ گئی تھی کہ کوشش کے باوجود میں اپنی گردن نہ چھڑا سکا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ ایک ہاتھ سے وہ میری گردن دبوچے دوسرے ہاتھ سے مجھے گھونسے مار رہا تھا۔

ایک بازاری عورت کی کہانی، وہ اپنی محبت کی تذلیل برداشت نہ کر سکی۔

جب انسان خوش قسمتی اور بدنصیبی کے درمیان مقدر کے تنے ہوئے رستے پر مسلسل چل رہا ہو، پل پل بدلتے حالات اس موڑ پر لے آئیں کہ بالآخر وہ بھرے میلہ میں متوازن رہنے کی کوشش کے آخری لمحے پر رستے سے چھلانگ لگانے پر مجبور ہو جائے آپ اسے کیا کہیں گے۔ موت کی خواہش یا پُرامن نئی زندگی۔

لیکن میرا ذاتی خیال قدرے مختلف ہے۔ ناامیدی کے سمندر میں کنارے کی تلاش بہرحال زندگی کا ایک روشن پہلو تو ہے چاہے ساری عمر ہی اس میں گزر جائے۔ یہی حال کچھ ان دنوں میرا تھا۔ میں نے بچپن ہی سے غربت کے ساتھ سمجھوتہ نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ منزل کٹھن تو ضرور تھی لیکن





میں ابھی مایوس نہ ہوا تھا۔

ان دنوں میں نے سرکاری ملازمین کے کوارٹرز میں ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا اور کچھ فاصلہ پر میرے اخبار کا دفتر تھا۔ صبح دیر سے اٹھتا، تیار ہو کر نذیر ٹی سٹال سے صبح کا ناشتہ کرتا اور پھر دفتر کی طرف چل پڑتا۔

میں تیز قدموں سے اپنی رفتار کو بڑھاتا ہوا ٹھنڈی سڑک عبور کر رہا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے بالے نے مجھے آواز دی۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ساتھ آگے آنے کو کہا۔ میں دراصل رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ بالے نے چلتے چلتے میرا حال پوچھا اور شام کو نذیر ٹی سٹال پر چائے کی دعوت دے دی۔

مجھے یہ احساس مارے جا رہا تھا کہ آج شاید اخبار میں میرا آخری دن ہوگا کیونکہ ایڈیٹر ذکاء الدین نے مجھے کل شام ہی وارننگ دی تھی کہ اگر کل بھی دیر سے آئے تو اپنی نوکری کا آخری دن سمجھنا۔ لہٰذا بالے کی دعوت پر میں فوری طور پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کر سکا اور ہوں، ہاں ہی کرتا رہا لیکن اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے دیکھ کر مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ ملاقات ضرور ہوگی۔

محمد اقبال جسے محلہ میں سب لوگ بالے کے نام سے جانتے تھے کو میں بہت زیادہ تو نہیں جانتا تھا لیکن جو کچھ اِدھر اُدھر سے معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ وہ اس میدان میں کچھ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ تاہم اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ عورتوں کی دلالی کرتا ہے۔

ان دنوں میں اچھی خاصی مالی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ ایک تو قلیل تنخواہ اور کمرے کا بڑھتا ہوا کرایہ اور بل وغیرہ اور روزمرہ کے اخراجات الگ۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ زندگی کی بھاگ دوڑ میں

بہرحال شاید اس دن قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ایڈیٹر ذکاء الدین حسبِ معمول اپنی سیٹ پر براجمان کاغذوں کے ڈھیر میں اپنی قسمت کا ستارہ ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے میری آمد کو محسوس تو کیا لیکن خاموش رہے بلکہ ایک پلندہ میری طرف کھسکا کر مسکرانے لگے جواباً مجھے بھی مسکرانا پڑا۔

"آج بہت خوش اور مسکرا رہے ہو" انہوں نے خوشدلی سے سوال داغ دیا۔

"جی ہاں! آج بالے نے شام کو پانچ بجے چائے کی دعوت دی ہے، اس لیے خوش ہوں" میں نے ازراہِ تفنن ہلکے پھلکے انداز میں انہیں چھیڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسی دعوتیں وہ کبھی رد نہ کرتے تھے اور میں کبھی قبول نہ کرتا تھا۔ وہ تو سمجھا جلدی میں سب کچھ ہوگیا۔

"تو چلو ٹھیک ہے، میں بھی ساتھ چلوں گا' مجھے تمہاری دعوت قبول ہے"۔ انہوں نے دعوت اس طرح قبول فرمائی کہ میری روح فنا ہوگئی۔ بہرحال قہر درویش برجان درویش۔ چونکہ انہوں نے کافی دنوں سے مجھے دباؤ میں رکھا تھا لہٰذا اس سرکاری دباؤ کو ختم کرنے کے لیے میں نے جواباً منع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

شام کے سائے جب لمبے ہونے لگے تو مجھے اچانک بالے کی دعوت یاد آئی۔ وقت دیکھا تو تقریباً پانچ ہی بج رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اپنے کاغذات کو سنبھالا اور ذکاء الدین کی طرف دیکھا تو وہ کسی خاتون سے فون پر باتیں کر رہے تھے۔

باتیں کیا تھیں، بس یکطرفہ داستانِ عشق تھی جو مجھے تو ازبر ہو چکی تھی اور یہ ان کا کمال تھا کہ کام کی زیادتی میں بھی وہ عشق کے لیے کچھ وقت نکال لیتے تھے۔

میں نے انہیں اپنی کلائی کی طرف گھڑی دکھاتے ہوئے اشارہ کیا تو انہوں نے جلدی سے سر ہلایا اور

"لو میں تو بھول ہی گیا تھا کہ آج تم نے چائے کی دعوت دی ہے" ذکاء الدین جیسا ذہین اور فطین شخص آج تک میری نظروں سے نہ گزرا ہوگا۔ اس قدر خوبصورتی کے ساتھ بات کو اپنی مرضی کے مطلب پہنانے میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ اب بالے کی دعوت خودبخود میری دعوت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ خوف مجھے یہ تھا کہ ساتھ میں انہوں نے رات کا کھانا بھی اسی طرح قبول فرمالینا ہے کہ میری ایک ہفتہ کی تنخواہ تو اس پر اٹھ جاتی۔ اب کچھ نہ ہو سکتا تھا لہٰذا ان کا ساتھ دینے میں ہی عافیت تھی۔

ہم دونوں جب دفتر سے نکلے تو پانچ سے اوپر کا وقت تھا چونکہ فاصلہ زیادہ نہ تھا اور ذکاء الدین کی "حسینہ" مٹی میں اٹی اپنے ٹائروں پر صدیوں کی دھول جمائے سڑک کے پارفٹ پاتھ کے ساتھ ایستادہ تھی جسے وہ بزعم نشاط "میری جان" کہتے تھے اور دفتر والوں نے اس کا نام "حسینہ" رکھ چھوڑا تھا۔ حسینہ کا کوئی دروازہ باہر سے نہ کھلتا تھا۔ وہ چابی سے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے، دھم سے سیٹ پر براجمان ہوتے، اپنی سانس درست کرتے اور پھر باری باری اندر سے تمام دروازے کھولتے۔

اس بار بھی یہی مشق دہرائی جانی تھی لیکن بدقسمتی سے پہلا قدم ہی بوجھل ہو گیا۔ کافی دیر تک چابی چاروں طرف گھمانے کے باوجود دروازہ نہ کھلا۔ میں گاڑی کی دوسری طرف کھڑا اٹکل دیکھ رہا تھا۔ جب ذکاء الدین کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوتے دیکھے تو میں ان کی طرف چلا گیا اور ان کے ہاتھ سے چابی لے کر خود دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

ذکاء الدین نے دوبارہ چابی تھامی اور قدرے غصے سے ایک جھٹکا دیتے ہوئے دروازے کے ہینڈل کو خوب جھنجھوڑا مگر آج "میری جان" نے ہاں کرنے سے انکار کر دیا۔

اسی اثناء میں ایک چمکدار ہلکے نیلے رنگ کی گاڑی کو اپنے پاس رکتے دیکھا۔ جھانکا تو معلوم ہوا کہ بالا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہاتھ سے اشارے کر رہا تھا۔ میں نے فوراً ذکاء الدین کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بھی شاید بالے کو دیکھ لیا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ انہوں نے جھٹ سے اگلی نشست کا دروازہ کھولا اور دھم سے حسب عادت بیٹھ کر اپنی سانس درست کرنے لگے۔ جب میں نے آناً فاناً یہ ہوتے دیکھا تو ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ کیوں نہ میں بھاگ لوں لیکن راستے مسدود تھے لہٰذا ارادہ ملتوی کیا اور پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

"شاعر صاحب" بالا ہمیشہ مجھے شاعر صاحب کہہ کر پکارتا تھا "میں نے سوچا کہ آپ کو دیر ہو گئی ہے تو کیوں نہ میں خود حاضر ہو جاؤں۔ یہ سوچ کر دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ نکل چکے ہیں۔ میں نے آپ دونوں کو سیڑھیوں سے ہی دیکھ لیا تھا کہ آپ کی گاڑی کا دروازہ نہیں کھل رہا تھا چنانچہ اپنی گاڑی نکال لایا ہوں"۔

میں نے اسے خاموش کرنے کے لیے ذکاء الدین کی طرف اشارہ کیا تو وہ کہنے لگا: "ہاں جی میں ذکاء الدین صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ہمارے مہربان ہیں۔ مشتری بائی کے اشعار کی اصلاح فرماتے تھے اور اس کے کوٹھے پر ملاقات بھی ہو چکی ہے بہت اچھے انسان ہیں"۔

یہ خبر میرے لیے ایک دھماکے سے کم نہ تھی لیکن میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا لیکن ذکاء الدین نے راز افشا ہوتے ہوئے خفت مٹانے کے انداز میں ایک زوردار دھپ بالے کے کندھے پر مارا اور کہا:۔

"اپنے شاعر صاحب بھی کچھ کم نہیں ہیں" ان کا اشارہ میری طرف تھا۔ "لیکن اپنی ملاقاتیں خفیہ رکھتے ہیں وہ تو اتفاق سے انہوں نے تمہارا نام لیا تو

میں نے سوچا آج پرانی یادیں تازہ کرلیں۔ تم سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور مشتری بائی کا حال بھی تم سے پوچھ لیں گے"۔

"ذکاء الدین صاحب! مشتری بائی کا نہ پوچھیں تو بہتر ہے" بالے نے قدرے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا مشتری بائی کو؟" ذکاء الدین حیرت سے بولے۔

"ذکاء الدین صاحب یہ ایک لمبی داستان ہے پھر کسی روز آپ کو سناؤں گا۔ مختصراً وہ منوں مٹی تلے دب چکی ہے۔ میرا مطلب کہ وہ مرگئی ہے" بالے کے چہرے پر غم کے سائے لہرا گئے۔

"لیکن کیسے؟ وہ کافی جوان اور صحت مند تھی" ذکاء الدین مزید حیرت زدہ ہوگئے۔

"یہی تو بات ہے، جب جوان اور خوبصورت قتالہ خود قتل ہو جائے تو بہت افسوس ہوتا ہے" بالے نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

گو کہ میں نے مشتری بائی کو کبھی نہ دیکھا تھا لیکن اس طرح سے اس کا ذکر ہوا تو میں بھی افسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ لمحہ بھر کو گاڑی میں سکوت ہوگیا۔ ہم تینوں چلتی گاڑی سے سڑک پر شام کی دھند میں مدھم روشن سٹریٹ لائٹ کے قمقمے قطار در قطار گزرتے دیکھ رہے تھے کہ نذیر ٹی سٹال آگیا۔ مشتری بائی کے ذکر سے ماحول کسی قدر سوگوار ہو چکا تھا۔ بالے نے چائے کا آرڈر دیا اور ساتھ ہی کچھ کھانے کے لیے لانے کا کاؤنٹر پر بیٹھے نذیر سے کہہ دیا اور ہم تینوں ایک میز پر براجمان ہوگئے۔

"ہاں تو کہو بالے تمہارا کام کیسے چل رہا ہے" ذکاء الدین نے گفتگو کی ڈور پکڑنے کی کوشش کی۔

ذکاء الدین صاحب! کیا بتاؤں۔ مشتری بائی کے مرنے کے بعد اب کام میں جی نہیں لگتا۔ یہ سمجھو کہ میں تقریباً اس کام سے توبہ کر چکا ہوں۔ اب مجھے ہر لڑکی مشتری بائی لگتی ہے۔ کیا شریف النفس عورت تھی"۔

"طوائف اور شریف؟" ذکاء الدین نے استفہامیہ انداز اختیار کیا "دونوں ایک ساتھ کیسے"۔

"ذکاء الدین صاحب! آپ یقین کریں مشتری بائی اندر سے ایک انتہائی شریف عورت تھی۔ آج تک کسی نے اس کے اندر جھانک کر نہ دیکھا تھا۔ یہ پیشہ تو اس نے وراثت میں پایا تھا۔ اسی طرح جس طرح دنیا میں اکثر لوگ وراثت میں پیشہ قبول کرتے ہیں۔ آپ تو شاعری کی اصلاح کرتے تھے کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا"۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو" ذکاء الدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "لیکن اس طرح ان لڑکیوں کا کیا بنے گا جو تم سے ہمیشہ منسلک رہی ہیں۔ انہیں تو اپنی بھوک مٹانی ہے"۔

"کس کی؟" بالے نے مسکرا کر پوچھا۔

"اپنی اور اپنے گاہکوں کی"۔

"ہاں کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں لیکن حالات نے یہاں لا کھڑا کر دیا ہے"۔

اتنے میں چائے آگئی تھی۔ میں نے ایک کپ کو سرکا کر نزدیک کر لیا۔ بھاپ اُٹھتی چائے کے کپ پر نظر جمائے بالے کی باتوں پر چشم تصور میں اپنے گاہکوں سے دور ہوتی ان لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔

"شاعر صاحب! آج آپ خاموش ہیں" بالے نے میری طرف کیک کا ٹکڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ اس معاملے میں بدنصیب کون ہے تم یا تمہاری لڑکیاں یا وہ گاہک جو اپنی بھوک مٹانے اس بازار میں چلے آتے ہیں"۔

میری فلسفیانہ گفتگو شاید بالے تو نہ سمجھ سکا لیکن ذکاء الدین نے فوراً ٹوکا۔

"یہ تو آپ نے ٹھیک کہا ہے" بالے نے ذکاء الدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اسی طرح طوفان میں گھری مشتری بائی اپنے ہاتھوں سے جان ہار بیٹھی"۔
"تم نے ابھی کہا ہے کہ وہ قتل کردی گئی ہے اور اب تم کچھ اور کہہ رہے ہو"۔ ذکاء الدین کے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھ کر بالے نے قدرے گھبرا سا گیا۔
"ذکاء الدین صاحب! سچ پوچھئے تو اس نے خودکشی کی ہے نہ وہ قتل ہوئی ہے"۔
"یہ صرف مقدر نے اس کے ساتھ کھیل کھیلا ہے۔ یہ صرف میں جانتا ہوں یا وہ قاتل"۔ بالے کو سچ بتانا پڑا۔
"اب میں آپ کو تمام واقعہ سنا دیتا ہوں اور فیصلہ آپ کریں" بالے نے ہلکی سی آہ بھرتے ہوئے کہا۔
سچ تو یہ ہے کہ مشتری بائی سے انور نامی ایک شخص محبت کا بہت بڑا دعویدار تھا۔ مشتری بھی اس پر جان دیتی تھی۔ دونوں بظاہر شادی کے خواہش مند تھے کیونکہ مشتری عزت کی زندگی گزارنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ میں نے کہا نا آپ سے کہ وہ اندر سے ایک شریف النفس عورت تھی لیکن اس کے گھر والے میرا مطلب کہ اس کی ماں یہ سنہری چڑیا اپنے ہاتھ سے اُڑانے پر تیار نہ تھی۔ مشتری کی ماں نے مجھے بھی تمام حالات بتائے اور مجھ سے مدد کی درخواست کی تھی۔ میں اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن کیا کرتا اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا کیونکہ میں بھی مشتری سے محبت کرتا تھا لیکن اس سے شادی نہ کرسکتا تھا۔ میں بازار کے اصولوں سے واقف تھا۔ میں ایسا کرتا تو قتل کردیا جاتا۔
یہ سوچ کر میں ایک دن مشتری کو سمجھانے کی غرض سے باہر لے گیا اور راستے بھر اس کو سمجھاتا رہا لیکن مشتری کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ یہ وہی دن تھا

نایاب مچھلی

انڈونیشیا کو اپنے ہزاروں خوبصورت جزائر اور سمندری مخلوق کی وجہ سے دنیا بھر میں منفرد پہچان حاصل ہے۔ سمندری مخلوق میں پرندوں جیسی شکل رکھنے والی مانتارے مچھلی کی خفیہ دنیا اب تک انسانوں کیلئے ایک معمہ ہی رہی ہے تاہم اب انڈونیشیا کا سمندر مانتارے مچھلی کی محفوظ پناہ گاہ بنتا جارہا ہے۔ انڈونیشیا میں ایک مانتارے مچھلی کی قیمت دس لاکھ ڈالر ہے۔ مانتارے نامی یہ مچھلی 23 فٹ تک لمبی ہوتی ہے جو زیر سمندر چھوٹی چھوٹی سمندری مخلوقات کو کھا کر گزارہ کرتی ہے۔ یہ مخصوص مچھلی کسی خاص گہرائی کے حامل سمندر میں نہیں رہتی بلکہ یہ ایک سمندر سے دوسرے سمندر میں ہجرت کرتی رہتی ہے۔ یہ مچھلی اکثر خود شارک مچھلیوں کا شکار ہوجاتی ہے۔
(مرسلہ: ندیم خان۔ کراچی)

جواھر پارے

تین واؤ (و) کو اپنائیں عزت پائیں۔
وقت' وعدہ' وفا
صحافیوں میں جب تک چھ (ک) کو نہ اپنایا جائے خبر نہیں بنتی۔
کیا' کیوں' کب' کیسے' کہاں' کتنے
غلام نبی عارف/لیہ

"چلو تم آگے بڑھو اور کسی ایک کی بدنصیبی ختم کردو۔ ارے شاعر صاحب! اس دنیا کا نظام اسی طرح چلتا ہے"۔
ہم سب بیک وقت خوش نصیبی اور بدنصیبی کے طوفان میں گھرے اپنی اپنی ذات کو ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں"۔

جب میں نے بھی اپنا حالِ دل اسے کہہ ڈالا لیکن مشتری کے دل پر تو انور کا راج تھا۔ وہ کسی قیمت پر اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی لیکن ایک عجیب بات اس دن ہوئی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں تو اس نے مجھ سے قسم لی کہ اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تم میرا ایک کام کرو۔ میں نے جذبات کی رو میں کہہ دیا کہ میں تو تمہارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی کہ تم اپنی گاڑی لے کر اگلے جمعہ کی صبح گھر آجانا میں تمہارے ساتھ چلوں گی اور پھر ہم بعد میں سوچیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

ہم دونوں بڑے انہماک سے بالے کو دیکھ رہے تھے۔ بالے کے چہرے پر کرب اور افسوس کے سائے ظاہر تھے لیکن ملال کسی طرح کا نہ تھا۔

چونکہ معاملہ دلچسپ بھی تھا۔ ذکاء الدین نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا "پھر تم گئے"۔

"ہاں جناب میں وعدہ کر چکا تھا" بالے نے کہا۔

میں اب پوری توجہ سے کہانی کے اگلے موڑ کا انتظار کر رہا تھا کہ بالے نے کہنا شروع کیا:۔

"میں جب اگلے جمعہ کی صبح اس کے ہاں پہنچا تو مشتری تیار تھی۔ ایک چھوٹا سا بیگ اس کے ہاتھ میں تھا جس میں شاید اس کے زیور اور کیش وغیرہ تھا"۔

"شاعر صاحب" اس نے پہلی دفعہ مجھے براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا "جب وہ میرے سامنے آئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر خوبصورت تھی۔ نکھری نکھری سی بغیر میک اپ کے، میں تو اسے ہمیشہ رات کے گہرے سایوں میں میک اپ کیے مدھم روشنی میں دیکھتا تھا۔ دن میں کبھی اتفاق ہی نہ ہوا تھا۔ شاعر صاحب! وہ ملکہ تھی ملکہ، آپ یقین کریں"۔

میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہونے لگا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھایا اور چل پڑے۔ مشتری نے مجھے بتایا کہ ہمیں پہلے گول قبرستان جانا ہے۔ میں چونکا کہ گول قبرستان؟ لیکن میں سرشاری میں کچھ بول نہ سکا۔ سوچا کہ شاید میرے ساتھ جانے سے پہلے اپنے کسی جدامجد کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتی ہے"۔

ابھی ہم قبرستان کے دروازے پر ہی تھے کہ مجھے انور نظر آیا۔ میں نے مشتری کی طرف دیکھا وہ مسکرائی اور رُکنے کو کہا، میں نے گاڑی روک لی۔ انور تیز قدموں سے چلتا ہوا گاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ ہم قبرستان آئیں گے۔

میں نے ساتھ بیٹھی مشتری کی طرف دیکھا۔ مشتری مسکرائی اور کہنے لگی "ہاں بالے میں نے انور کو بلایا ہے" مشتری کے چہرے پر اتنی رونق اور خوشی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں حیران تھا کہ مشتری میرے ساتھ بھاگ رہی ہے یا انور کے ساتھ۔ اتنی دیر میں انور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ میرے لیے یہ کچھ غیر متوقع تھا لیکن میں خاموش رہا۔ انور نے اندر بیٹھتے ہی سگریٹ سلگائی۔

"شاعر صاحب! آپ کو پتہ ہے کہ میں سگریٹ سے نفرت کرتا ہوں۔ اکثر آپ کو بھی منع کرتا رہا ہوں۔ آدمی دنیا بھر کے کام کرے لیکن سگریٹ نہ پیئے تو مجھے بخشا گیا ہے"۔ یہ اس کی ایک عجیب منطق تھی جو مجھے کبھی سمجھ میں نہ آئی۔ بہرحال اس بات پر میں نے اپنی سگریٹ سلگائی اور بالے کو اپنا بیان جاری رکھنے کو کہا۔

"ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ یہ میری انور سے پہلی اور آخری ملاقات تھی" بالے نے وہیں سے بات دوبارہ شروع کردی۔ گاڑی میں چند لمحے سکوت طاری رہا پھر مشتری نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور محبت سے بولی "بالے تم نے اپنی محبت ثابت کردی ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں اور ساری عمر

تمہیں یاد رکھوں گی۔ ایک محسن کی طرح تم نے میری عزت ......" انور شاید جلدی میں تھا۔ اس نے مشتری کی بات کاٹ دی اور پوچھا کیا تم وہ بیگ لے آئی ہو؟"۔

"ہاں! یہ رہا" یہ کہہ کر مشتری نے اپنی گود سے بیگ اٹھا کر انور کو پیچھے دے دیا۔

"شاعر صاحب! یہ وہ پہلا لمحہ تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ انور کس قماش کا آدمی ہے، آپ سمجھتے ہیں نا"۔

میں نے مشتری کو متنبہ کرنے کے لیے اشارہ کیا کہ وہ گاڑی سے باہر میری ایک بات سن لے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مشتری اپنی اندھی محبت میں ماری جائے۔ میں اس سے سچی محبت کرتا تھا اور اس کا مدد گار بھی تھا۔

انور نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن خاموش رہا۔ اتنے میں مشتری بولی" بالے، فکر نہ کرو، انور اپنا ہے جو کچھ کہنا ہے یہیں کہہ دو لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ انور کے سامنے نہ کہہ سکتا تھا۔ مجھے اس کی نیت کا فتور نظر آ گیا تھا۔ بازار میں رہتے ہوئے بازار کے دام معلوم رکھتا تھا۔ انور بھی کچھ سمجھ سا گیا تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا۔

اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے مشتری سے کہا کہ چلو نیچے اترو۔ ہم خود چلے جائیں گے۔

بس شاعر صاحب! یہ دوسرا لمحہ تھا کہ میں مشتری کو یوں لٹتے اور برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے بھرا ہوا پستول نکالا جو احتیاطاً اپنے ساتھ رکھتا تھا اور میں نے انور سے کہا کہ وہ مشتری کا بیگ واپس کرے اور گاڑی سے اتر جائے۔"

بالے نے قدرے میری طرف جھکتے ہوئے افسوس سے کہا۔

میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مشتری گھبرا گئی لیکن انور میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر بھی بالکل نہ گھبرایا۔ اس نے بڑھ کر پیچھے بیٹھے ہوئے ہی اپنے مضبوط بازو سے میری گردن دبوچ لی۔ میرا سانس رُکنے لگا۔ مشتری چلائی اور اس نے انور سے مجھے چھوڑنے کو کہا لیکن انور پر دولت کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ احساسِ جرم اور اس کے افشا ہونے پر اس کے اندر اتنی طاقت آ گئی تھی کہ کوشش کے باوجود میں اپنی گردن نہ چھڑا سکا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ ایک ہاتھ سے وہ میری گردن دبوچے دوسرے ہاتھ سے مجھے گھونسے مار رہا تھا۔ میں شدید مزاحمت تو کر رہا تھا لیکن میں اس کے پیچھے سے حملے میں پوری طرح گرفت میں آ چکا تھا۔

اس اثناء میں مشتری نے اچانک میرے پستول والے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر اپنے سینہ پر رکھ لیا اور چلا کر انور سے کہا کہ وہ مجھے چھوڑ دے ورنہ وہ اپنے آپ پر گولی چلا دے گی۔

انور نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا" مجھے تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے"۔

شاعر صاحب، یہی وہ آخری لمحہ تھا جب خوش قسمتی اور بدنصیبی کے طوفان میں بدبختی نے سر اٹھا لیا تھا۔

مشتری انور کی زبان سے محبت کی یہ تذلیل نہ سہہ سکی اور اس نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی سیدھے اس کے سینے میں اُتر گئی اور خون کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ یہ کہہ کر بالا خاموش ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا" مشتری نے پولیس کے سامنے اپنے نزعی بیان میں مجھے بچا لیا تھا۔ انور جیل میں زیورات چھیننے اور ارادہ قتل کے الزام کا سامنا کر رہا ہے اور اب آپ ہی کہیے کہ یہ خودکشی ہے یا قتل، بدنصیبی ہے یا خوش قسمتی۔



گمانِ وفا

ایک شخص کی دلگداز کہانی، جس نے جنت نظیر زندگی کا خواب دیکھا تھا

شوکت افضل



شوکت افضل حسب معمول اس بار بھی قارئین سیارہ ڈائجسٹ کے لیے ایک شاہکار کہانی لیکر آئی ہیں۔ یہ کہانی ایک ایسے شخص کی ہے جو شادی سے قبل ایک کھلنڈرا رئیس زادہ تھا مگر اُس نے ایک جنت نما ازدواجی زندگی کا خواب ضرور سجا رکھا تھا۔ تلاش بسیار کے بعد اُسے اپنی پسند کی شریک حیات تو مل گئی مگر شادی نے اُس کی زندگی یکسر تبدیل کر کے رکھ دی ہے...... کہانی کے کردار انتہائی مضبوط اور پلاٹ جاندار ہے، یہی وجہ ہے کہ قاری ایک بار پڑھنا شروع کرنے پر کہانی کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔

محسن کو پرنسپل کے آفس کے سامنے کھڑے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ چپڑاسی نے اسے اندر جانے کو کہا۔ وہ چار سالہ ننھے عاصم کی انگلی تھامے نہایت مؤدب انداز میں آفس میں داخل ہوا۔ اپنے خیال میں تو وہ ایک پختہ عمر کی موٹے شیشوں کی عینک لگائے ایک نہایت ہی سنجیدہ اور مدبر صورت ہیڈ مسٹریس کے سامنے جا رہا تھا مگر آفس ٹیبل کے پیچھے رکھی کرسی پر ایک نوجوان نرم و نازک سی حسین لڑکی

کو بیٹھا دیکھ کر چونک سا پڑا، جو کہ اپنے شوخ سراپے پر سنجیدگی کا خول چڑھائے مخروطی سفید انگلیوں میں فون کا ریسیور تھامے کسی سے بات کرنے میں مصروف تھی۔ اس کا باوقار انداز محسن کو کھلنے لگا گویا وہ یہ سب محض "پوز" کر رہی ہو۔ وہ ٹکٹکی باندھے دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اس نے فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ کر نہایت متانت سے اپنی دراز پلکیں اٹھا کر محسن کو دیکھا اور پھر ہاتھ سے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی:۔

"جی فرمایئے"۔

"وہ جی میڈم دراصل اس بچے کو میں نے نرسری میں داخل کروانا ہے"۔ وہ بیٹھ جانے کے بعد ننھے عاصم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، جو اس وقت اس کے گھٹنے سے لگا نہایت معصوم اور بھولی بھالی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

میڈم نے بات سنتے ہی گھنٹی پر ہاتھ مارا۔ چپڑاسی تیزی سے اندر داخل ہوا۔

"جی صاحب!" چپڑاسی نے مستعدی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو عبدالرشید کلرک سے داخلے کا فارم لے آؤ" میڈم کی بات سنتے ہی چپڑاسی تیزی سے باہر نکل گیا۔ تو محسن نے میڈم کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"معاف کیجئے گا میڈم کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ ہی ہیڈ مسٹریس ہیں؟"۔

"جی نہیں وہ رخصت پر ہیں" وہ محسن کی نظروں کی تمازت سے بچنے کے لیے دوسری طرف دیکھتے ہوئے مختصراً بولی اور پھر رجسٹر کھول کر سامنے رکھ لیا۔ چپڑاسی فارم لے کر آیا تو میڈم نے سرسری نگاہ سے دیکھتے ہوئے فارم محسن کے آگے سرکا دیا اور بولی۔

"پلیز! اس فارم پر مطلوبہ معلومات درج کر دیجئے"۔

"جی اچھا" محسن فارم کو ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا "آپ مس......؟" وہ مسکراتی ہوئی سوالیہ نظروں سے اسے گھور کر رہ گیا۔

"مس فرزانہ" ایک لاتعلق سے لہجے میں میڈم نے فقرہ مکمل کر دیا تو "اوہ" کہہ کر محسن زیر لب مسکراتے ہوئے خاموشی سے فارم بھرنے لگا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف کلاک کی ٹک ٹک وقت کے آگے سرکنے کا پتہ دے رہی تھی۔ جب فرزانہ نے رجسٹر بند کر کے نظر اوپر اٹھائی تو پھولے پھولے سرخ گالوں اور موٹی موٹی آنکھوں والے ننھے سے پیارے عاصم پر نظر جا پڑی جو اسے بغور دیکھے جا رہا تھا۔ اسے اس بچے پر بے تحاشا پیار آ گیا۔

"یہاں آؤ بیٹے کیا نام ہے آپ کا؟" وہ اسے پاس بلاتے ہوئے چمکار کر بولی۔

"عاصم" بچے نے قدرے شرما کر جواب دیا۔

"شاباش اوری گڈ بوائے، اچھا آپ ابھی اپنی کلاس میں جائیں گے؟"

مس فرزانہ کو عاصم سے باتیں کرتا سن کر محسن نے لکھتے ہوئے سر اٹھایا اور دیکھا کہ خوشنما چہرے سے متانت کا نقاب سرک کر اس پر مسکراہٹ کا گلاب کھل اٹھا ہے اور سرد آنکھوں سے پیار کی شعاع کوند کر تمام وجود کو منور کر گئی ہے۔ اس نے دلچسپی سے مس فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بھرا ہوا فارم اس کے آگے رکھ دیا۔ مس فرزانہ نے فارم پڑھنے کے بعد گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو بلایا اور بچے کے ساتھ نرسری کلاس تک جانے کو کہا۔ محسن نے محسوس کیا کہ اب پھر سنجیدگی اور اجنبیت کی برف سی مس فرزانہ کے چہرے پر جمنے لگی ہے۔

"اُف...... اس لڑکی کے بھی کتنے روپ ہیں؟" محسن نے ٹھنڈا سانس بھر کر سوچا "ایک منٹ میں نکھرے ہوئے نیلے آسمان کی طرح نظر آتی ہے تو دوسرے ہی لمحہ اجنبیت کی دھند میں چھپ جاتی ہے"۔

"شکریہ میڈم" محسن نے کھڑے ہو کر دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا اور سرخم کر کے باہر نکل گیا۔ واپسی پر تمام راستہ وہ فرزانہ ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا دلفریب چہرہ اور اس کے انداز محسن کے دل میں جیسے کھب کر رہ گئے تھے۔ کچھ دن بعد وہ کسی کام سے اسی سکول والی سڑک سے گزرا تو اسے میڈم فرزانہ ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں دو کتابیں تھامے گزرتی نظر آئی۔ ایک دفعہ تو وہ اس کے پاس سے نکل گیا مگر پھر جب جھکتے ہوئے پیچھے دیکھا تو وہ خراماں خراماں چلی آرہی تھی۔ اس نے کار ریورس کرتے ہوئے فرزانہ کے قریب جا کھڑی کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس دوران فرزانہ چلتی چلتی چند قدم کار سے آگے نکل آئی تھی۔ محسن نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور بولا:۔

"آیئے مس فرزانہ! آپ شاید گھر جا رہی ہیں میں آپ کو ڈراپ کیے دیتا ہوں"۔

فرزانہ نے ایک نگاہ غلط انداز سے محسن کی طرف دیکھا مگر پھر انکار کے انداز میں اسی چال سے چلتی ہوئی بولی:۔

"جی نہیں شکریہ، میں خود ہی چلی جاؤں گی"۔

"اجی شکریہ کس بات کا میڈم، پلیز آیئے نا، دیکھیے آپ تو تکلف برت رہی ہیں"۔ محسن التجا بھرے لہجہ میں اس کے آگے آتا ہوا بولا۔

"اونہہ میں روز اسی طرح آیا جایا کرتی ہوں اور یہ میرا معمول ہے" وہ تن کر بولی۔ "اور پھر اجنبیوں سے لفٹ لینا میرا وطیرہ بھی نہیں"۔

"ارے صاحب! جانے بھی دیجیے، اب ہم اجنبی کہاں ہیں، آپ ہمارے بھتیجے کی میڈم ہیں اور یہ بات آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ ہمارے دین میں

کہ آپ تو پیدل گھر جائیں اور ہم کار میں بیٹھ کر قریب سے فراٹے بھرتے ہوئے گزر جائیں۔ یہ تو سراسر بے ادبی ہوئی نا"۔ محسن نے بات بناتے ہوئے نہایت خوشدلی سے کہا۔

"بہت بہت شکریہ! مسٹر.....؟"

"محسن" محسن نے جھک کر شوخی سے جملہ پورا کیا۔

"ہاں تو مسٹر محسن آپ کی اس دینی خدمت اور قدر افزائی کا شکریہ! مگر پلیز آپ میرا راستہ چھوڑ دیں۔ لوگ خوامخواہ مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ میں جس حال میں بھی جا رہی ہوں، اس سے آپ کو کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔ براہ کرم آپ اپنے کام سے کام رکھیے اور اپنا راستہ ناپیے"۔ وہ کنی کترا کر تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

محسن مایوس ہو کر کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ چند فرلانگ تک تو اس کی رفتار کے ساتھ فرزانہ کے ساتھ چلتا رہا مگر جب اس کو ٹریفک سگنل پر رکنا پڑا تو فرزانہ بھیڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اور آج پھر محسن کو محسوس ہوا کہ وہ انجانے میں ہی اس پر پیچ سی سڑک پر آ نکلا ہے۔ جہاں سے فرزانہ روزانہ سکول سے واپسی پر گزرتی ہے۔ ابھی سکول بند ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اس نے کار ایک طرف کھڑی کر دی اور وقت گزاری کے لیے کار کا کیسٹ ریکارڈ آن کر کے سیٹ پر پشت لگا کر آنکھیں بند کر لیں مگر پھر بے چین سا ہو کر دور دور تک نظریں دوڑانے لگا۔ کار کے ڈیش بورڈ سے کنگھی نکالی اور کار کے آئینے میں دیکھ کر بال سنوارنے لگا اور کنگھی رکھتے ہوئے خفت سے مسکرا بھی دیا کہ اس طرح سر راہ بال سیٹ کرنا خاصا لوفرانہ کام ہے۔

"کیا کریں مجبوری ہے صاحب" وہ زیر لب بڑبڑایا اور پھر سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا

کافی رکشے، کاریں اور سائیکل گزرنے لگے تھے، جس سے پتہ چلتا تھا کہ سکول میں چھٹی ہوگئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسے فرزانہ بھی سامنے سے آتی دکھائی دی۔ محسن نے محسوس کیا کہ کار پر نظر پڑتے ہی فرزانہ کے چہرے پر ایک تناؤ سا آگیا ہے اور خوبصورت ماتھے پر پڑی شکنیں دور سے دکھائی دینے لگی تھیں۔

''ظالم پتھر کی بنی معلوم ہوتی ہے، آج چوتھی بار ہم بھی کس نیازمندی سے اس کے راستے میں آکھڑے ہوئے ہیں۔ جیسے یہاں ہماری نوکری لگ گئی ہو۔ کتنی تابعداری سے ماتھے پر ہاتھ رکھ سلام کرتے ہیں لیکن وہ نظر اٹھا کر بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتی''۔

اتنے میں فرزانہ چلتی ہوئی قریب آگئی اور محسن نہایت وارفتگی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ فرزانہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں شب بیداری کی سرخی اور خوب صورت ماتھے پر شکنیں تھیں، لیکن گلابی رسیلے خمدار ہونٹ دھیمی دھیمی سی مسکراہٹ کو قابو کرنے کی کوشش میں متحرک رہے تھے، جیسے وہ اس کے اختیار سے باہر ہوئے جارہے ہوں۔ محسن کو ان تیکھے ہتھیاروں نے گھائل کرکے رکھ دیا۔ فرزانہ کی یہ خوش ادائیاں اس کے خرمنِ دل پر بجلی بن کر گریں اور محسن پر اک قیامت سی گزر گئی مگر پھر وہ ہوش میں آگیا اور جب وہ قریب آگئی تو وہ یکدم اپنی مردانہ جرأت کو بروئے کار لاتا ہوا کار سے باہر نکل آیا اور دروازہ تھام کے بولا۔

''آیئے نا آپ کو ڈراپ کردوں''۔

فرزانہ نے ایک خوبصورت بلی کی طرح غرا کر اسے تیکھے انداز سے دیکھا اور کہا۔

''شکریہ! یہ کار تمہیں ہی مبارک ہو مگر یہ تو بتاؤ تمہیں لوگوں کو ڈراپ کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں؟ یہ تم نے آخر اتنے دنوں سے ناٹک کیا رچا رکھا ہے؟ تمہیں شرم آنی چاہئے۔ ایک تو ان فلموں نے تم جیسے نوجوانوں میں سے غیرت کا مادہ ختم کرکے رکھ دیا ہے۔ ایک شریف لڑکی جو اپنی گزر اوقات کے لیے سکول میں پڑھاتی ہے، تم نہایت لوفرانہ شان سے اپنی پورشے کنورٹیبل گاڑی کی شوخیاں لئے راستے میں آکر بیٹھ جاتے ہو، کیا تم مجھے سکول سے نکلوانا چاہتے ہو؟ اور اگر تمہاری یہ خواہش ہے کہ تمہاری خاطر میں بدنامی مول لے لوں تو افسوس کہ یہ خوشی میں تمہیں نہیں دے سکتی اور اس کے بعد خبردار جو میرا پیچھا کیا۔ ورنہ میں پولیس کے حوالے کردوں گی''۔ وہ یکلخت پینترا بدل کر سرخ سرخ آنکھیں نکال کر بولی۔ فرزانہ کی یہ باتیں عمران خان کے فاسٹ بال کی طرح آئیں اور جیسے بلا اٹھانے سے پہلے ہی اس کی تمام وکٹیں اڑ گئی ہوں۔ محسن نے خشک ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر آگے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی فرزانہ کو دیکھ کر زیر لب بڑبڑایا۔

''اف یہ تو بڑی تیز نکلی، اچھا ہوا جو یہاں کوئی واقف سننے دیکھنے والا نہ تھا ورنہ بڑی کرکری ہوتی'' محسن نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ ''خیر کوئی بات نہیں محسن بیٹے، ابھی تو ابتداء ہے، ویسے چھوڑوں گا تو میں بھی اسے نہیں۔ چاہے یہ پھولن دیوی کی سگی ہی کیوں نہ ہو'' محسن نے بسورنے کے انداز میں ہونٹ لٹکا کر کندھے اچکائے اور گاڑی میں جا بیٹھا۔

اور پھر فرزانہ سے اس کی اگلی ملاقات ننھے عاصم کی ای راحت کے گھر ہوئی۔ جیسے ہی محسن اندر داخل ہوا، غل غپاڑے نے اس کا استقبال کیا۔ اس حسین ہنگامے میں سے عاصم ''انکل'' کا نعرہ لگا کر اس کی طرف بھاگا اس کے ساتھ چند اور بچے بھی ''انکل آگئے انکل آگئے کا شور مچاتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔ ایسے محسوس ہورہا تھا جیسے کسی بچے کی سالگرہ کی تقریب ہو۔ کھانے کی میز کے اوپر رنگ برنگی چمکدار قندیلیں اور غبارے لٹک

رہے تھے اور پیچھے چند لڑکیاں بالیاں باہم نوک جھونک میں معروف تھیں۔ جونہی فرزانہ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو محسن چلا آرہا تھا۔ جس کے دائیں بائیں بچے چمٹے ہوئے اسے کھینچے لا رہے تھے۔ قریب آکر محسن نے بمشکل خود کو بچوں کے نرغے سے آزاد کیا اور پھر سرخم کر کے سب کو آداب کیا۔ چاکلیٹ رنگ کا تو پیس سوٹ اس کی بڑی بڑی متوالی اور شوخی بھری آنکھوں سے میچ کر رہا تھا۔ لڑکیوں نے اسے دیکھ کر باہم کھسر پھسر کی اور پھر اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگیں۔ محسن نے سرسری نظر سے چاروں طرف دیکھا تو اسے ان لڑکیوں میں بیٹھی فرزانہ بھی نظر آگئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ یکا یک چونک پڑا اور پھر غیر ارادی طور پر فرزانہ کے قریب چلا آیا۔ "ہیلو" اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"ہیلو" فرزانہ نے اس کی آرپار ہونیوالی مشاق نظروں سے بچنے کے لیے پلکیں رخساروں پر گراتے ہوئے دھیمے سے کہا۔ اتنے میں راحت بولی "ارے فرزانہ آؤ، محسن کا میں تم سے تعارف کرواؤں۔ یہ ہے میرے شوہر رضا کا نہایت ہی پیارا شریر سا دوست اور بھائی محسن، یہ فرزانہ ہے میری بچپن کی دوست اور بہن، ابھی ایک ماہ پیشتر یہ ٹرانسفر ہو کر عاصم کے سکول میں وائس پرنسپل لگی ہے"۔

"جی ہاں! ان سے پہلے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ جب آپ کے شوہر نامدار عاصم کے داخلے کی ذمہ داری مجھ ناچیز کے ناتواں کندھوں پر ڈال کر خود لمبے دورے پر نکل گئے تھے۔ تو سکول میں پرنسپل کے آفس میں ان محترمہ سے سابقہ پڑا تھا۔ مگر آپ کی اس بچپن کی سہیلی اور بہن نے تو گھاس تک نہ ڈالی آپ کے اس پیارے سے شریر سے دیور کو"۔ محسن نے بعد کی ملاقاتوں کی روداد کو نسبتاً چھپاتے ہوئے بات کو چبا کر کہا۔

"سوری صاحب! ہمیں پتہ نہ تھا، ورنہ گھاس کھلانے کے علاوہ پانی کی بالٹی بھی رکھتے آپ کے سامنے" فرزانہ نے طنز سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

"اور میڈم! مجھے بھی اس سے پہلے پتہ نہ تھا کہ آپ درس و تدریس کے علاوہ اس قسم کے فرائض بھی بخوبی سرانجام دے سکتی ہیں۔ کافی وسیع تجربہ معلوم ہوتا ہے آپ کا"۔ محسن نے بھی آنکھیں بھینچ کر دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونستے ہوئے جملے پر دہلا پھینکا۔

"لیکن صاحب میں نے نہ تو مویشیوں کی نفسیات پر ریسرچ کی ہے۔ نہ ہی ان کی بولیاں سمجھنے کی کوئی ڈگری لی ہے۔ اس لیے زیادہ بے لگام ہونے کی بھی ضرورت نہیں" فرزانہ نے غصے سے کہا۔

پہلے تو راحت دونوں کو اس طرح آپس میں اُلجھتے دیکھ کر حیران ہوتی رہی مگر پھر ان کے ڈائیلاگ سن کر قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکی۔

"ارے ارے کیا ہو گیا تم دونوں کو۔ کیا بیٹھے بیٹھے چوزوں کی طرح لڑنے لگے۔ فرزانہ کیا بات ہے؟ بیچارے محسن سے اس قدر ناراض کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں یہ صاحب ذرا خود بخود ہی لفٹ دینے کی کوشش میں ہیں" فرزانہ نے گول مول الفاظ میں تنک کر کہا۔

"اُف لڑکی ہے یا بھڑوں کا چھتہ؟" محسن نے اسے خاص طور پر سنانے کے لیے قدرے بڑبڑا کر کہا۔

دوسری مہمان خواتین کے ادھر متوجہ ہونے سے پہلے ہی راحت نے بات تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

"آؤ نا، محسن تم دیر سے پہنچے ہو ورنہ بڑی مزے مزے کی چیزیں بنی تھیں آج تو، چلو بیٹھو آرام سے تمہارے لیے بھی کچھ منگواتی ہوں کھانے کو"۔

"ارے بھابھی کون کھلاتا ہے، ہمیں کچھ آپ کو تو اپنی ہی سہیلیوں سے کچھ فرصت نہیں"۔ محسن کمرے کے

نظروں سے فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"ہاں تو بھئی محسن وہ کیا بنا تمہاری شادی کا۔ ملی کوئی آئیڈیل لڑکی یا نہیں؟" راحت اسے پلیٹ پکڑاتے ہوئے قدرے دھیمے لہجے میں بولی۔
"مل تو گئی ہوتی، مگر وہ جو کارلائل نے کہا ہے کہ آئیڈیل ستاروں کی مانند ہوتے ہیں، جنہیں ہم دیکھ تو سکتے ہیں مگر چھو نہیں سکتے" محسن نکھیوں سے فرزانہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔
"لو اور سنو اب تو لوگ ستاروں پر بھی جانے لگے ہیں۔ ایسی کون سی بات ہے۔ ویسے اگر تم مجھے بتا دو کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے تو پھر رشتہ برابر کریں"۔ راحت نے دلچسپی سے کہا۔
"جانے دو بھابھی کون برابر کرتا ہے ہم سے رشتہ۔ کسی کو ہماری پرواہ نہیں" وہ پلیٹ میں سے ایک رس گلا اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔
"خوامخواہ بات کو طرح دیئے جا رہے ہو۔ مجھے بتاؤ نا میں جو کہہ رہی ہوں میں کرواؤں گی تمہاری شادی" راحت نے تنگ کر کہا" کیا اب اسٹام لکھوانا ہے مجھ سے؟"۔
"ہاں تو پھر یہ ہوئی نا بات" محسن بے اختیار ہنس کر بولا۔
"بھابھی یہ تو سوچو کہ کون کرے گا مجھ لوفر سے شادی؟" وہ پھر نکھیوں سے فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
کچھ لڑکیاں معنی خیز انداز میں کھنکاریں اور پھر دبی دبی مسکراہٹ ہنسی کی کھنک میں تبدیل ہوتے دیکھ کر فرزانہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی "ہائے کچھ دیر تو بیٹھو نا فرزانہ کی بچی" راحت نے یکدم اس کے اٹھ جانے پر حیران سے ہو کر کہا۔
"باہر تو گہری شام پڑی ہے، راحت ذرا دیکھو

کمرے میں تو ہمیں باتوں باتوں میں پتہ ہی نہیں چل سکا، میں تو بس اب چلوں گی" فرزانہ نے اپنی چھوٹی سی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔
"تو پھر ٹھہرو نا۔ تمہیں بھیجوانے کا بندوبست کرتی ہوں" راحت نے جلدی سے کہا۔ "نہیں راحت میں خود ہی چلی جاؤں گی رکشے وکشے پر" فرزانہ بعجلت تمام کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔
"توبہ ہے بھئی، کیوں چلی جاؤ گی اس وقت اس کمبخت رکشے وکشے پر" راحت نروس سی ہو کر بولی "تم ٹھہرو ذرا، محسن دیکھو بھئی کار باہر کھڑی ہے نا تو تم ہی پلیز فرزانہ کو ڈراپ کر دو نا"۔
محسن کے تو جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ اُٹھ کر تیزی سے باہر جاتی فرزانہ کے پیچھے لپکا۔ راحت بھی ساتھ ہی ساتھ باہر چلی آئی۔ فرزانہ نے اک نگاہ غلط انداز سے محسن کو اپنی کار کا لاک کھولتے دیکھا اور پھر بولی۔ "مانا کہ آپ لوگ بڑی بڑی کاروں کے مالک ہیں، ایک شہنشاہ نے بنا کر تاج محل ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق کے مصداق آپ کو بے چارے رکشے کو بھی کمبخت کہنے کا کوئی حق نہیں"۔ فرزانہ اپنی اونچی ہیل کی جوتی پر ٹک ٹک کرتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی اور اتفاقاً سامنے تیزی سے گزرتے ہوئے ایک خالی رکشے کو ہاتھ دے کر کھڑا کرتے ہوئے بھاگ کر اس میں سوار ہو گئی اور رکشا اسے لے کر ہوا ہو گیا۔
پہلے تو محسن اور راحت ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے پھر راحت تشویش سے بولی۔
"یہ لڑکی تو شروع سے آفت کی پرکالہ ہے مگر آج مجھے اس کی بڑی فکر رہے گی۔ اتنی دیر گئے اکیلی چلی گئی ہے۔ اوپر سے ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ جو نہ ہو سو کم ہے۔ محسن تم ذرا پیچھے پیچھے کار لگا کر اسے گھر تک چھوڑ کر ادھر سے ہی آگے نکل جانا پلیز"۔

سے کار گیٹ سے نکال لے گیا اور رکشا اور کار دونوں آگے پیچھے فرزانہ کے فلیٹ کے سامنے جا پہنچے۔
جب رکشا پھٹ پھٹ کرتا واپس ہوا تو محسن فرزانہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
"فرمائیے؟" فرزانہ نے جان بوجھ کر بے اعتنائی سے سر اٹھا کر محسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"وہ ...... وہ دراصل مجھے راحت بھابھی نے آپ کے پیچھے بھیجا تھا" محسن کچھ گڑبڑا کر بولا۔
"کیوں خیریت؟"
"آپ اکیلی جو چلی آئی تھیں وہاں سے۔ تو پھر انہوں نے بھی کہا یعنی کہ بھابھی راحت نے" وہ لوہ بھر کو رُکا اور خشک ہوتے ہوئے گلے سے تھوک نگل کر بولا "اور پھر میں نے بھی سوچا کہ...... کہ کہیں"۔
"ارے مسٹر وہ جو کسی نے کہا ہے نا

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم میر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ادھر دیکھو......"۔ فرزانہ نے اپنی کھنکتی ہوئی شوخ آواز میں قدرے رعب پیدا کرتے ہوئے کہا اور پھر پرس میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالنے لگی۔ محسن نے بے یقینی سے آنکھیں جھپک کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کا ریوالور چمک رہا تھا۔
"میں اپنی حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں سمجھے؟ اور آئندہ بھی آپ کو میرے لیے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں اور آپ کو تو میں سمجھتی ہوں خاص طور پر وہی بات ہے کہ قاضی جی کیوں دُبلے ہوں شہر کی فکر میں؟ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے مسٹر کہ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جن کے منہ سے چوہا دیکھ کر بھی چیخ نکل جاتی ہے......" اور پھر وہ ریوالور کی نالی کا رُخ محسن کی طرف پھیرتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے کہ آپ کی کار کا دروازہ آپ کے پیچھے ہے اور اب آپ اچھے بچوں کی طرح گھوم جائیے ہاں ...... ہاں قدم اٹھائیے شاباش اینڈ گڈ بائے"۔
محسن کے پیٹھ موڑتے ہی فرزانہ کا نازک سا نقرئی قہقہہ شام کی ملگجی تاریکی میں گونجا اور وہ تیزی سے اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہوگئی۔ محسن قدم اٹھانے سے قبل ہی پھر پلٹ پڑا۔ وہ سکتے کے سے عالم میں ششدر اسی طرح دیکھنے لگا جہاں وہ کسی چھلاوے کی طرح غائب ہوئی تھی۔ دروازے پر نمبر اور نیم پلیٹ پر غور کرنے کے لیے اس نے چند قدم بڑھا کر جونہی نیم پلیٹ پر نگاہ دوڑانی چاہی تو دروازے کی جالی کے پیچھے سے ایک جناوری قسم کے بل ڈاگ نے اس طرح غرا کر "ڈف" کیا کہ جیسے فضا میں بم کا دھماکہ ہوا۔ ذرا حواس بجا ہوئے تو اس نے شرمندگی اور شکست کے سے احساس سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر سر کو جھٹک کر ایک کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہوا کار ریورس کر کے زن سے نکال لے گیا۔ آدھے راستہ تک فرزانہ کے کہنے کی آواز محسن کے کانوں میں گونجتی رہی۔ گھر جانے کی بجائے وہ سیدھا دوبارہ راحت کے پاس جا پہنچا۔ وہ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد چیزیں سنبھال رہی تھی۔ محسن کو دیکھ کر بولی۔
"کیوں بھئی پہنچا آئے فرزانہ کو۔ خیریت تو رہی نا......؟"
"لو کہاں رہی خیریت......؟" محسن نے عجیب تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں چڑھا کر صوفے پر گرتے ہوئے ہانپ کر کہا "ناحق دوڑا دیا مجھے اس کے پیچھے"۔
"ہیں کیوں کیا ہوا؟" راحت کچھ ٹھٹھک کر اس کی حالت دیکھتے ہوئے حیران ہو کر بولی۔
"یہ مت پوچھو کہ کیا ہوا، ارے بھئی بلکہ یہ پوچھو کہ کیا کیا نہ ہوا۔ اُف بھابھی آپ کی بچپن کی سہیلی بلکہ پہیلی نے تو وہ کچھ دکھایا جو تمام زندگی میں نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ توبہ توبہ میں تو نجانے کیسے بچ کر نکل آیا وہاں سے

......" محسن کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"ارے کیا پہیلیاں بجھوائے جارہے ہو۔ محسن کے بچے؟ کچھ بتاؤ بھی تو سہی تاکہ کچھ پتہ تو چلے" راحت نے پریشانی سے پوچھا۔

"اُف بھابھی جان اس نے تو اپنے فلیٹ کے دروازے کے سامنے ہینڈز اپ کہہ کر ریوالور تان لیا مجھ پر اور کہنے لگی جلدی سے نکالو، جو کچھ تمہارے پاس ہے...... خیر" وہ کان کھجا کر بولا" اس طرح تو نہیں کہا مگر اُف خدایا پھر بھی وہ تو کسی ٹارزن کی بچی معلوم ہوتی ہے مجھے، ارے اور بھیجیں آپ مجھے اس کے پیچھے اور اس کا وہ سرخ لپلپاتی زبان والا خونخوار کتا جو اس نے مجھ پر چھوڑ دیا۔ وہ کاؤنٹ ڈریکولا کی اولاد، وہ گدھے برابر کتا میرے خیال میں وہ مجھے آپ کے گھر تک پہنچا کر ہی واپس گیا ہوگا'' محسن نے اپنی آواز میں مصنوعی لرزاہٹ اور کپکپاہٹ پیدا کرتے ہوئے جھرجھری لے کر کہا۔

"ہیں؟ اوہ نو!" راحت نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔" میں تمہیں مانتی محسن اور یا پھر تم نے خود ہی اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہوگی"۔

"توبہ توبہ کرو بھابھی کیا میں آپ کو ایسا ہی نظر آتا ہوں" محسن کان پکڑ کر بولا۔" آپ تو جانتی ہی ہیں۔ بھابھی میں شروع سے ہی امن پسند شہری ہوں۔ کبھی کسی کو ستانے کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ لیکن اب آکر اتنا ضرور آپ کو بتادوں کہ اب میرے کنوارہ پن کو خیر باد کہنے کا وقت آگیا ہے۔ انسان کا بیشتر وقت اپنے بارے میں پلان بناتے گزر جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی تقدیریں بھی فیصلہ کردیتی ہے" وہ چٹکی بجا کر بولا" اب یہ لڑکی میرے لیے چیلنج کا روپ اختیار کرگئی ہے"۔

"خیر خیر، فیصلہ، فیصلہ ہے میرے میاں، کھیر ٹھنڈی ٹھنڈی اچھی لگتی ہے گرم گرم کھاؤ گے تو منہ جلاؤ گے، اور پھر یہ ایک طرفہ ٹریفک کیسی، خود ہی ارادہ کیا اور خود ہی فیصلہ بھی دے دیا۔ ارے دوسری طرف کی رضامندی بھی تو لازمی ہوتی ہے نا" راحت نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا" تم نے اس کے آگے کا پوچھا نہ پیچھے کا اور چل پڑے اس سے شادی رچانے۔ بندہ خدا مجھ سے ہی کچھ پوچھ لیا ہوتا اس کے بارے میں"۔

"ارے بھابھی! آپ ہی کی وہ سہیلی یا کزن ہے تو آپ کو ہی سب پتہ ہوگا۔ مجھے زیادہ تفصیلات نہیں چاہئیں۔ صرف اتنا ہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس کی میرے ساتھ شادی ہونا ممکن ہے؟"

"سہیلی وہ میری ضرور ہے لیکن رشتہ داری بس برائے نام سی ہے۔ اس کی امی میری امی کی دور پار کی کزن تھیں۔ بہرحال اس کے ماں باپ بے شک مر چکے ہیں مگر دوسرے وارث موجود ہیں۔ دو بھائی ہیں، بڑا بھائی کراچی میں کافی بڑا بزنس پھیلائے بیٹھا ہے۔ چھوٹا بھائی ڈاکٹر ہے۔ جس کی خاصی پریکٹس ہے، فیصلہ تو آخر انہوں نے ہی کرنا ہے نا بھئی"۔ راحت نے کہا۔

"تو بھابھی اتنے امیر کبیر بھائیوں کے ہوتے ہوئے یہ یہاں ٹیچنگ کیوں کررہی ہے؟"

"بس صاحب! فرزانہ کی بھابھیوں سے نہیں بنتی۔ یہ کہتی ہے کہ دونوں بھائی جو ہیں وہ بیویوں کے غلام ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ بھی غلام بن کر رہے تو ایسا اس کے لیے ناممکن ہے۔ دراصل فرزانہ دونوں بھابھیوں سے زیادہ پڑھی لکھی ہے، خوبصورت اور ایڈوانس ہے اور پھر جب کہ اس چیز کا فرزانہ کو احساس برتری بھی ہے تو وہ کس طرح ان کے آگے دب کر رہ سکتی ہے اور پھر جہاں ذاتی عداوت ہو، وہاں بدمزگی لازمی امر ہے۔ چنانچہ اس نے کیریئر گرل بننے کا فیصلہ کرلیا۔ ایسی لڑکی کے لیے جس کے لیے خوبصورتی وبال جان بن جائے۔

ملازمت کا حصول ہمیشہ مشروط حالات کے تحت ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک اخبار میں اس سکول کی ملازمت کا اشتہار پڑھ کر یہ یہاں چلی آئی۔ اس کی خوبصورتی اور اچھے گھرانے کو دیکھ کر سکول کی پرنسپل نے اسے پاس ہی ایک کمرہ دے رکھا ہے اور اس طرح یہ unpaid guest بن کر رہ رہی ہے، مگر کیا تم واقعی اس کے لیے سیریس ہو محسن......؟" راحت محسن کو غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"وائے ناٹ بھابھی! آخر میں سارے پاپڑ بیل کس لیے رہا ہوں۔ یہی تو ہے میری آئیڈیل لڑکی، اس کے نسوانی غرور کے سامنے تو آپ کے اس گلیمرس بوائے دیور نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں اُف......وہ کیا کہا ہے کسی نے:

تبسم بھی حیا بھی بے رُخی بھی
یہ انداز ستم بھایا بہت ہے

ہائے میں پھر کہتا ہوں بس اب تو یہ لڑکی میرے لیے چیلنج بن گئی ہے اور میں اسے حاصل کر کے ہی رہوں گا"۔ محسن نے اپنے چمکدار لہریئے دار بالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر اپنی ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے کہنے لگا "ذرا سوچو تو بھابھی یہ اس کی اُلٹی سیدھی حرکتیں اور کڑوی کسیلی باتیں کس لیے برداشت کر رہا ہوں۔ اس کے لیے سنجیدہ ہوں نا، اسی لیے۔ تو پھر اب جلدی سے کچھ کرو نا بھابھی میری اچھی بھابھی"۔ محسن دیکھتے ہی دیکھتے لجاجت پر اُتر آیا۔

"نہ......نہ......بھئی ہم کسی کے پھڈے میں پاؤں نہیں اڑاتے۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں"۔

راحت نے اپنی پیاری سی ناک اچکا کر مسکراتے ہوئے آنکھیں قدرے مٹکا کر کہا۔

"میری شادی کے لیے ابھی جو دعوے کیے جا رہے تھے اور اسٹام لکھے جا رہے تھے، کیا وہ محض زبانی جمع خرچ تھا؟ واہ واہ داد دیتا ہوں آپ کے حافظے کو بھابھی۔ کیا کہنے آپ کے بھی مگر یہ بات بھی کان کھول کر سن لیں کہ جو چیز مجھے پسند آجائے اسے میں چھوڑا نہیں کرتا۔ میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ ہر قیمت پر"۔ وہ صوفے کے بازو پر مکہ رسید کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا بھئی اچھا۔ میرا صوفہ تو مت توڑو۔ دیکھو رضا کو کراچی سے واپس آنے دو۔ پہلے اس سے صلاح مشورہ ہوگا پھر فرزانہ کی مرضی معلوم کی جائے گی اور تب بات آگے بڑھائی جائے گی۔ سمجھے! اور میرے کانوں کو کیا کہتے ہو وہ تو ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ہاں مگر میرا خیال کیا بلکہ یقین ہے کہ تمہارے اس خوشنما بالوں والے سر کے ساتھ کانوں کی جوڑی محض اس مقصد کے لیے پیوست کی گئی ہے کہ تم دوسروں کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دینے کے بعد اپنی مرضی پر چلا کرو۔ ہے نا؟" راحت نے ہنس کر کہا۔

جب راحت کی اپنے شوہر سے بات ہوئی تو رضا نے متفکر ہو کر کہا۔

"میرا اس لڑکے محسن سے شروع سے واسطہ ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ یہ ہمیشہ دوسروں کے بارے میں جو پہلا تاثر قائم کر لیتا ہے وہ انتہا پسندانہ ہوتا ہے لیکن تمہارا کیا خیال ہے فرزانہ اس کے لیے کیسی بیوی ثابت ہوگی؟"

"اب میں حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ دیکھنے میں تو طرح دار ہے، بے حد حسین ہے۔ رہی فطرت مزاج کی بات تو اکثر لوگ اپنا آدھا چہرہ ہمیشہ پوشیدہ رکھتے ہیں۔ کسی کے اندر جھانکا نہیں جا سکتا۔ اتنا میں نے ضرور اندازہ لگایا ہے کہ فرزانہ کی طبیعت میں ضد اور خود سری کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور برداشت کا مادہ تو بالکل ہی نہیں اس میں۔ لیکن ہمارے کچھ سوچنے یا نہ سوچنے سے کیا فرق پڑتا ہے جبکہ محسن کہتا

ہے کہ اگر شادی کروں گا تو فرزانہ سے ورنہ کسی سے بھی نہیں"۔ راحت نے قدرے پریشانی سے کہا۔
"ہوں!" رضا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اچھا خیر پہلے تم فرزانہ سے تو بات کر کے دیکھو نا"۔
اور جب فرزانہ سے راحت نے بات کی تو وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی۔
"ارے راحت میں تو خود کئی دنوں سے اس آدمی کے بارے میں تم سے کچھ دریافت کرنے کا سوچ رہی تھی کیونکہ یہ تو بغیر اپنا حدود اربعہ بتائے ہی کب کا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ بہت اس کو ڈانٹا دھمکایا مگر اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا ہے"۔
"ارے نامراد وہ تو تمہیں اتنا چاہنے لگا کہ کہتا ہے شادی فرزانہ سے ہی کروں گا ورنہ کسی سے بھی نہیں۔ نجانے تم نے کیا چکر چلایا ہے ورنہ اس کو تو کوئی لڑکی پسند ہی نہ آ رہی تھی"۔ راحت نے کہا۔
"اُف مجھے پہلے ہی اس بات کا خوف تھا کہ اب وہ تمہیں درمیان میں لا کر اپنا مقصد پورا کرے گا لیکن راحت بھئی اب تم سے کیا پردہ۔ میں صرف ظاہری رکھ رکھاؤ اور صورت شکل کی قائل نہیں بلکہ اب تک تو میں یہی سمجھی رہی تھی کہ یہ کوئی جو کہ شاید لنڈے بازار کا سوٹ پہن کر کسی دوست کی کار مانگ لاتا ہے اور لوفروں کی طرح آتی جاتی لڑکیوں کے راستے میں کھڑا ہو جاتا ہے اور ادھر تمہیں تو پتہ ہے کہ میں اپنی بھابیوں کو ٹھینگا دکھا کر گھر سے نکلی ہوں۔ تو پھر میں شادی کروں گی تو ایسی جگہ کہ وہ بھی منہ کھول کر دیکھتی رہ جائیں۔ ویسے بھی خانہ داری کی کھِس کھِس سے مجھے ازحد نفرت ہے۔ مجھے تو وہ شوہر چاہئے جس کا سوسائٹی میں اونچا نام ہو جس کے پاس دولت کی ریل پیل ہو اور جو فراخدلی سے سوشل لائف افورڈ کر سکے"۔
"تو پھر اور کیا چاہتی ہو۔ یہ سب خصوصیات اس میں موجود ہیں، پڑھا لکھا ہے، خوبرو ہے، شریف اور خاندانی ہے۔ تمہاری خواہش کے مطابق صاحب جائیداد اور کافی مالدار ہے۔ کلبوں وغیرہ میں بھی جاتا ہے اور کافی دوست احباب بھی ہیں۔ ابھی تو کئی اچھے اچھے گھر اس کو بیٹی کا رشتہ دینے کے تمنائی ہیں لیکن یہ خود ہی کسی کو خاطر میں نہیں لا رہا۔ ایک خصوصیت اور اس کی بتاتی چلوں کہ تقریباً اکیلا ہے۔ نہ ساس' نہ نند' نہ دیور' نہ سسر' تم جیسی خودسر لڑکی اس کو اپنا کر تمام زندگی چین کی بنسری بجا سکتی ہے۔ دیکھو ابھی تو اس کی زندگی کا خاص مقصد کوئی نہیں کیونکہ کنوارہ ہے۔ جب شادی کے بعد تم ساتھ رہو گی تو پھر تمہاری خاطر بھی وہ اور آگے بڑھنے اور دولت کمانے کی کوشش کرے گا"۔
فرزانہ خاموش ہو رہی مگر اس کی آنکھوں میں رضا اور سپردگی کے ملے جلے احساس کے گلاب مہکتے دیکھ کر راحت نے اس کی پیٹھ پر ہلکا سا تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔
"ہاں تو پھر کیا فرماتے ہیں علمائے دین بیچ اس مسئلہ کے، کہو تو تمہارے بھائیوں سے بات کی جائے"۔
بھائیوں کا نام سن کر فرزانہ کے خوبصورت چہرے پر کرب سا پھیل گیا اور ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔
"راحت! بعض لڑکیاں مالی مشکلات کے ہاتھوں عاجز آ کر گھر سے کچھ کما لانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور بعض خوشحال گھرانوں کی لڑکیاں محض ماحول کی یکسانیت سے اکتا کر ملازمت کر لیتی ہیں لیکن میرے ساتھ علیحدہ ہی مسئلہ تھا مجھے بھابیوں کے ساتھ رہ کر پئی انا کا سودا منظور نہ تھا اور بھائی اپنا گھریلو سکون چاہتے تھے اور دیکھ لو۔ مجھے یہاں آئے ہوئے دوسرا مہینہ ہے بھائیوں نے مڑ کر حالت تک نہیں پوچھی"۔
"چلو جانے دو فرزانہ۔ تمہیں چاہئے کہ سب کچھ بھول کر جو خوشی آج تمہارے دروازے پر دستک دے رہی ہے اسے خوش آمدید کہو۔ میرا خیال ہے

محسن تمہارے سارے شکوے دُور کردے گا"۔

اور پھر تعجب تو اس بات پر ہوا کہ جب رضا اور راحت نے فرزانہ کے بھائیوں سے اس رشتے کے بارے میں فون پر بات کی تو دونوں کی طرف سے ایک ہی جواب ملا۔

"فرزانہ بالغ ہے اور اپنے بھلے بُرے کی خود ذمہ دار ہے اور پھر زندگی تو اس نے گزارنی ہے ہم نے نہیں اگر وہ خود اس رشتہ کو اپنے لیے موزوں خیال کرتی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں"۔

اور پھر اگلے دس دن کے اندر ہی دونوں بھائیوں نے پچاس پچاس ہزار کے دو چیک بھیج کر ان الفاظ کے ساتھ گلوخلاصی کرالی۔

"ہم ضرور اس شادی میں شریک ہوتے مگر کیا کریں وقت نکالنا بے حد مشکل ہے"۔

رضا، راحت اور فرزانہ کی پرنسپل نے میکے کے فرائض انجام دیے اور محسن کے دوستوں اور ان کی بیویوں نے سسرال کے...... شادی کی تقریب ہوٹل ہالی ڈے ان میں وقوع پذیر ہوئی اور وہیں سے رخصت ہو کر فرزانہ، بیگم محسن علی خان بن کر اس کے گھر آگئی۔

شادی سے پہلے محسن کی زندگی کچھ اس ڈھب سے جاری تھی جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ والدین خاصی جائیداد چھوڑ کر ایک حادثے میں چل بسے تھے۔ ایک بیاہی ہوئی بہن تھی جو خاوند کے ساتھ امریکہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر تھی۔ سالوں میں کہیں ایک دفعہ آنا ہوتا تو بھائی کے لیے رشتے ڈھونڈنے کی مہم کا آغاز کردیتی۔ وہ بے چاری تو دل سے چاہتی تھی کہ کسی طرح بھائی کا گھر بسا دے لیکن دوسری طرف جو محسن کے دوستوں کی فوج ظفر موج تھی، انہوں نے بیچلرز ایسوسی ایشن بنا کر اس کا صدر محسن کو مقرر کر رکھا تھا اور ادھر جو رشتہ بھی برابر ہوتا تھا سب یک زبان اس میں سے کوئی نہ کوئی مین میخ نکال کر محسن کا دل برا کردیتے۔ دراصل شروع شروع میں وہ چاہتے ہی نہ تھے کہ محسن ان کے ہاتھ سے نکل جائے اور پھر آخر جب تنگ آکر محسن کی بہن نے بھی بات پوچھنی بند کردی تو اس ایسوسی ایشن میں دراڑیں پڑنی شروع ہوگئیں۔ اکا دکا ممبر شادی کر کے غائب ہونے لگے اور پھر طرہ یہ کہ جو بھی ازدواجی بندھنوں میں بندھتا۔ باقی ماندہ کنواروں سے کنی کترانے لگتا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے سارے دوست شادی کر کے کھسک لیے اور اب عالم یہ ہوتا کہ ہنی مون کے بعد سے ہی ان کی ذمہ داریوں کا تانتا شروع ہوجاتا۔ کبھی بیوی کے ساتھ شام منانے کی پرابلم تو کبھی اس کی میڈیکل پرابلم پھر میٹرنٹی ہوم کے چکر۔ کبھی بچے کی بیماری کا بہانہ تو کبھی داخلے کا۔ ایسی صورت حال سے اب محسن کٹی پتنگ کی طرح ڈولتا پھر رہا تھا کہ فرزانہ اس کی زندگی میں یوں آگئی جیسے:۔

ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے اسی موقع کے لیے یہ شعر موزوں کیا تھا۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ Chronic Bachelors یعنی پکی عمر کے کنوارے بڑے کھاگ اور پرابلم قسم کے شوہر ثابت ہوتے ہیں اور مشکل سے ہی قابو آتے ہیں کیونکہ وہ زندگی کا ایک خاص حصہ دنیا کو دیکھنے اور بھگتنے میں صرف کر چکے ہوتے ہیں لیکن محسن کے ساتھ ایسا نہ تھا۔ بے شک اس نے شادی دیر سے کی تھی مگر فرزانہ سے پہلے کوئی لڑکی اس کی زندگی میں نہیں آئی تھی۔ اب تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ فرزانہ کے سامنے سب کچھ ہار چکا ہے۔ فرزانہ اس کی زندگی میں کیا آئی کہ ہر طرف اس کے وجود کی مہک کا فسوں پھیل گیا۔ مستعار لی ہوئی روشنیوں اور اپنے شب و روز کے تلکیے

اندھیروں اجالوں میں بھٹکنے والے محسن کی آنکھوں کو فرزانہ کے حسن و شباب کی روشنی چکا چوند کر گئی اور وہ اس روشنی کے سیلاب میں بہتا چلا گیا۔ اس کی بے ڈھب زندگی میں قرینہ سا آ گیا۔ اس کی بے مصرف جوانی ایک نئے جذبے سے روشناس اور سرشار ہوئی اور جی بھر کر سیراب ہوئی۔ اب وہ مطمئن اور خوش تھا۔ اس کی بہن جو اس کی شادی کی خبر سن کر بعد میں پہنچی تھی، اس کا گھر شاد و آباد دیکھ کر مطمئن اور خوشی خوشی واپس گئی اور دوست احباب نے بھی یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیا کہ شکر ہے کہ کسی طور اس آوارہ پنچھی کے بھی پر کٹے۔ اور یہ آشیانے کی پابندیوں کا لذت شناس تو ہوا۔ اب وہ وقت بے وقت دوستوں کے سر جا چڑھنے اور ان کے گھروں میں فساد ڈلوانے اور یا پھر ہوٹلوں اور کلبوں کے منتظمین کا سر کھانے کی بجائے اپنی نئی نویلی حسین دلہن کی معیت میں بڑے رکھ رکھاؤ سے گھومتا پھرتا نظر آتا۔ اب وہ کلبوں میں فرزانہ کے ساتھ اک نئی شان و بان سے نکلتا اور اعلیٰ ہوٹلوں میں بڑے سلیقے سے کھانا کھاتا۔ اونچے طبقہ میں بھی پہلے سے ہی اس کا بطور ایک رئیس زادے کے تعارف تو تھا مگر اب اس سوسائٹی میں اس کی بیگم کے حسن اور مہذب اور شائستہ طور طریقوں کا چرچا ہونے لگا۔ تمام ملنے والے محسن پر اب رشک کرتے۔ محسن نے ہنی مون سے واپس آ کر اپنی شادی کی خوشی میں ایک دو شاندار ڈنر کیا دیئے کہ اب وہ اور فرزانہ بھی سرکاری اور نیم سرکاری تقریبوں میں اکثر نظر آنے لگے اور فرزانہ تو قریباً ہر فنکشن کی جان بنتی گئی۔ لوگوں کی نظروں میں اپنے لیے پذیرائی اور اہتمام دیکھ کر محسن کو خوش فہمیوں نے گھیر لیا اور وہ جی بھر کر فرزانہ کے ساتھ داد عیش دیتا رہا۔ شادی سے پہلے محسن کی زندگی ایک ہی محور کے گرد گھوم رہی تھی۔ اس کی ذات کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ تھا وہ جہاں چاہتا تھا، جیسا چاہتا، کرتا اور اسی کو زندگی کی معراج سمجھتا لیکن زندگی کی اس یکسانیت سے وہ بھی آخر اُکتا ہی گیا۔ دن کے بعد رات نہ ہوتی تو شاید مسلسل اُجالے سے بھی انسان کا دل گھبرانے لگتا۔ شاید اسی لیے قدرت نے سرد و گرم موسموں کے بعد بہار بنائی۔ اب جو محسن نے شادی کا مسئلہ پا ہی لیا تو اب ان اُجالوں کی چکا چوند زندگی نے ایک نیا مسئلہ اس کے سامنے لا کھڑا کیا اور وہ تھا روپے پیسے کا مسئلہ۔ جائیداد اس کی ضرور تھی، لیکن اس کی طرف اس نے کبھی توجہ نہ دی تھی۔ جو کچھ منیجر دے دیتا اس کی اکیلی جان کے لیے کافی ہو جاتا۔ محسن نے پلٹ کر کبھی حساب کتاب نہ پوچھا۔ وقت گزاری کے لیے جو اس نے امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار چلا رکھا تھا اس کی طرف بھی شادی کے بعد تقریباً ایک سال سے اتنا وقت نہ ملا کہ اس کی طرف توجہ دے سکے۔ بینک بیلنس لاکھوں کے حساب سے ضرور تھا مگر شادی پر بھی بے تحاشا خرچ ہوا اور ابھی تک اسی پر شاہ خرچیاں ہو رہی تھیں۔ تو آخر ایک دن تو بینک بیلنس نے بھی جواب دینا ہی تھا۔

ایک تقریب سے واپس آ کر جب فرزانہ نے مسز شیخ کے گلے میں پہنے ہار کی بے طرح تعریف کی تو محسن فرزانہ کو لے کر جیولر کے پاس جا پہنچا۔ مختلف ہاروں کے ڈبے کھولنے کے بعد جب ویسا ہی ہار فرزانہ کی نظروں کے سامنے آیا تو اس کے حسین چہرے پر مسرت کی شفق جھلملانے لگی اور آنکھوں میں اشتیاق کے جگنو جلنے بجھنے لگے۔ محسن اس کی اس کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا مگر تین لاکھ پچیس ہزار روپے قیمت سنتے ہی محسن کو جیسے چپ سی لگ گئی۔

''ٹھیک ہے بھئی تم اسے علیحدہ رکھ دو ہم پھر آئیں گے۔'' محسن نے بددلی سے جیولر سے کہا۔ اور پھر فرزانہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"کیا خیال ہے چلیں"۔
فرزانہ کی آنکھوں کے دیپ بجھ سے گئے اور مضمحل سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ تمام راستہ وہ بجھی بجھی سی رہی۔ وہ اتنی بچی تو نہ تھی کہ محسن کے انداز بھانپ نہ سکے۔ بہرحال پہلی دفعہ اس کی توقعات کو ٹھیس پہنچی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو محسن کو شیو بناتا دیکھ کر پہلی بات جو اس نے کی، وہ ہار کے متعلق تھی۔
"محسن وہ ہار کتنا خوبصورت تھا۔ ابھی تک میری نظروں میں بس رہا ہے"۔
"کیا واقعی؟ میرا تو خیال ہے کہ تمہارے پاس اس سے بھی زیادہ خوبصورت اور قیمتی ہار موجود ہیں" محسن نے سیفٹی ریزر منہ پر پھیرتے ہوئے کہا۔
"آپ نہیں سمجھتے۔ یہ بات نہیں کہ میرے پاس پہلے ہار موجود نہیں ہیں۔ دراصل اس ہار کا ڈیزائن اتنا انوکھا ہے کہ میرے دل میں کھب کر رہ گیا"۔ فرزانہ نے زچ ہو کر کہا۔
"وہ ٹھیک ہے مائی ڈیئر لیکن چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانا پڑتا ہے نا" یہ کہہ کر محسن کے چہرے پر سوچ کی دھند چھا گئی اور وہ خاموشی سے چہرے پر آفٹر شیو لوشن لگانے لگا۔
"محسن" فرزانہ پھر پکاری۔
"جی میری جان" محسن خیالوں سے چونک کر بولا۔
"آپ اپنی فرم کو زیادہ توجہ کیوں نہیں دیتے؟" فرزانہ اپنے رنگین ناخنوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔
"ارے بابا..... توجہ تو تب دوں نا جب کچھ وقت ملے...... جب سے شادی ہوئی ہے پہلے تو چار ماہ ہنی مون میں گزار دیئے۔ پھر آئے دن کی تقریبات کا ہلا گلا اور پھر ابھی تک تو میں اتنے پر ہی قانع رہا کیونکہ میری اکیلی جان کے لیے تو یہ آمدنی ضرورت سے بڑھ کر تھی۔ اس لیے تو یہ لاکھوں کا بینک بیلنس بھی جمع ہوتا رہا۔ جس نے اب تک خوب ساتھ دیا ہے" محسن ہنس کر بولا۔
"دنیا میں جینا چاہتے ہو تو قناعت کا وطیرہ چھوڑ دو محسن"۔ فرزانہ تلخی سے مسکرا کر بولی۔
"اور وہ جو بڑے بڑے داناؤں کا قول ہے۔ قناعت میں امان ہے قناعت میں ہی زندگی ہے" محسن مسکرایا۔
"کہاں کی زندگی اور کیسی زندگی؟ ٹھیک ہے ہوتی ہوگی قناعت کی زندگی..... لیکن مضمحل زندگی۔ ناآسودہ زندگی، ایک تالاب میں ٹھہری ہوئی کائی زدہ گدلے پانی کی سی زندگی اور پھر ایسی زندگی پر قناعت کرنا میرے مزاج کو بھی راس نہیں ہے محسن صاحب"۔ وہ ذرا رک کر گلا کھنکھار کر بولی۔ "میں شاید آپ کے سامنے اپنی قلبی کیفیات اور اُفتادِ طبع کی صحیح وضاحت نہ کرسکوں لیکن میرے اندر کا جذبہ آپ کے نظریے کی نفی کرتا ہے۔ میں تو اس نظریے کی قائل ہوں کہ زندگی سے مسرتوں کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لو اور مسرتیں دولت کے بغیر حاصل ہونی ناممکن ہیں"۔
"وہ تو سب ٹھیک ہے جیسا تم سمجھ رہی ہو فرزانہ لیکن اس سب کے لیے بھی تو وسائل کا ہونا ضروری ہے۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔
"وسائل کا کیا ہے جب آپ جائیداد کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے تو پھر اپنے کاروبار پر پوری توجہ دیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اونچا طبقہ آپ کی طرف مثبت رویہ رکھتا ہے۔ آخر یہ اثر و رسوخ کس دن کام آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اپنی فرم کے لیے محنت کریں گے، تو ضرور خاطر خواہ نتائج سامنے آئیں گے" فرزانہ نے کہا۔
"لیکن کیا ضروری ہے کہ یہ لوگ ہمارے کاروبار میں بھی دلچسپی لیں؟" محسن نے کہا۔
"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں محسن۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ ضرور کام آئیں گے"۔

اور جب محسن نے اپنی فرم پر توجہ دی تو واقعی حیران کن نتائج برآمد ہونے لگے۔ محسن اینڈ کمپنی دو تین کمروں پر مشتمل چھوٹی سی فرم تھی۔ جسے کوئی خاطر میں ہی نہ لاتا تھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس کو منافع بخش آرڈر سپلائی ہونے لگے۔ ایک بڑے بینک نے ضرورت پڑنے پر کافی ایڈوانس دینے کی پیش کش کی اور ایک بہت بڑے تاجر نے محسن کی فرم کو خاصا اضافی کام بھیجنا شروع کردیا اور اسی طرح محسن کے بینک بیلنس میں اضافہ ہونے لگا۔ زیادہ روپیہ کمانے کی طلب اور کاروبار میں کامیابیوں نے محسن کے حوصلے بڑھادیے۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ وقت کاروبار کو دینا چاہتا تھا۔ اکثر اسی سلسلے میں اسے شہر سے باہر بھی جانا پڑتا تو اپنی سست طبیعت کے باوجود فوراً تیار ہو جاتا۔ تین چار دن باہر بھی گزارتا۔

اب تو اس کے حلقہ احباب میں بھی وسعتیں پیدا ہونے لگیں۔ رہی فرزانہ تو دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بھی اپنے مشاغل بڑھالیے۔ دن کو سوشل ورک کے لیے گھومتی پھرتی نظر آتی تو شام کو کلبوں اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں نظر آنے لگی۔ خوبصورتی کے ساتھ ذہانت ایسا ہتھیار ہے جو کہ اگر ایک عورت کے پاس ہو تو مضبوط قلعہ بھی سر کر لیتی ہے۔ محسن کا جب پہلا بیٹا حسن دنیا میں آیا تو اس کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ رہا مگر فرزانہ جھنجلائی اور گھبرائی ہوئی نظر آنے لگی۔

ایک تجربہ کار، خاصی تنخواہ والی آیا اور ڈبے کے دودھ نے کافی حد تک اس کا مسئلہ حل کر دیا لیکن جب تین سال بعد دوسرا بیٹا علی اس دنیا میں وارد ہوا تو محسن کی لاعلمی میں ہی فرزانہ نے بچہ بند کرنے کا آپریشن کروالیا۔

یہ پہلا جھٹکا تھا جو اس خوشگوار اور مطمئن زندگی میں محسن کو لگا اور اس دن پہلی مرتبہ میاں بیوی میں تکرار ہوئی۔ "اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے تم نے مجھ سے پوچھنا تک گوارانہ کیا، فرزانہ آخر کیوں؟" محسن مشتعل ہو کر بولا۔

"وہ اس لیے کہ آپ نے کوئی تعاون کرنا تھا میرے ساتھ؟ میں جانتی تھی کہ آپ میرے اس ارادے میں ضرور ٹانگ اڑائیں گے" فرزانہ نے لاپرواہی سے کہا۔

"ارے تم نے اپنے عورت پن پر چھری پھیر دی۔ محض سوشل لائف کے لیے حالانکہ تمھیں پتہ ہے کہ عورت کی معراج ہی ماں بننے میں ہے۔ باقی سب ڈھکوسلا ہے، خود فریبی ہے" محسن نے بھنا کر کہا۔

"لو ہوا تنے گرم کیوں ہو رہے ہو؟ کیا دو بچے تھوڑے ہوتے ہیں اس زمانے میں؟ مجھے کیا پتہ تھا محسن کہ تم اتنے بیک ورڈ نکلو گے؟" فرزانہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "کیا تم چاہتے ہو کہ میں بچوں کی فوج جمع کر کے اپنے حسن وشباب کو روگ لگالوں؟"

"افوہ...... خدا کی بندی، کم از کم اتنا تو صبر کرتی لیتیں کہ ایک گڑیا سی بچی ہی اور آجاتی۔ کونسا تم خود پالتی ہو۔ میں ایک آیا ہی اور رکھ لیتا" محسن نے بے بسی سے کہا۔

"بس بس۔ اگر اتنا ہی شوق ہے تو کسی گھسیارے کی بیٹی لے آؤ جو تمہارے لیے بس بچے جنتی رہے۔ میں تو باز آئی ایسی زندگی سے" فرزانہ دھواں دھار روتے ہوئے بولی تو محسن خاموشی سے باہر نکل آیا۔

محسن بے چارہ صلح کن طبیعت کا آدمی تھا اور پھر فرزانہ کو وہ ہر قیمت پر خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ننھا علی بھی آیا کے سپرد ہوا اور خود فرزانہ ہر دم اپنے جسم کو دوبارہ اسی تناسب پر لانے کے لیے بیوٹی پارلرز کے چکروں اور مختلف قسم کی ورزشوں میں مصروف رہتی۔ اسے اتنے عرصہ میں یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ بچے کے فیڈر میں دودھ اور پانی کتنا

تناسب ہوتا ہے لیکن مختلف قسم کے چہرے کے ماسک لینے کے طریقے اسے ازبر تھے۔ جوں توں کر کے سوا مہینہ آرام کے بعد وہ دوبارہ اپنی سوشل لائف کی طرف اس طرح لپکی جیسے کوئی قیدی پرندہ پنجرے سے چھوٹ کر پر پھیلاتے ہوئے سیدھا کھلی فضاؤں میں درخت کی سب سے اونچی چوٹی پر جا بیٹھتا ہے۔ اس شہر کے سوشل سرکل میں فرزانہ اس طرح آئی جیسے کسی جذبہ انتقام سے جل رہی ہو۔ اس کی دھماکہ خیز آمد نے جیسے ہر طرف ہلچل مچا کر رکھ دی۔ نت نئی پارٹیاں ہوٹلوں میں ڈنرز مختلف قسم کے دیگر فنکشنز روز کا معمول بن گئے۔ ان دنوں محسن بھی کاروبار میں مصروف تھا اور کبھی کبھار ہی فرزانہ کا ساتھ دے سکتا تھا لیکن اس کی موجودگی یا غیر موجودگی فرزانہ کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ وہ اکثر گھر آتا تو بچے اور گھر نوکروں کے رحم و کرم پر پڑے ہوتے اور فرزانہ رات گئے گھر سے غائب ملتی۔ جب واپس آتی تو اتنی تھکی ہوئی ہوتی کہ بچوں کو تو کیا محسن کو بھی مناسب توجہ دینے کی روادار نہ ہوتی۔ باہر کی محفلوں میں چہچہانے اور نقرئی قہقہے فضا میں بکھیرنے والی فرزانہ گھر میں محسن کو کس قدر مختلف نظر آتی لیکن وہ پھر بھی اسے ناراض نہ دیکھنا چاہتا اور ہاؤ ہو سے گریز ہی کرتا۔ اب پھر اس نے چند دنوں کے لیے باہر جانا تھا تو وہ فرزانہ کو خاص طور پر تاکید کر کے گیا کہ وہ زیادہ تر گھر میں ہی رہنے کی کوشش کرے کیونکہ نہا علی ٹھیک نہ تھا لیکن اس کے باوجود جب وہ واپس آیا تو حسب سابق وہ گھر میں موجود نہ تھی۔ بچے آیا کے رحم و کرم پر تھے اور اسے بھی کوئی چیز اپنی جگہ پر نہ مل رہی تھی۔ وہ بولایا ہوا سا اس خالی گھر میں ادھر ادھر پھرتا رہا اور جب وہ نہ آئی تو سٹڈی روم میں جا بیٹھا۔ میز پر بلوں کا پلندہ دیکھ کر محسن نے ٹوٹل کرنا شروع کیا، جب رقم پچھتر ہزار کے قریب پہنچی اتنے میں فرزانہ کی کار بھی پورچ میں آ رُکی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلی آ رہی تھی کہ محسن نے اسے بھی سٹڈی روم میں ہی بلا لیا اور وہ اکتائی ہوئی سی کرسی پر ٹک گئی۔

”فرزانہ میں جب بھی گھر واپس آؤں تم آگے سے غائب ملتی ہو“ محسن نے گلہ کیا۔

”محسن میں کولہو کا بیل تو نہیں ہوں، اگر ذرا دیر گھر سے باہر گزار لیتی ہوں تو کیا ہو جاتا ہے؟“ فرزانہ نے ہونٹ چبا کر کہا۔

”کولہو کے بیل کا کیا مطلب ہے بھئی، آخر کار تم ایک بیوی ہو، ماں ہو، تمہیں اپنی ذمہ داریاں یکسر فراموش نہ کر دینی چاہئیں“۔ محسن نے جھلا کر کہا۔

”میں خود بڑی اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے“۔

”اگر تم واقعی جانتی ہوتی کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے تو پھر یہ گھر تمہاری آوارہ گردی کے باعث لاپرواہی کا شکار نہ ہوتا۔ بچے تمہاری شفقت اور توجہ کو ترس نہ رہے ہوتے“ محسن نے میز پر غصے سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہارا بات کرنے کا یہ انداز اور رویہ ہرگز پسند نہیں آ رہا محسن!“ فرزانہ نے بُرا مناتے ہوئے کہا۔

”انسان کا لہجہ اور رویہ وقت کے تقاضے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے فرزانہ“ محسن نے رنجیدگی سے کہا۔

”اگر تم لہجہ بدل لو گے تو مجھے بھی لہجہ بدلنے کا طریقہ آتا ہے“۔ فرزانہ نے منہ لال کر کے کہا۔

”یہ دھمکی ہے یا طنز فرمایا جا رہا ہے“ محسن نے زہرخند سے کہا۔

”چاہے جو سمجھو“ وہ اپنے رنگین بڑھے ہوئے

ناخنوں کو دیکھتے ہوئے تلخی سے بولی۔

"میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو فرزانہ" محسن تلخی سے بولا۔

"کون کہتا ہے کہ میں تمہاری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہی ہوں" فرزانہ بولی۔

"یہ تمہاری قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان، تمہاری گستاخ نظریں کہتی ہیں جس سے نافرمانی کی بو آتی ہے۔ جس عورت میں اطاعت اور برداشت کا مادہ نہ ہو وہ بیوی کہلانے کی مستحق ہی کب ہوتی ہے فرزانہ؟" محسن نے چڑھے ہوئے سانسوں کے درمیان کہا اور پھر تمام بل اٹھا کر اس کے آگے پھینکتے ہوئے بولا" پہلے یہ تو بتاؤ کہ اتنے سارے اخراجات کے یہ بل میں کہاں سے ادا کروں؟ جو کماتا جارہا ہوں تم عیاشی میں اڑاتی جارہی ہو۔ انسان بُرے وقت کے لیے بھی تو کچھ بچا ہی رکھتا ہے۔ اس طرح سے تو تمہیں کسی راک فیلر سے شادی کرنی چاہیے تھی فرزانہ"۔

"اوہو! رہے نہ وہی کے وہی ٹٹ پونجیے، بنیا ذہنیت کے!...... یہ نہیں سوچتے ان اعلیٰ تقریبات کی شہر میں کس قدر دھوم مچی ہوئی ہے اور پھر اتنا تو خرچ ہو ہی جاتا ہے شہر میں ساکھ بنانے کے لیے اور ہاں جس کمائی پر تم اتنا اینٹھ رہے ہو نا وہ تمام بزنس میرے ہی دم قدم سے ہے ورنہ تمہارے دفتر پر وہ ٹین کا لگا ہوا بورڈ کب کا زنگ کھا کر گر چکا ہوتا"۔

"واہ اس خوشی میں مر ہی نہ جاؤں میں" محسن نے طنز سے پھنکار کر کہا" دن رات محنت میں کررہا ہوں اور سارا کریڈٹ تم اپنے سر لے رہی ہو۔ آخر کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو؟"

فرزانہ ایک دم قہقہہ لگا کر ہنس دی اور پھر بولی:۔

"واردیتی ہوں آپ کے اس تجاہل عارفانہ کو محسن صاحب! ارے میرے بھولے شوہر محترم! اب شاید آپ کو یہ بھی نہ یاد رہا ہو کہ جب جیولر کی دکان پر مسز شیخ کے ہار کی قیمت سن کر جناب کو پسینہ آ گیا تھا یعنی صرف تین لاکھ پچیس ہزار کی چیز آپ میرے لیے فراہم نہ کرسکے تو اس تمام رات میں سوچتی رہی۔ آخر بڑے سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں یہ تجویز آئی کہ جائیداد کی آمدنی بھی خاطر خواہ نہیں تو پھر کیوں نہ کاروبار پر توجہ دی جائے اور اسی رات میں نے کاروبار کو ترقی دینے میں آپ کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کو شاید یاد ہی ہو کہ جس بلڈنگ کا سامان فراہم کرنے کا آپ کو چھ لاکھ کا آرڈر ملا تھا جس میں سے آپ کو ڈیڑھ لاکھ روپے کا منافع ہوا وہ آرڈر میں نے ہی آپ کو دلوایا تھا۔ صرف ان سیٹھ صاحب کی انٹرکانٹی نینٹل میں دعوت کی تھی اور ان سے آپ کو کانٹریکٹ دینے کا وعدہ لیا تھا" محسن کے چہرے پر پریشانی کے سائے منڈلاتے دیکھ کر فرزانہ بولی" کیوں بھول گئے؟ اور اس کے بعد بھی جیسے جیسے آپ کو آرڈر ملتے گئے ویسے ویسے آپ کی فرم ترقی کرتی گئی۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس تمام کریڈٹ کے آپ ہی حقدار ہیں؟ نہیں جناب! یہ تقریباً اس ناچیز کی ذہانت کا ثمر ہیں اور جن دعوتوں اور فنکشنز کو آپ بیکار سمجھ کر ان کے بل ادا کرنے سے انکاری ہیں اور میری جس سوشل لائف کو آپ آوارگی کا خطاب دے رہے ہیں یہی تو آپ کی ترقی کا باعث بنے ہیں...... اچھا اب میں چلتی ہوں۔ سخت نیند آرہی ہے۔ آج بے حد تھک گئی ہوں۔" فرزانہ نے انداز دلربائی سے انگڑائی لے کر کہا اور پھر شانِ بے نیازی سے اٹھ کر اپنے بیڈروم کو چل دی۔

دیکھا جائے تو فرزانہ کی اس طرز کی گفتگو سے ایک طرح محسن کو یہ فائدہ پہنچ سکتا تھا کہ وہ چند ایک نہایت اہم مگر خطرناک باتوں کی طرف توجہ دے سکے۔ اس کے اس انداز بیان کے بعد وہ اپنی

کوتاہیوں اور خوش اعتقادیوں کے بارے میں بھی کوئی معقول رائے قائم کرسکتا تھا اور یوں وہ سب لوگ بھی سامنے آگئے تھے جن کو فرزانہ نے سحر حسن میں جکڑ رکھا تھا۔ لیکن محسن کے لیے یہ انکشاف جان لیوا تھا۔ وہ فرزانہ کے جانے کے بعد جیسے سکتے کے عالم میں کتنی دیر گم سم بیٹھا رہا۔ اس کے ذہن کی رو نجانے کن خارزاروں میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ اس کی خوشیوں کا محل جسے اس نے بڑے ارمانوں سے اینٹ اینٹ سجا کر تعمیر کیا تھا، آہستہ آہستہ غم و آلام کی اندھیری دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔

"یا اللہ" اس نے ماتھے سے ٹپکتے ہوئے پسینے کے قطروں کو انگلی کی پوروں سے چھوتے ہوئے آہ بھر کر کہا "میں نے کیسے کیسے جتن کرکے اپنے لیے یہ جنت تعمیر کی ہے۔ اس میں میری خوشیوں اور تمناؤں کے شجر اور ثمر میرے پیارے بچے حسن اور علی ہیں اور ان سب پر میری اس راحت جاں فرزانہ کے دلفریب پیکر کا حسین و لطیف سایہ تھا مگر یہ سب جو میں سن رہا ہوں یہ سب کیسے ممکن ہوا میرے مولا؟ اس جنت کا تو ایک ایک ذرہ میں نے پورے خلوص سے سمیٹا تھا اس میں کہاں کسر رہ گئی میرے اللہ؟" وہ رات کے سناٹے میں چیخ سا اٹھا اور پھر وفور جذبات سے بے قابو ہو کر بیڈ روم کی طرف لپکا۔ فرزانہ بستر پر لیٹ چکی تھی اور دیوار کی طرف منہ پھیر کر لیٹی ہوئی تھی حالانکہ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ جاگ رہی ہے مگر محسن کے بیڈ روم میں آنے کا اس نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ محسن نے ایک لمحہ توقف کیا پھر اس کے پرکشش جسم کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بستر کے قریب سائیڈ ٹیبل پر رکھے ایش ٹرے میں سگریٹ بجھانے لگا۔ اس وقت وہ دونوں ایک ہی بیڈ پر دراز تھے۔ مگر ذہنی طور پر ایک دوسرے سے کس قدر علیحدہ تھے۔ خواب گاہ پر عجیب قسم کی اعصاب شکن خاموشی طاری تھی۔ ایسے میں نیند آنے کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ محسن کو یقین تھا کہ آج فرزانہ بھی جاگ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے آواز دی۔

"فرزانہ"

"ہوں!" فرزانہ نے اسی طرح پیٹھ پھیرے ہوئے جواب دیا "دیکھو میری بات سنو" محسن نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

"اوہو کیا ہے محسن؟ اب سونے بھی دو نا" فرزانہ نے ناگواری سے محسن کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا حالانکہ اس کی آواز میں غنودگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ یہ وقت باتوں کا نہیں ہے اور میرے خیال میں اس وقت یہ بات کرتے ہوئے نہ تو مجھے کوئی روحانی مسرت حاصل ہو رہی ہے اور نہ تمہارے ہی دل میں میرے لیے محبت انگڑائیاں لے رہی ہے" محسن نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مطلب کی بات کرو" فرزانہ نے بیزاری سے کہا۔

"دیکھو فرزانہ میری بات غور سے سنو، مجھے تمہارے واسطے سے کمائی ہوئی دولت نہیں چاہیے۔ میں خود محنت کر بھی رہا ہوں اور کروں گا بھی۔ تمہارے اور اپنے بچوں کی اور اس گھر کی سلامتی کے لیے میں سب کچھ کروں گا..... فرزانہ..... میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کے لیے جان کی بازی بھی لگا دوں گا۔ صرف تم پہلی سی فرزانہ بن جاؤ۔ غیور، خود دار، اپنی طرف میلی آنکھ اٹھا کر دیکھنے والے پر تھا سا ریوالور تان لینے والی الہڑ حسینہ۔ دیکھو ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے۔ میں تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گا۔ میری جان میرا وعدہ رہا۔ میں وقت آنے پر تمہیں دنیا گھما لاؤں گا۔ صرف مجھے مہلت دو۔ تھوڑی سی مہلت، مگر تمہیں میری خاطر ان راہوں کو بدلنا ہوگا جن راہوں پر تم چل نکلی ہو۔ اس طرح تو ہماری ازدواجی زندگی کی خوشیاں خاک میں مل جائیں گی۔ یہ گھر تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ ہمارے

کیا آپ چاہتے ہیں کہ

آپ، آپ کی اولاد، آپ کے بہن بھائی، عزیز و اقارب

- جھوٹ بولنے سے باز آجائیں
- تجارت اور ملازمت میں بدعنوانی اور بددیانتی سے باز آجائیں
- اپنے گھر والوں سے حسنِ سلوک سے پیش آئیں
- زندگی کا ہر لمحہ نیکی اور پارسائی میں گزرے
- تعلیم و تعلم کے شاندار درس ذہن نشین ہوجائیں
- والدین سے وہ سلوک کریں جو خدا پسند کرتا ہے

تو

سیارہ ڈائجسٹ کی شاندار روایات کے پیشِ منظر میں پیش کیا جانے والا دلکش، دلکشا اور زرّیں

شائع ہوگیا ہے

اخلاقِ رسول ﷺ نمبر

مطالعہ کیجیے

احادیثِ رسول ﷺ کی روشنی میں

بچوں کا مستقبل خاک میں مل جائے گا۔ گمنام راستے منزل نہیں دیا کرتے فرزانہ"۔

"کیا بات کررہے ہو محسن؟" فرزانہ نے یکدم تڑپ کر کروٹ لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی "کیا تم چاہتے ہو کہ اس وقت جو میرا سوسائٹی میں اعلیٰ مقام ہے اس کو چھوڑ کر میں تمہارے اس کنویں کا مینڈک بن جاؤں! اُف میرا تو یہ سوچ کر ہی دم گھٹنے لگتا ہے محسن، اور پھر کیا ہورہا ہے اس گھر کو، اتنے نوکر چاکر موجود ہیں اسے سنبھالنے کے لیے۔ رہ گئے بچے تو اچھی بھلی آیا رکھی ہوئی ہے اس کے لیے، گھر میں علیحدہ کوچنگ کے لیے ٹیوٹر لگا رکھا ہے۔ کیا کمی ہے ان کو......؟"

"جی ہاں! ایک ہی کمی ہے ان کو...... وہ تمہاری مامتا، تمہاری محبت بھری آغوش کو ترستے ہیں۔ کیا تمہیں اپنی آنکھوں سے کچھ نظر نہیں آتا؟ علی ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا ہے" محسن آزردگی سے بولا۔

"......اُفوہ تم نے تو بچوں کے بھی دماغ خراب کر رکھے ہیں۔ ان کو مجھ سے نفرت کرنے پر اکساتے رہتے ہو۔ حالانکہ میں نے دونوں بچوں کے لیے دو دو ٹانک کی بوتلیں آیا کو دے رکھی ہیں کہ کھانے کے بعد پلا دیا کرے"۔ فرزانہ طیش میں آکر بولی۔

"نفرت کسی کے کہنے سننے سے نہیں ہوتی فرزانہ، تمہارا اپنا رویہ ہی ان کے دل میں تمہارے لیے نفرت پیدا کرنے کا سبب بنے گا" محسن نے بھی رکھائی سے کہا۔

"خیر! وہ تو وقت آنے پر ہی پتہ لگے گا کہ وہ نفرت مجھ سے کرتے ہیں یا تم سے" فرزانہ کچھ سوچ کر بولی "دراصل محسن تم میری خوبصورتی، میری صلاحیتوں سے جلنے لگے ہو، جواب تمہیں میری ہر ہر بات میں کیڑے نظر آنے لگے ہیں، نہ خود چین [illegible]

احساس کمتری تو میرا جینا عذاب کردے گا"۔

"تمہیں کیا پتہ ہے کہ میرے ملنے والے زن مرید، بے حس اور نجانے کیا کیا کہنا شروع ہوگئے ہیں" محسن نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"تو کیا تمہارے ملنے والوں کے نزدیک بیوی کو راضی رکھنے یا اسے خوشی و آسائش مہیا کرنے کو زن مریدی کہتے ہیں؟" فرزانہ نے زچ ہوکر کہا۔

"ہاں ہاں!" محسن چڑ کر بولا "کیا تم نے بھی اپنے بھائیوں سے اس لیے قطع تعلق نہیں کی کہ وہ بیویوں کے غلام ہیں؟"

"وہ تو بات ہی الگ ہے۔ تم لاجواب ہوکر میرے لفظوں کے وار مجھ پر ہی نہ چلاؤ" فرزانہ نے جھلا کر کہا "تم تو بلاوجہ ہی جرح پر اتر کر میری جان کو آگئے ہو۔ خدا کے لیے مجھے بخشو اس وقت اور سونے دو۔ میں پہلے ہی بہت تھکی ہوئی ہوں۔ بہرحال جو تم چاہتے ہو، وہ نہیں ہوسکتا" فرزانہ بڑبڑاتے ہوئے پھر لیٹ گئی۔

محسن بھی اس وقت زیادہ جھگڑا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا تاہم اسے فرزانہ کی باتوں پر سخت غصہ آرہا تھا۔ وہ خاموشی سے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے دل میں لگی ہوئی غصے کی آگ کے شعلے اس کی آنکھوں سے نکل رہے تھے۔ فرزانہ نے کروٹ بدلنے سے پہلے جونہی مڑ کر محسن کی طرف بے زاری سے دیکھا، محسن کی دھواں دیتی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ فرزانہ اس سے طاقتور نہ تھی۔ وہ چاہتا تو اپنا موقف منوانے کے لیے اس کے جسم کی ہڈی ہڈی الگ کرسکتا تھا مگر وہ ایک صلح کن اور دھیمی طبیعت کا آدمی تھا۔ اور اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اس کی اکتائی ہوئی سرد نگاہوں کی تاب لا سکتا۔ فرزانہ نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ بجھا دیا تو محسن بھی خاموشی سے لیٹ گیا مگر نجانے کتنی دیر تک تاریکی میں چھت کو گھورتا رہا اور پھر نجانے کس وقت سو گیا۔

اس رات کی بات چیت کے بعد بھی فرزانہ کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا محفلوں کی روح رواں اور جان فرزانہ کا نام اب لوگوں کے ڈرائنگ روم کی گپ شپ میں سرگوشیوں میں آنے لگا لیکن کون تھا جو اسے ٹوکتا۔ جن کی محفلیں اس کے وجود سے گرم تھیں وہ ہی تو اس کی حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ وہ ایک سرکل سے نکل کر دوسرے سرکل میں رنگین تتلی کی طرح گھوم رہی تھی اور ساتھ ہی ان کانٹوں پر اٹھتے بیٹھتے ہوئے محسن اور اپنی عزت نفس کا لبادہ تار تار کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے سکینڈل زبان زد عام ہونے شروع ہوگئے۔ محسن نے فرزانہ کے بارے میں پہلے تو دبی زبان سے اور پھر برملا طور پر راحت اور رضا سے تذکرہ کیا تو انہوں نے فرزانہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر فرزانہ نے ان کو بیک ورڈ اور تنگ نظر کہہ کر ان کا اُلٹا مذاق اُڑایا۔

رضا اور راحت ہفتے میں ایک دفعہ ضرور کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے تھے۔ اس شام ان کی میز سے ذرا پیچھے کی طرف دو مرد کھانا کھارہے تھے۔ بات چیت کے انداز سے وہ کوئی کاروباری لوگ معلوم ہوتے تھے۔ باتیں کرتے کرتے وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے تو رضا اور راحت کے کان ان کی طرف لگ گئے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

"ارے یار کس کی بات کررہے ہو......وہ فرزانہ کی۔ ارے بھائی" وہ گلا کھنکار کر اس طرح ہنسا گویا اس نام سے ہی اس کے گلے میں گدگدی ہورہی ہو......" اس دو آتشہ کا تو ذکر آتے ہی ہم تو بن پیے ہی مست ہوئے یار......تم تعلقات کی نوعیت کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔ تو فی الحال میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ابھی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ سکا ہوں میں۔ مگر فکر نہ کرو یار......میں نے بھی آج تک کوئی ہاتھ آئی تتلی اُڑنے نہیں دی۔ سوچی نکل نہ جاؤں تو نام بدل دینا میرا"۔ اس نے نام نہاد مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اوباشانہ لہجے میں کہا۔ اور پھر اس کے گلے سے دبا دبا سا قہقہہ اُبل پڑا۔

"یار نجانے اس کا خاوند کس مٹی کا بنا ہوا ہے یا تو اس کو کچھ پتہ ہی نہیں اور یا جان بوجھ کر کانٹریکٹ سائن کروانے کے لیے بے غیرت بنا ہوا ہے کمینہ کہیں کا"۔ دوسرے نے منہ بگاڑ کر کہا۔

"میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ آدمی مجھے تو کم از کم دیکھنے میں خاصا reasonable لگتا ہے مگر تم نے وہ بات نہیں سنی وہ جو کہا جاتا ہے۔ "The husband is always the last man to know" یہ کہہ کر وہ آدمی میز سے اٹھ کھڑا ہوا اور کاؤنٹر پر جاکر منیجر سے کوئی بات کرنے لگا۔ جب دوسرا بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل گیا تو رضا راحت پر ناراض ہونے لگ پڑا۔

"راحت میں نے کتنی بار تمہیں کہا ہے اس احمق عورت کو سمجھاؤ۔ اس نے تو بے چارے محسن کی عزت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ اسے منع کرو اور کہو کہ خدا کے واسطے اس رسوائی اور بدنامی کے طوق کو گلے سے اُتار دے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ محسن واقعی سچ کہتا تھا"۔

"خدا کے بندے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ میں نے کئی دفعہ اس سے اس بارے میں بات کی ہے مگر وہ کسی کی سنتی ہی کب ہے۔ بس اس کے ذہن میں تو ایک ہی بات سمائی ہوئی ہے کہ لوگ خوامخواہ اس سے جلتے ہیں۔ سب باتیں بناتے ہیں۔ آج کل اس کا دماغ ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔ میں اس کے سامنے کیا چیز ہوں۔ وہ تو پہلے بھی کسی کو پلے نہ باندھتی تھی۔ آپ خوامخواہ مجھے موردِ الزام ٹھہرارہے ہیں" راحت نے پریشانی سے پسینہ ماتھے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"خیر اب تو پانی سر سے گزرتا معلوم ہورہا ہے۔

میں کل ہی محسن سے مل کر اس معاملے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کرتا ہوں" رضا نے میز پر مکہ مارتے ہوئے کہا "مجھے تو سارا قصور ہی محسن کا نظر آتا ہے۔ ٹکے کی عورت کو اتنا سر چڑھانے کی ضرورت کیا تھی۔ شروع سے ہی باندھ کر رکھتا تو آج نوبت یہاں تک نہ آتی"۔

اس سے پہلے بھی ایک دو دفعہ محسن کے دیگر قریبی دوستوں نے محسن کے سامنے ڈھکے چھپے لفظوں میں فرزانہ کے رویہ کے بارے میں نکتہ چینی کی تھی۔ شروع شروع میں تو ان کی سوچ کا یہ انداز محسن کو سخت ناگوار گزرا تھا مگر بتدریج فرزانہ کی تغافل شعاری کی وجہ سے بعد میں خود بھی محسن کے ذہن میں شبہات کے مکڑے نے جالے بننے شروع کر دیے تھے لیکن آج رضا کے منہ سے اپنی رسوائی اور بربادی کی داستان سننے کے بعد ایک کھولتا ہوا لاوا تھا۔ جو کانوں کے ذریعے اب آہستہ آہستہ تمام بدن میں اُترتا معلوم ہو رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس جان لیوا اشتعال نے اس کا سب کچھ راکھ کر کے رکھ دیا ہو۔ کچھ بھی باقی نہ بچا ہو۔ جیسے کوئی تمام متاع چھین کر لے گیا ہو۔ ایک بے مائیگی اور زیاں کا احساس، ایک شکست کا احساس جیسے تمام رگ و پے میں اندھیرا سرایت کر گیا ہو۔ گھر میں گھستے ہی محسن چلا اٹھا۔

"فرزانہ آ آ آ...... فرز...... و ...... و ......" کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے دیوانہ وار تمام گھر کے دروازے کھول ڈالے، لیکن ہر بار اس کی آواز کی بازگشت نے اس کا منہ چڑا دیا۔ نجانے وہ کیوں بھول گیا تھا کہ وہ تو روزانہ ہی رات کو لیٹ گھر آتی ہے۔ اسے شاید پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس کے ساتھ کتنا بڑا مذاق کیا جا رہا ہے۔ خالی خالی گھر جس کے صرف ایک کمرے میں اس کے دو ننھے بچے اپنی آیا کے ساتھ سو رہے تھے اس کے نئے اور پرانے شبہات کو مزید حقیقت کا رنگ دے رہے تھے۔ اس وقت وہ خود کو ایک ویران صحرا میں بادِ سموم کے چلتے ہوئے بگولوں کے تھپیڑوں کی زد میں کھڑا محسوس کر رہا تھا۔

سامنے قدِ آدم آئینے میں جب اسے اپنا ہی عکس نظر آیا تو وہ خیالوں کی دنیا سے نکل کر مضمحل چال چلتا ہوا آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ گلے میں پڑی نکٹائی اسے پھندہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے لرزیدہ ہاتھ بے اختیار گلے کی طرف بڑھے اور اس نے گلے سے نکٹائی نوچ کر نیچے پھینک دی اور پھر غور سے اسے اپنا عکس دیکھنے لگا۔ اسے اپنے لرزتے شکست خوردہ وجود پر ترس آنے لگا۔ کھوکھلا جسم و جان' تمام طرف ایک بے کراں خلا ہی خلا...... اُف کیا یہی وہ ازدواجی زندگی تھی جس کے وہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ یہ کونسا خواب تھا جس کی تعبیر اُلٹ نکلی۔ وہ اپنے وجود کو واضح طور پر کرچی کرچی ہوتا دیکھ رہا تھا۔ یونہی کھڑے کھڑے جب اس کی ٹانگیں جواب دینے لگیں تو وہ قریب پڑے صوفے پر ڈھیر ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر ہچکیوں سے رونے لگا۔ جب آنسوؤں کا طوفان تھما تو اس کے ذہن کو پھر ہزاروں خدشات اور شبہات زہریلے بچھوؤں کی طرح ڈسنے لگے۔ اگرچہ اس نے ہر بڑی "ہاں" کے لیے ایک چھوٹی سی "نہیں" تراشنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن آج اس کی ہر دلیل جو وہ اپنی ازدواجی زندگی کی گرتی ہوئی چھت کے نیچے ستون کی طرح کھڑی کرنا چاہتا تھا، ریت کے بھربھرے ٹیلے کی طرح زمین بوس ہو جاتی تھی اور وہ مایوسی اور دل شکستگی کے اندھیروں میں پھر بھٹکتا رہ جاتا تھا۔ پھر وہ ننگے پاؤں ہی باہر نکل گیا۔ باہر کی خوشگوار فضا اور خنک زمین پر پاؤں رکھتے ہی اس کے اُبلتے ہوئے اعصاب کو قدرے تسکین سی ملی اور وہ آہستہ آہستہ نرم نرم اوس سے بھیگی گھاس پر ٹہلنے لگا۔

(جاری ہے)